کشمیر کی آزمائش

...ایک انقلابی حل

تحریر: لال خان

ترجمہ: ایس۔این شوریدہ

طبقاتی جدوجہد پبلیکیشنز

www.struggle.com.pk

انتساب

کشمیر کے ان نوجوانوں کے نام جو انقلابی سوشلزم
کے راستے پر چل نکلے ہیں

مصنف کے بارے میں

لال خان 1956ء میں پاکستان کے ایک گاؤں بھون میں پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی تعلیم ڈھاکہ، راولپنڈی اور حسن ابدال سے مکمل کرنے کے بعد 1975ء میں وہ نشتر میڈیکل کالج ملتان میں داخل ہوئے۔ 1978ء میں وہ اسلامی بنیاد پرستوں کے مقابلے میں طلباء یونین کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ ملتان میں کئی بار گرفتار ہوئے۔ 1979ء میں میڈیکل کالج میں اپنی تعلیم کے آخری سال کے دوران انہیں ضیاء الحق کی جابرانہ آمریت کے خلاف طلباء کے ایک جلوس کی قیادت کرنے پر گرفتار کر لیا گیا۔ رہائی کے بعد انہیں جبراً راولپنڈی میڈیکل کالج میں بھیج دیا گیا۔ وہاں بھی انہوں نے اپنی انقلابی جدوجہد کو جاری رکھا جس کے نتیجے میں مئی 1980ء میں ملٹری کمانڈ کونسل کی طرف سے انہیں دیکھتے ہیں گولی مارنے کا حکم نامہ جاری کیا گیا۔

وہ شدید زخمی حالت میں یہاں سے فرار ہو کر ایمسٹرڈیم (ہالینڈ) پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں انہوں نے ایمسٹرڈیم یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کو جاری رکھا لیکن ساتھ ہی جلاوطنی میں بھی ظالم فوجی آمریت کے خلاف تحریک منظّم کرتے رہے۔ وہ نومبر 1980ء میں شروع ہونے والے پرچے ''طبقاتی جدوجہد'' کے بانیوں میں شامل ہیں۔ اس پرچے کو خفیہ طور پر پاکستان میں بھیجا اور تقسیم کیا جاتا تھا۔ وہ اکتوبر 1987ء میں پاکستان واپس آئے اور اس وقت سے ''طبقاتی جدوجہد'' کے سیاسی مدیر اور Asian Marxist Review کے مدیر ہیں۔ لال خان مارکسی نقطہ نگاہ سے سیاسی اور معاشی صورتحال پر 25 کتابیں لکھ چکے ہیں۔

لال خان مصنف کا قلمی نام ہے کیونکہ انہوں نے اپنی زیادہ تر تصنیفات جابر آمریت کے دور میں خفیہ رہ کر لکھیں۔

ترتیب

1	تعارف	ایلن وڈز	5
2	باب نمبر 1	ایک ہنگامہ خیز دنیا	14
3	باب نمبر 2	امن کی عظیم جعل سازی	29
4	باب نمبر 3	صدیوں کا جبر	68
5	باب نمبر 4	کشمیر اور بٹوارے کا زخم	95
6	باب نمبر 5	سنگینوں سے ٹپکتا لہو	121
7	باب نمبر 6	آزاد کشمیر کا کرب	161
8	باب نمبر 7	بنیاد پرستی، قوم پرستی اور سوشلزم	194
9	باب نمبر 8	سوشلسٹ انقلاب۔۔ واحد راہ نجات	232
10	اختتامیہ	زلزلے کی تباہ کاریوں کے بعد	277
11	نوٹس		284

تعارف

اس دنیا میں موجود استحصال کا اندازہ کشمیر کے عوام کی حالت زار دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔تقریباً نصف صدی پہلے برطانوی راج کے خاتمے کے بعد سے کشمیری عوام پاکستان اور بھارت کے حکمران طبقے کے ظلم اور استحصال کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

یہ خطہ اب ایک دفعہ پھر عالمی سامراج کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔کشمیر کے لوگوں کی کربناک حالت زار کو دہائیوں سے نظر انداز کرنے والی امریکی اور برطانوی حکومتیں اب مسئلہ کشمیر کے ''پرامن حل'' کے لئے دباؤ ڈال رہی ہیں۔ یہ حکومتیں برصغیر میں امن چاہتی ہیں، وہ نہیں چاہتے کہ پاکستان اور بھارت میں ایک نئی جنگ شروع ہو۔لیکن امن کے لئے اس احساس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ سامراجی درندہ اب سبزی خور گاندھی بن چکا ہے۔ یہ لوگ ایسا امن چاہتے ہیں جو سامراج کے کنٹرول میں ہو۔

سامراجیوں کی ایک پرامن سرنگوں برصغیر کی خواہش قطعاً انسانی ہمدردی کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ اس طرح وہ اپنے معاشی مفادات اور مذموم مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف تو امریکی سامراج کو افغانستان میں فوجی آپریشن کے لئے محفوظ اڈوں کی ضرورت ہے اسی لئے اسے اسلام آباد میں حکومت کی خدمات درکار ہیں۔ دوسری طرف وہ بھارت کی وسیع منڈی سے استفادہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اس بروقت کتاب کے مصنف اور میرے بہت ہی اچھے دوست کامریڈ لال خان نے تقسیم ہند کے خونی فراڈ کو آشکار کر کے ایک اہم خدمت سرانجام دی ہے۔اس مسئلے پر وہ اپنی کتاب ''تقسیم - کیا اسے ختم کیا جاسکتا ہے؟''(Partition

(Can it be Undone?-) میں بھی تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ وہ بھارتی اور پاکستانی دونوں ممالک کی بورژوازی کے رجعتی کردار کو سامنے لائے ہیں۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ برصغیر کی بورژوازی معاشرے کو آگے لے جانے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے اور یہ قومی سوال سمیت بورژوا جمہوری انقلاب کا کوئی ایک بھی تاریخی فریضہ ادا نہیں کر سکی۔

مصنف نے مندرجہ ذیل پیراگراف میں وضاحت کی ہے کہ کیوں سرمایہ دارانہ نظام قومی مسئلہ یا انسانیت کو درپیش کوئی ایک بھی بنیادی مسئلہ حل نہیں کر سکا۔

> سرمایہ داری نظام کا عالمی بحران اپنی بنیادوں میں زائد پیداوار کا بحران ہے (جس کا اظہار زائد پیداواری صلاحیت کی صورت میں ہو رہا ہے) قرضوں اور خساروں نے اس زوال میں مزید شدت پیدا کر دی ہے تاہم یہ محض اس بنیادی مسئلے کی علامات ہیں۔ ایک دہائی سے زائد عرصے پر محیط گلوبلائزیشن کے باوجود ماضی کے تضادات میں سے کوئی ایک بھی ختم نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس یہ تضادات اپنی شدت اور وسعت میں ہزاروں گنا اضافے کے ساتھ بہت بڑے پیمانے پر دوبارہ سر اٹھا رہے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک تصادموں کا ایک نہ تھمنے والا سلسلہ انتہائی تیز رفتاری سے پھیلتا جا رہا ہے۔قومی مسئلہ ختم ہونے کی بجائے نہ صرف ہر جگہ زور پکڑتا جا رہا ہے بلکہ انتہائی مہلک کردار کا حامل بھی ہوتا جا رہا ہے۔ایک کے بعد دوسری جنگ بھڑک رہی ہے۔ یہ ''آزاد منڈی کی معیشت'' کی محدود اور سانس روک دینے والی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عالمی معیشت کے جمود کی عکاسی ہے۔ یہ خون آشام سرمایہ داری کا عہد ہے۔(1)

نصف صدی سے زیادہ کی رسمی آزادی کے بعد کیا حاصل کیا جا سکا ہے؟

افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کا سامراج پر انحصار 1947ء کی نسبت آج کہیں زیادہ ہے۔ یہ ممالک مکمل طور پر عالمی منڈی کے غلام بن چکے ہیں اور ان کی دولت اور قدرتی وسائل کا بری طرح استحصال کیا جا رہا ہے۔دونوں ممالک کے عوام کی حالت انتہائی ابتر ہے اور دن بہ دن مزید ابتر ہوتی جا رہی ہے۔اس سب کے باوجود پاکستان اور بھارت کا زوال پذیر حکمران طبقہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ کشمیری عوام کے مفاد کی لڑائی لڑ رہا ہے۔

لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ کشمیری عوام نہ تو پاکستان اور بھارت کے حکمرانوں سے کسی قسم کے ترقی پسندانہ اقدام کی توقع رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی امریکہ اور یورپ کی نام نہاد ''جمہوریتوں'' سے کسی خیر کی امید باندھ سکتے ہیں۔ان تمام ریاستوں نے کشمیریوں کو اپنے مفادات کے تحت سازشوں اور گٹھ جوڑ کے لئے استعمال کیا ہے۔کشمیر کے عوام کے اگر کوئی قابل اعتماد ساتھی ہیں تو وہ پاکستان اور بھارت کے لاکھوں محنت کش عوام ہیں۔ان کے مفادات بھی ایک ہیں اور دشمن بھی۔

پاکستان اور بھارت کی سوشلسٹ فیڈریشن ، جس میں کشمیر کی متحد، جمہوری اور مکمل خودمختار سوشلسٹ ریپبلک بھی شامل ہو، کے سوا کشمیر کے عوام کے پاس آزادی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک پاکستان اور بھارت کے محنت کش اور کسان ان کی مدد کو نہیں آتے کشمیری عوام ہاتھ باندھ کر انتظار کرتے رہیں؟ نہیں، ایسا قطعاً نہیں ہے۔کشمیری عوام کے سلگتے ہوئے مسائل کسی بھی انتظار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔عوام اپنی آزادی صرف ایک سخت جدوجہد اور اپنی کوششوں کے ذریعے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔کشمیر کے عوام نے وقتاً فوقتاً آزادی کے لئے لڑنے مرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔یہ ایک مقدس جدوجہد ہے جسے جاری رہنا چاہئے اور ساری دنیا کے محنت کشوں کو اس کی حمایت کرنی چاہئے۔

لیکن پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لئے، جس میں قومی اور سماجی آزادی کی جنگ بھی شامل ہے، صرف ہیروازم نہیں چاہیئے ہوتا۔ اگر جیت کے لئے صرف حوصلہ درکار ہوتا تو کشمیر بہت پہلے کا آزاد ہو گیا ہوتا۔ فتح کو حاصل کرنے لئے چند اور چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخ میں کتنی بار ایسا ہوا ہے کہ دلیر آدمیوں کی ایک بڑی فوج کو ایک چھوٹی سی باقاعدہ فوج نے ماہر اور تجربہ کار جرنیلوں کی قیادت میں شکست دی؟

کسی بھی جنگ کی فتح میں قیادت کا کلیدی کردار ہوتا ہے اور انقلابی جنگ میں یہ کردار زیادہ فیصلہ کن ہو جاتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران جرمن قیصر نے فرانس میں موجود برطانوی فوج کے متعلق کہا تھا کہ یہ ''شیر ہیں جن کی قیادت گدھے کر رہے ہیں''۔ اگر اسی بات کو آج کی عالمی مزدور تحریک پر لاگو کیا جائے تو یہ کتنی درست نظر آتی ہے! کشمیر اور ساتھ ہی پاکستان اور بھارت کا المیہ یہ ہے کہ یہاں کوئی قابل ذکر انقلابی قیادت موجود نہیں ہے۔

کئی دہائیوں سے کشمیر کے نوجوان اپنے سے کئی گنا بڑی فوج اور ایک طاقتور قابض ریاست کے خلاف جدوجہد میں شیروں کی طرح لڑ رہے ہیں۔ لیکن آج بھی آزادی کی منزل پہلے سے کہیں زیادہ دور ہے۔ اور اس سب کے بدلے چند مراعات حاصل کی گئی ہیں جو کسی بھی وقت امن کے نام پر چند خوشنما تقریروں کے بعد کسی بھی ایک طرف سے واپس لی جاسکتی ہیں۔ مشرف اور اس کی بیوی بھارت کا دورہ کر سکتے ہیں اور وہاں کے امراء کے ساتھ بیٹھ کر ڈنر کر سکتے ہیں۔ کیا اتنی خونریزی اور تکلیفوں کے بعد یہی حاصل ہوا ہے؟

بورژوا اور پیٹی بورژوا قوم پرستوں کے پاس دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ بنیاد پرست تو بالکل خالی ہاتھ ہیں۔ ان میں سے کسی کے پاس آزادی حاصل کرنے کا کوئی سنجیدہ منصوبہ یا حکمت عملی نہیں ہے، صرف وہی پرانے ڈھکوسلے ہیں جو ماضی میں کئی

دفعہ ناکام ہو چکے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ خود پر تنقید کی جائے اور اپنے رستے کو مکمل طور پر تبدیل کیا جائے۔ جس طرح کہ مصنف نے انتہائی مدلل انداز میں بیان کیا ہے کہ اس وقت ایک مارکسی قیادت کی اشد ضرورت ہے، ایک حقیقی بالشویک قیادت، لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت کی طرح جس نے روس کے محنت کشوں اور کسانوں کو اکتوبر 1917ء کی فتح کے ذریعے آزادی دلائی۔ اس فتح نے نہ صرف مزدوروں اور کسانوں کو سرمایہ داری اور جاگیرداری کے چنگل سے چھٹکارا دلایا بلکہ سابق زار کی حکومت کی غلام قومیتوں کو بھی آزاد کیا۔

کشمیر کے انقلابی نوجوانوں کو اپنے تجربات سے کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہئے؟ صرف یہ کہ کشمیری عوام کی آزادی کشمیر، بھارت اور پاکستان کے مزدوروں اور کسانوں کی آزادی کے ساتھ منسلک ہے۔ جب تک پرانے لٹیرے -- جاگیردار، بینکار اور سرمایہ دار -- اسلام آباد اور نئی دہلی میں اقتدار پر براجمان ہیں کوئی دیرپا حل ممکن نہیں۔

جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے:

> ''آزادی'' کی نصف صدی کے بعد برصغیر کی حالت اس سے کہیں زیادہ بدتر ہے جتنی کہ تقسیم کے وقت تھی۔ حکمرانوں نے کوئی مسئلہ حل نہیں کیا ہے اور وہ اپنی اس شرمناک ناکامی کا اعتراف کرنے سے بھی انکاری ہیں۔ سرمایہ دارانہ بنیادوں پر ترقی پذیر معاشروں کے عوام کے معیار زندگی میں کسی قسم کی بہتری کی کوئی توقع رکھنا ایک یوٹوپیائی خواب ہے۔ تمام اعشاریے اس کے برعکس صورتحال کی عکاسی کر رہے ہیں۔ یہ حکمران نہ تو جنگ کر سکتے ہیں اور نہ ہی امن بحال رکھ سکتے ہیں۔ جنگ اور امن کے تمام کھیل ایک فریب ہیں تاکہ وہ اپنی ناکامی کی پردہ پوشی کر سکیں اور عوام کی توجہ ان کو درپیش فوری مسائل سے ہٹا سکیں۔ (2)

پاکستان اور بھارت کی بورژوازی کی سفارتی چالبازیوں پر قطعاً کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔آج سامراج کے دباؤ کے تحت پاکستان اور بھارت کے حکمران مفاہمت کی کوشش کر رہے ہیں۔لیکن ہر کوئی جانتا ہے کہ اس معاہدے کی قیمت اس کاغذ سے بھی کم ہے جس پر وہ لکھا گیا ہے۔کسی بھی مسئلے کا حل نہیں دیا گیا ہے۔اور نہ ہی کشمیر کا کوئی بھی بنیادی مسئلہ حل کیا گیا ہے۔واشنگٹن میں اتنی محنت سے تشکیل دیا گیا یہ انتہائی نازک معاہدہ کل کسی نئے بحران میں ختم ہو جائے گا اور دہشت گردی، جنگ، بغاوت اور جبر کا وہی پرانا گھن چکر دوبارہ شروع ہو جائے گا۔

اسپرین سے کینسر کا علاج نہیں کیا جاسکتا۔بھارت اور پاکستان کی بورژوازی کی کشمیر کے مسئلے پر کسی شریفانہ معاہدے کی خواہش یقینی طور پر نئی جنگوں، بربادی اور تکلیفوں کے ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے پر منتج ہوگی۔لاکھوں مردوں اور عورتوں کے سروں پر ایک خوفناک تلوار لٹک رہی ہے۔یہ حقیقت کہ پاکستان اور بھارت دونوں کے پاس ایٹمی قوت ہے اور یہ ایک ایسی دھمکی ہے جو مسئلہ کشمیر کے حل نہ ہونے کی صورت میں ایک بعید از خیال تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔

اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جنگ کا خدشہ قدرے کم ہوا ہے۔لیکن دونوں ملکوں میں تیزی سے بڑھتا ہوا سماجی تضاد ایک مرحلے پر انقلابی دھماکے کے ساتھ پھٹے گا۔اگر ایک حقیقی مارکسی قیادت موجود ہوئی تو پاکستان اور بھارت کے دیوالیہ حکمران طبقے کو قدرے آسانی سے اکھاڑا جا سکے گا۔اسی وقت سوشلسٹ فیڈریشن کی بنیاد رکھی جاسکے گی اور قومی مسئلے کا پرامن حل ملے گا۔

لیکن اگر ہم اس وقت تک ایسی قیادت تعمیر نہ کر سکے تو تحریک کو شکست کا سامنا کرنے پڑے گا جس کے بھیانک نتائج مرتب ہوں گے۔پچھلے چند سالوں میں ہم بھارت کے اندر مذہبی جنونیت کے نتائج دیکھ چکے ہیں۔اسی قسم کا جنون پاکستانی معاشرے کے چند حصوں میں بھی پایا جاتا ہے۔اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ

محنت کش طبقے کی بڑی شکستوں کے ایک سلسلے کے بعد اس قسم کے عناصر اقتدار میں آسکتے ہیں۔

دونوں میں سے کسی ایک بھی ملک میں غیر مستحکم اور غیر متوازن بنیاد پرست آمریت مخصوص حالات میں ایک بڑی جنگ شروع کرسکتی ہے۔ پاکستان کی عسکری کمزوری کے باعث ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی شدید خواہش جنم لے گی۔ اگر ہم ایک دفعہ اس قسم کی صورتحال میں داخل ہو گئے تو نتائج کا اندازہ نہیں لگایا جا سکے گا۔ پھر ہمارے سامنے سوشلزم یا بربریت کا سوال نہیں ہوگا (یہ سوال بہت عرصہ پہلے ہی برصغیر کے عوام کے سامنے موجود ہے) بلکہ سوال یہ ہوگا کہ سوشلزم یا نسل انسانی کا خاتمہ۔

اوپر بیان کئے گئے تحفظات مصنف کی طرف سے بیان کئے گئے فرائض کی انجام دہی کی ضرورت بیان کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ان تحفظات سے ہم ہرگز مایوس نتائج اخذ نہیں کرتے۔ نہ صرف کشمیر بلکہ پاکستان اور بھارت کے نوجوانوں میں مباحثوں کا شوق پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر پاکستان کے اندر مارکسی رجحانات کا بڑھتا ہوا ابھار جن کی نمائندگی ''طبقاتی جدوجہد'' کر رہا ہے، ہماری امیدوں کو زیادہ مظبوط کرتا ہے۔ پہلے مارکسی ممبر قومی اسمبلی، منظور احمد کی الیکشن میں فتح اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ کس طرح مشکل حالات میں مارکسزم آگے بڑھا ہے۔

سوشلزم یا تو انٹرنیشنل ازم ہے یا کچھ نہیں۔ کشمیر یا کہیں بھی، قومی مسئلے کا کوئی حل نہیں سوائے اس کے کہ محنت کش طبقہ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لے۔ صرف محنت کش طبقے کا قومیت، نسل اور ذات کے پرانے تعصّبات میں کوئی مفاد نہیں ہوتا۔ اقتدار میں آنے کے بعد پاکستان کا محنت کش طبقہ بھارت کے محنت کش طبقے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے گا، اور اگر بھارت کا محنت کش طبقہ پہلے اقتدار میں آتا ہے تو وہ بھی یہی کرے گا۔

پاکستان اور بھارت کے عوام کی طبقاتی یکجہتی، دوستی اور محبت کا ایک دلکش منظر اس وقت دیکھنے میں آیا جب انہیں حال ہی میں سفر کرنے کی تھوڑی سی رعایت ملی۔ اگر تھوڑی سی رعایت کے ذریعے یہ سب دیکھنے کو مل سکتا ہے تو اس وقت کیا ہوگا جب پاکستان اور بھارت کے عوام اپنے مستقبل کا فیصلہ خود اپنی مرضی اور آزادی سے کریں گے۔ یہ ان مصنوعی سرحدوں کو، جنہیں سامراج نے 1947ء میں بنایا تھا اور پاکستان اور بھارت کے حکمرانوں نے اسے قائم رکھا ہوا ہے، اتنی آسانی سے پرے دھکیل دیں گے جتنی آسانی سے کوئی شخص مچھر کو پرے ہٹاتا ہے۔

لینن نے بہت عرصہ پہلے کہہ دیا تھا کہ قومی سوال اپنی بنیاد میں روٹی کا سوال ہے۔ برصغیر میں بے پناہ وسائل جنہیں ابھی دریافت بھی نہیں کیا گیا۔ یہ وسائل یہاں کے ہر مرد، عورت اور بچے کو کم ازکم اس معیارِ زندگی کی ضمانت دے سکتے ہیں جس سے امریکہ اور یورپ کے لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ ایک سوشلسٹ فیڈریشن برصغیر کی دیوہیکل پیداواری صلاحیت کو ایک منصوبہ بند سوشلسٹ پیداوار میں متحد کر دے گی۔ دو پانچ سالہ منصوبوں کے عرصے میں معاشرے کی دولت کم ازکم دگنی ہو جائے گی جس سے غربت، بھوک، بیماری اور جہالت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مصنف نے بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

> اس اتحاد کو حاصل کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ ان غربت اور محرومیوں کے شکار لوگوں کے معیار زندگی اور سماجی حالات میں تیز ترین ترقی ہو۔ مذہبی، نسلی، گروہی اور دیگر اختلافات صرف طبقاتی اتحاد کے ذریعے ختم کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دور دراز اور کٹے ہوئے علاقوں کو بڑے مراکز سے جوڑنے کیلئے ضروری انفراسٹرکچر تعمیر کر کے ملک کے حقیقی اتحاد کو یقینی بنانا ہوگا جس کیلئے دیو ہیکل سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔ اگر بھارت اور پاکستان بے پناہ وسائل کے

باوجود اس فریضے کی تکمیل میں ناکام ہیں تو سرمایہ داری کے اندر کشمیر کیسے اس فریضے کو پورا کرے گا؟ (3)

ایک ایسا معاشرہ جس میں ہر مرد اور عورت کو ایک معقول معاوضے پر روزگار میسر ہو گا، ایک مناسب رہائش دستیاب ہو گی اور اس کے علاوہ پینے کا صاف پانی، مناسب غذا، بچوں کے لئے بہترین سکول، جدید سڑکیں، ڈسپنسریاں، ہسپتال اور یونیورسٹیاں موجود ہوں گی۔ پرانا قومی اور ذات برادری کا حسد اسی طرح ختم ہو جائے گا جس طرح پانی کا قطرہ گرم چولہے پر ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ ان مذہبی اور ثقافتی اختلافات کا احترام کریں گے جو برصغیر کو ایک زرخیز، رنگ برنگ اور دلکش خطہ بناتے ہیں۔

یکطرفہ اور تنگ نظر جنونیت کے ساتھ ہی جنگوں اور مذہبی قتل عام کی مادی بنیادیں ختم ہو جائیں گی جس سے لوگ آزاد انسانوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں گے۔ یہ تمام دنیا کے محنت کشوں کے لئے روشنی کا مینار رہے گا۔

یہی وہ تناظر ہے جس کے لئے اکیسویں صدی کے آغاز میں لڑا جا سکتا ہے۔ برصغیر کے مزدوروں اور کسانوں کی بے مثال انقلابی روایات ہیں۔ ماضی میں انہوں نے طاقتور برطانوی سامراج کو شکست دی۔ ان میں برطانوی صاحب کی جگہ لینے والے بدعنوان اور زوال پذیر سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور بنیوں کو اکھاڑ پھینکنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ انقلابی مارکسزم اور پرولتاری عالمگیریت سے لیس کشمیر کے مزدور، کسان اور نوجوان اس انقلابی جدوجہد میں ہراول دستہ ہوں گے۔

ایلن وڈز

لندن، 4 جولائی 2005ء

باب نمبر 1

ایک ہنگامہ خیز دنیا

مارکسزم کے مطابق نہ تو قنوطیت اور نہ ہی مصنوعی رجائیت واقعات کا تجزیہ کرنے میں کوئی اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ اولین ضرورت یہ ہے کہ ان تاریخی قوتوں کے باہمی تعلق کی حقیقت کو سمجھا جائے جن کے باعث موجودہ عالمی صورتحال کا ظہور رہوا۔ ٹیڈ گرانٹ (1)

زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت

اکیسویں صدی کے آغاز پر نسل انسانی جنگوں سے تباہ حال دنیا میں گھری ہوئی ہے۔ لاکھوں' کروڑوں انسان بے انتہا غربت' بیماری' بیروزگاری اور جہالت جیسی بے پناہ اذیت ناک صعوبتیں برداشت کرنے پر مجبور ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال کا ناگزیر نتیجہ ہیں۔ مذہبی بنیاد پرستی مسلسل پھیل رہی ہے اور آج بھی اتنی ہی سفاک اور ناقابل برداشت ہے جیسا کہ قرون وسطیٰ کے عہد میں تھی۔

امریکی حکومت افغانستان اور ایران جیسے خطوں میں تو مذہبی بنیاد پرستی کی مذمت کرتی ہے جبکہ امریکہ کے ''عیسائی اکثریتی علاقے'' میں اس کی کھلے عام حمایت

کر رہی ہے جہاں سکول کے بچوں کو ابھی تک مذہبی نظریہ تخلیق پڑھایا جاتا ہے۔ نسلی اور مذہبی تعصب' ''نسلی اور گروہی'' قتل عام اور فرقہ پرستانہ تشدد اپنی انتہاؤں کو چھو رہا ہے۔ جرائم اور بدعنوانی اس سطح تک بڑھ چکی ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ ساری چیزیں ایک سماج کے زوال کی علامات ہیں جو متروک ہو کر گل سڑ رہا ہے۔ نسل انسانی کی بربادی کی صلاحیتوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ پچھلے نوے سالوں میں جتنے لوگ قتل و غارت کی نذر ہوئے ان کی تعداد گزشتہ پانچ سو سالوں میں مارے جانے والے لوگوں کی تعداد سے تین گنا زیادہ ہے۔ گزشتہ دہائیوں کی جنگوں میں فوجی کم اور بچے زیادہ مارے گئے۔ اس وقت بھی کرہ ارض پر 36 سے زیادہ مسلح تصادم جاری ہیں۔ 19 ویں صدی میں ہونے والی 4 کروڑ غیر فطری اموات کے مقابلے میں 20 ویں صدی میں تقریباً 4 کروڑ 40 لاکھ لوگ قتل عام میں مارے گئے جبکہ مزید 4 کروڑ انسان قحط سالی کے باعث لقمہ اجل بنے۔ 1945ء میں دوسری جنگ عظیم کے خاتمے سے اب تک تقریباً 250 بڑی جنگیں ہوئیں جن میں 2 کروڑ 30 لاکھ لوگ مارے گئے' اور ان گنت لاکھوں کروڑوں زخمی ہوئے اور اپنے پیاروں سے بچھڑ گئے۔ عالمی سطح پر فوجی اخراجات 1994ء میں 742 ارب ڈالر تھے جو 2003ء میں بڑھ کر 879 ارب ڈالر ہو گئے تھے اور اب یہ اخراجات ایک کھرب ڈالر کی حد سے تجاوز کر چکے ہیں۔ 1945ء کے بعد صرف ایٹمی ہتھیاروں پر کیے جانے والے اخراجات تقریباً 8 کھرب ڈالر ہیں۔

اس سے بھی بڑھ کر المیہ یہ ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے باوجود ایٹمی ہتھیاروں کی بڑھتی ہوئی گھناؤنی تجارت اور ان ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے ہمارے وجود کو ہی خطرہ لاحق ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ماحول کو درپیش خطرات بھی ہیں۔ بارشوں کو کنٹرول کرنے والے جنگلات کی تباہی' آب وہوا کی اور سمندری آلودگی' اوزون کی تہہ میں پڑنے والے شگاف اور گلوبل وارمنگ کے واضح شواہد

مجموعی طور پر یہ وہ تمام فوری خطرات ہیں جو بنی نوع انسان کی بقاء کے تسلسل کا ہی خاتمہ کر سکتے ہیں۔

تو اس ضمن میں ہمارے سرمایہ دار حاکم کیا کر رہے ہیں؟ کیوں' یقیناً کچھ نہیں! ایک ایسی کیفیت میں جب ہمارا یہ دلکش سیارہ تسلسل کے ساتھ ماحولیاتی تباہی کی جانب بڑھ رہا ہے تو وہ نہ صرف تمام حقائق وشواہد کو ماننے سے انکاری ہیں بلکہ وہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ اس قسم کا کوئی مسئلہ وجود بھی رکھتا ہے۔اس حوالے سے سب سے زیادہ تکلیف دہ رویہ بش انتظامیہ کا ہے جو امریکہ کی تاریخ کی بدترین حکومت ہے۔دنیا کی 3 فیصد آبادی کا حامل امریکہ دنیا کی 25 فیصد آلودگی کا ذمہ دار ہے۔دھوکہ دہی اور دھاندلی کے ذریعے برسر اقتدار آنے کے بعد بش نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اپنے تیل پیدا کرنے والے حمایتیوں کو خوش کرنے کیلئے کیوٹو معاہدے سے یہ کہتے ہوئے دستبرداری اختیار کی تھی کہ یہ امریکہ کے مفاد میں نہیں ہے۔درحقیقت اس کے معانی یہ تھے کہ یہ بڑے کاروبار کے مفاد میں نہیں تھا۔

سرمایہ داری نظام کے آقاؤں کی قوت محرکہ محض لالچ ہے۔ان کی بینائی پر زیادہ سے زیادہ منافعوں کے حصول کی ہوس کی ایسی دھند چھائی ہوئی ہے کہ انہیں اپنے منافعوں کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔اور ایسا کرتے ہوئے وہ ہمارے لئے ایک ایسی دنیا چھوڑ رہے ہیں جس کیلئے ان کی اولادیں بھی ان کی شکرگزار نہیں ہوں گی۔دوسری جانب سرمایہ داری نظام کے ادارے انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (IMF)' عالمی بینک اور عالمی تجارتی تنظیم بین الاقوامی اجارہ داریوں کی خدمت گزاری کے عمل میں پوری دنیا پر انتہائی بھیانک اثر ورسوخ کو مسلسل بڑھاوا دے رہے ہیں۔ان اجارہ داریوں کو اس اذیت ناک مفلوک الحالی کے عذاب سے کوئی سروکار نہیں جو ان کی وجہ سے دنیا کے غریبوں پر نازل ہو رہا ہے۔

اس تمام صورتحال سے صرف ایک نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نسل انسانی کو سرمایہ

دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکنا ہوگا اس سے پہلے کہ یہ نظام نسل انسانی کا ہی خاتمہ کردے۔

نیوسپیک (نئی بولی کی) معیشت

جارج آرول نے اپنے شاہکار ناول ''1984'' میں ایک تصوراتی آمرانہ طرز حکومت کے خدوخال تخلیق کئے ہیں جہاں ایک مخصوص زبان رائج ہے جو اس انداز سے مرتب کی گئی ہے کہ چیزوں کو ان کے الٹ ناموں سے جانا جاتا ہے۔ جارج آرول لکھتا ہے:

> نئی بولی (New speak) اوشیانہ کی سرکاری زبان تھی اور اس کا مقصد حکمران طبقے کی نظریاتی ضرورتوں کو پورا کرنا تھا۔ اس کا ذخیرہ الفاظ کچھ یوں مرتب کیا گیا تھا کہ ہر اس خیال کا بالکل درست' جامع اور اکثر انتہائی گہرا مفہوم ظاہر ہو سکے جس کا اظہار کوئی بھی 'پارٹی' ممبر کرنا چاہے اور کوئی غیر ضروری معانی بیچ میں نہ آئے ----نئی بولی افکار کی حدود کی وسعت کو بڑھانے کی بجائے محدود کرنے کیلئے تشکیل دی گئی تھی۔ (2)

موجودہ عالمی صورتحال میں بورژوا دانشوروں اور سامراجی ذرائع ابلاغ نے الفاظ کے معانی کو ان کے الٹ میں بدل دیا ہے۔ خاص کر کہ معیشت کے شعبے میں یہ بات زیادہ درست ہے۔ نئی بولی (New speak) میں جنگ کو امن اور محبت کو نفرت کہا جاتا تھا۔ آج کل اصلاحات کا مطلب رد اصلاحات ہے' غربت مکاؤ پالیسیوں کا نتیجہ غربت میں اضافے کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ استحصال کو سرمایہ کاری کا نام دیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ یونہی چلتا جاتا ہے۔ نیولبرل ازم کا نظریہ جو اس وقت عالمی پالیسی سازی پر حاوی ہے اس مشہور زمانہ چارٹر کی بنیادی اساس ہے جسے Washington Consensus کہتے ہیں۔

ڈی ریگولیشن' نجکاری' تقابلی شرح مبادلہ' مالیاتی ڈسپلن' ٹیکس اصلاحات اور مالکانہ حقوق کے تحفظ جیسے اقدامات کا پیکج گلوبلائزیشن کے آلہ ہائے کار میں کلیدی

حیثیت رکھتا ہے۔ترقی پذیر مما لک کی بہت بڑی اکثریت کو اس پیکیج پر عملدر آمد کے احکامات جاری کیے گئے ہیں قطع نظر اس کے کہ ان کی معاشی اور سماجی ترقی کن مراحل پہ ہے۔گلوبلائزیشن کے عمل کو اس وقت زبردست بڑھوتری ملی جب 15 اپریل 1995ء کو سو سے زیادہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر مما لک نے مراکش اعلامیے پر دستخط کیے۔یوں ان مما لک نے یوراگوے معاہدے اور عالمی تجارتی تنظیم سے اپنی وابستگی کی تصدیق کی جس نے تجارت اور محصولات کے عمومی معاہدے (GATT) کا کردار زیادہ وسیع پیمانے پر ادا کرنا تھا۔

عالمی تجارتی تنظیم جو باضابطہ یکم جنوری 1995ء کو معرض وجود میں آئی گلوبلائزیشن ---جس کی ابتداء انیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی تھی--- کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کی ذمہ دار ہے۔عالمی تجارتی تنظیم کے قوانین' ضابطے اور طریقہ کار کا اطلاق خدمات' زراعت' ٹیکسٹائل' کپڑے کی صنعت سمیت تخلیق کے جملہ حقوق ملکیت اور اینٹی ڈمپنگ کے علاوہ بے شمار شعبوں پر ہوتا ہے۔بنیادی طور پر عالمی تجارتی تنظیم تجارت اور اس کے متعلق معاملات پر کم توجہ دیتی ہے جبکہ پیدوار' سرمایہ کاری' تبادلے اور رکن مما لک کی داخلی اور باہمی آمدن و دولت کی تقسیم پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔

عالمی تجارتی تنظیم کے زیر اثر رکن مما لک کی معیشتیں ایک بڑی تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہیں۔بین الاقوامی تقسیم محنت اور پیداوار کی طرز بڑے پیمانے پر تقابلی لاگت کے اصول کے کلاسیکی ماڈل کے مطابق تشکیل دی جا رہی ہے جس کے تحت ترقی پذیر مما لک میں ابتدائی خام اور زرعی اجناس پیدا ہو رہی ہیں جبکہ ترقی یافتہ مما لک انتہائی مہنگی اعلیٰ تکنیکی اور صنعتی اجناس پیدا کر رہے ہیں۔عالمی پیداوار کی اس طرز اور تقسیم و تجارت کی شرائط نے خام مال پیدا کرنے والے مما لک کی معیشتوں کو گہرے زوال سے دوچار کر دیا ہے۔مالیاتی اور غیر مالیاتی دونوں طرح کے وسائل تسلسل کے

ساتھ ترقی پذیر ممالک سے ترقی یافتہ ممالک کی جانب منتقل ہو رہے ہیں۔ یہ ایک واضح اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ بڑھتی ہوئی غربت اور دنیا کی آمدن کی تقسیم میں بڑھتی ہوئی عدم مساوات کا مظہر گلوبلائزیشن کے نتائج میں سے ایک ہے۔ انیسوی صدی کے آغاز سے لے کر بیسوی صدی کے اختتام پذیر ہونے تک دنیا کے غریبوں اور امیروں کی آمدن' دولت اور اثاثہ جات میں تفریق کچھ اس تناسب سے بڑھی ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

1820ء میں دنیا کی آبادی کے غریب ترین 20 فیصد لوگوں کی آمدن کا امیر ترین 20 فیصد لوگوں کی آمدن سے فرق 3:1 تھا جو 1913ء میں بڑھ کر 11:1' 1970ء میں 30:1 اور 1989ء میں 59:1 ہو گیا تھا۔ مجموعی عالمی پیداوار (GDP) میں غریب ترین 20 فیصد لوگوں کا حصہ صرف 1.4 فیصد ہے جبکہ امیر ترین 20 فیصد لوگوں کا حصہ 82.7 فیصد ہے۔ عالمی آمدن کی تقسیم کی مخروط (مینار) مکمل طور پر سر کے بل کھڑی ہے جس میں دنیا کی آبادی کے غریب ترین 20 فیصد حصے کو آمدن کی انتہائی محدود اور تنگ بنیاد میسر ہے جبکہ چوٹی پر موجود امیر ترین 20 فیصد حصے کی آمدن دیوہیکل حد تک زیادہ ہے۔

1997ء میں آبادی کے غریب ترین 20 فیصد اور امیر ترین 20 فیصد حصوں کے درمیان دولت کی تقسیم کے اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ اس خلیج میں مزید اضافہ ہوا ہے اور یہ فرق بڑھ کر 87:1 ہو گیا تھا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ گلوبلائزیشن' آمدن کی بڑھتی ہوئی تفریق اور عالمی غربت باہم مربوط اور ہم عصر مظاہر ہیں۔ 2003ء کی مجموعی عالمی پیداوار (GDP) کا تخمینہ 34.5 کھرب ڈالر لگایا گیا تھا۔ اس میں امریکہ کا حصہ 10.9 کھرب ڈالر کی مجموعی داخلی پیداوار (GDP) کیساتھ 31.6 فیصد بنتا ہے' جاپان کی مجموعی داخلی پیداوار 4.4 کھرب

ڈالر تھی جبکہ جرمنی کی 2.1 کھرب ڈالر۔ یوں دنیا کے تین امیر ترین ممالک کا دنیا کی مجموعی پیداوار میں حصہ 50.4 فیصد بنتا ہے جبکہ ان تینوں ممالک کی مجموعی آبادی 50 کروڑ 10 لاکھ ہے جو دنیا کی کل آبادی کا محض 8 فیصد ہے۔(3)

عالمی پیداوار کی اس قدر بے ہنگم تقسیم غریب اور امیر ممالک اور غریب ملکوں میں آبادی کی امیر اور غریب پرتوں کے درمیان اثاثوں کی ملکیت کے حجم یا ارتکاز میں بے انتہا فرق کا براہ راست نتیجہ ہے۔ایک عام اندازے کے مطابق ترقی پذیر ممالک کی 20 فیصد امیر آبادی کی ملکیت میں مادی (Physical) سرمایہ زمین وغیرہ' مالیاتی سرمائے (سٹاکس اور سیکیورٹی) اور انسانی سرمائے بہتر تعلیم اور صحت وغیرہ کی سہولتوں کی صورت میں پیداواری ذرائع کا 90 فیصد ہے جبکہ 80 فیصد آبادی آمدن پیدا کرنے والے سرمائے کے محض 10 فیصد حصے تک رسائی رکھتی ہے جس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک کی آبادیوں کی غریب ترین پرتیں وہ ہیں جن کے پاس حقیقی معنوں میں حصول آمدن کا کوئی بھی مالیاتی یا مادی اثاثہ ہی نہیں ہے۔غربت سے غربت ہی پیدا ہوتی ہے جبکہ دولت اضافی دولت کو جنم دیتی ہے اور سرمایہ داری نظام میں ترقی کا یہی اصول کارفرما ہے۔ اس لئے غریب مسلسل بڑھتی ہوئی غربت کی بھیانک دلدل میں دھنس کر رہ گئے ہیں جبکہ امیر خوشحالی کے گل کھلانے والی راحت اور عشرت کے مزے لوٹتے ہیں اور مزید منافع کماتے ہیں۔ معاشی پسماندگی اور ترقی کا یہی آہنی قانون ہے۔

لیکن مختصراً عالمی غربت کی موجودہ صورتحال کو زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔

''عالمی صورتحال 2005ء عالمی تحفظ کی ازسرنو تشکیل'' کی سالانہ رپورٹ میں مائیکل رینز جو ''عالمی صورتحال'' کے منصوبے کا معاون ڈائریکٹر ہے کے مطابق دہشت گردی ''محض ان کئی زیادہ گہرے مسائل

کی علامت ہے جنہوں نے اضطراب کے ایک نئے عہد کو جنم دیا ہے۔فوجی اخراجات میں اضافہ یا دوسرے ممالک میں افواج بھیجنے سے یہ مسائل حل نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس انتہائی عدم مساوات پر مبنی دنیا کو جوں کا توں برقرار رکھ کر یا سرحدوں کو بند کر دینے سے یہ ختم ہو جائیں گے۔

ان مسائل میں وبا کی طرح پھیلتی ہوئی غربت' تیز ترین معاشی تبدیلیاں جن سے عدم مساوات اور بیروزگاری میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے' بین الاقوامی جرائم' مہلک ہتھیاروں کا پھیلاؤ' بڑے پیمانے پر آبادی کی نقل مکانی' بار بار آنے والی قدرتی آفات کی تباہیاں' ایکوسسٹم کی ٹوٹ پھوٹ' نئی اور دوبارہ ظہور پذیر ہونے والی چھوتی بیماریاں' زمین اور قدرتی وسائل خصوصاً تیل پر بڑھتی ہوئی مقابلہ بازی شامل ہیں۔یہ تمام مسائل ایسے حالات کو جنم دیتے ہیں جن میں سیاسی عدم استحکام' جنگ اور انتہا پسندی پنپتے ہیں۔

ریز نے (آئی پی ایس) کو بتایا کہ اس وقت عالمی سطح پر ہونے والے دفاعی اخراجات ایک کھرب ڈالر سالانہ کے قریب ہیں جبکہ سماجی اور ماحولیاتی مسائل کے حل کیلئے کی جانے والی منصوبہ بندی پر اس سے کہیں کم خرچ آتا ہے۔(4)

خطرات میں گھرا ہوا سیارہ

اس سال کی ''عالمی صورتحال'' کی رپورٹ میں 20 سے زیادہ مصنفین کے مضامین شامل ہیں جو آبادی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں' جراثیمی بیماریوں اور جرائم سمیت غذائی تحفظ' تیل کی معیشت اور دفاعی اخراجات جیسے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔اس رپورٹ کے مطابق زیر زمین ایندھن (Fossil fuels) پر بے حد انحصار آج کی دنیا میں عدم استحکام کا سب سے بڑا سبب ہے۔توانائی کے ذرائع

تک رسائی کیلئے زبردست مقابلہ بازی جغرافیائی اور سیاسی تصادموں کو بھڑکا رہی ہے''جیسا کہ روس کے تیل اور گیس کیلئے چین اور جاپان میں کشمکش''اور اس کے ساتھ ساتھ خانہ جنگیوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور اس سارے عمل میں مقامی آبادیوں کے بنیادی انسانی حقوق کی شدید پامالی ہو رہی ہے۔ بلاشبہ تیل کے نئے ذخائر دریافت ہونے کی رپورٹیں مل رہی ہیں لیکن یہ نئے ذخائر تیل کی انتہائی قلیل مقدار کے حامل اور بہت دور دراز علاقوں میں واقع ہیں۔ عالمی سطح پر تیل کی مانگ میں اضافے کے باوجود تیل کی پیداوار ایک سطح پر رکی ہوئی ہے بلکہ حقیقت میں تیل پیدا کرنے والے 48 ممالک میں سے 33 ممالک کی پیداوار میں کمی واقع ہوئی ہے جن میں اوپیک کے 11 میں سے 6 ممالک بھی شامل ہیں۔

مزید براں گزشتہ برس کی پیچیدہ اور غیر یقینی اور عراق جنگ کی وجہ سے تیل کی ترسیل اور قیمتوں کا انتہائی اتار چڑھاؤ عالمی معاشی تحفظ پر شدید منفی اثرات مرتب کر رہا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ توانائی کیلئے اس ایندھن کا جلنا گلوبل وارمنگ اور موسمیاتی تبدیلیوں کا باعث بن رہا ہے' یہ تبدیلیاں نہ صرف انسانی معاشرے کیلئے طویل المعیاد خطرات ہیں بلکہ تیز ترین موسمی تبدیلیوں کے باعث طوفانوں کی تعداد اور شدت میں بھی اضافے کا سبب ہیں۔

جیسا کہ گزشتہ موسم گرما اور خزاں میں اٹھنے والے چار سمندری طوفان جنہوں نے فلوریڈا اور کیریبئن کے بعض علاقوں میں تباہی مچائی تھی اور قطرینہ اور ریٹا نامی طوفانوں کی حالیہ تباہ کاریاں۔ پانی تک رسائی کا حصول بھی عالمی سطح پر ایک سنجیدہ مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ پانی کی شدید قلت دنیا کے مختلف خطوں میں پڑوسی ممالک کے درمیان تصادموں کا باعث بنی ہے۔ ان تصادموں میں سب سے زیادہ شمال مشرقی افریقہ کا علاقہ متاثر ہوا ہے جس میں سوڈان کا صوبہ ڈارفر بھی شامل ہے۔ عالمی سطح پر اس وقت 43 کروڑ 40 لاکھ لوگوں کو پانی کی قلت کا سامنا ہے جبکہ پانی تک ناکافی

رسائی دیہی زندگی کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہے جس کی وجہ سے کسان اپنے گھروں اور کھیت کھلیانوں کو چھوڑنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ایک اندازے کے مطابق 2025ء تک 2ارب 60 کروڑ سے 3ارب 10 کروڑ لوگوں کو پانی کی کمی یا انتہائی شدید قلت کی صورتحال کا سامنا ہوگا۔ 30 سے زائد ممالک جن کی اکثریت افریقہ یا مشرق وسطیٰ کے ممالک پر مشتمل ہے پہلے ہی درکار فی کس زرعی زمین یا دوبارہ قابل استعمال بنائے جانے والے تازہ پانی کی کم ازکم مقدار کی سطح سے نیچے گر چکے ہیں۔خوراک کی قلت اور اس کی تقسیم بھی بڑھتے ہوئے مسائل میں سے ایک ہے اور اس کے حل کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہ عالمی عدم تحفظ میں اضافے کا باعث بن رہا ہے۔دنیا بھر میں تقریباً 2 ارب انسانوں کو نیم قحط سالی کا سامنا ہے اور صرف گزشتہ دہائی کے دوران ان میں 80 کروڑ لوگوں کا اضافہ ہوا ہے۔

صحت کے شعبے کی صورتحال یہ ہے کہ صرف 2002ء میں جراثیمی بیماریوں سے ایک کروڑ 50 لاکھ لوگوں کی زندگیوں کے چراغ بجھ گئے ان میں ایڈز کا شکار ہونے والے 30 لاکھ لوگ بھی شامل ہیں جن کی اکثریت ایسے نوجوان والدین پر مشتمل تھی جو اپنے خاندانوں کی کفالت کرنے والے تھے۔

ٹی بی اور ملیریا سمیت ماضی کی 20 قابل علاج بیماریاں گزشتہ ایک دہائی کے دوران دوبارہ ظہور پذیر ہو چکی ہیں جبکہ 1975ء سے 30 ایسی نئی بیماریوں کی شناخت ہو چکی ہے جن کا پہلے کسی کو علم نہیں تھا۔

> عدم استحکام کا باعث بننے والے آبادی کے دیگر عناصر میں سے ایک بڑھتی ہوئی نوجوانوں کی پرت (Youth buldge) ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس میں 15 سے 29 سال کی عمر کے لوگ بالغ آبادی کے 40 فیصد سے زائد ہیں اور اس وقت 100 سے زائد ترقی پذیر ممالک کو اس صورتحال کا سامنا ہے۔کئی ممالک میں خصوصاً مشرق وسطیٰ

اور سب صحارن افریقہ میں نوجوانوں میں مکمل بیروزگاری کی شرح 20 فیصد سے زیادہ ہے۔تقریباً 20 کروڑ نوجوان نیم بیروزگار یا بیروزگاری کا شکار ہیں جنہیں ان حالات میں اپنے خاندانوں کو سہارا دینے کیلئے آمدن کے غیر قانونی ذرائع یا جرائم کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔اور یہی نوجوان کئی ایک سماجوں میں شدید عدم استحکام کا باعث بننے والی زبردست قوت کی نمائندگی کرتے ہیں۔اس رپورٹ کے مطابق امداد دینے والے ممالک کے دفاعی بجٹ کا محض 7.4 فیصد حصہ اگر ترقیاتی امداد کی مد میں دیا جائے تو ضروری سماجی ترقی کیلئے درکار تمام فنڈز میسر آسکتے ہیں(5)

عدم استحکام--جو اپنی مثال آپ ہے

یہ تمام تر تبدیلیاں ایک ایسے وقت میں رونما ہو رہی ہیں جب انسان مریخ پر جانے کی تیاریوں میں مصروف ہے اور سائنس وتکنیک نے پیداواری صلاحیتوں کی ترقی کو اس سطح تک پہنچا دیا ہے کہ اس سیارے پر بسنے والے تمام انسانوں کی ضروریات سے زائد پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے۔گزشتہ 15 سالوں کے دوران ہمیں ایک لاکھ نئے کروڑ پتی بنتے ہوئے نظر آتے ہیں جبکہ اسی عرصے کے دوران دوارب سے زائد انسانوں کو غربت کی انتہائی لکیر سے نیچے دھکیل دیا گیا ہے۔مالیاتی سرمائے کی حکمرانی کو برقرار رکھنے اور بڑھوتری دینے کیلئے وحشی امریکی سامراج اپنی دیوہیکل فوجی طاقت کے ساتھ ایک کے بعد دوسرے ملک کو روندتا جارہا ہے۔اس تمام تر عمل سے معاشی اور سماجی تضادات شدت اختیار کرتے ہوئے ایک فیصلہ کن نقطے پر پہنچ چکے ہیں جس کے باعث ہمیں عالمی سطح پر ابھار اور دھماکے دکھائی دیتے ہیں۔محنت کش عوام کیلئے یہ کیفیت ناقابل برداشت ہوتی جارہی ہے۔اور دنیا کے مختلف خطوں اور ممالک میں تہذیب مٹ رہی ہے اور بربریت کے بدنما عناصر سر اٹھا

رہے ہیں۔

موجودہ عالمی صورتحال کی خاصیت کیا ہے؟ اسے درست طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ عرصے کا استحکام ٹوٹ چکا ہے اور گزشتہ عہد کا توازن ہر جگہ پر تشدد دھماکوں سے تہس نہس ہو رہا ہے۔ اب جدھر بھی نظر دوڑائیے ہر سطح پر بے پناہ اور ان دیکھا عدم استحکام حاوی نظر آتا ہے۔ یہ 1945ء کے بعد کا سب سے غیر مستحکم عہد ہے۔ مکمل روزگار اور خوشحالی کی جگہ ہمیں بحران، بڑھتی ہوئی بے روزگاری، غربت میں اضافہ اور معیار زندگی میں کٹوتیاں نظر آتی ہیں حتیٰ کہ انتہائی خوشحال ملکوں کی صورتحال بھی یہی ہے۔ امیر اور غریب کے درمیان تفریق کی خلیج میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور معاشی طاقت کم سے کم ہاتھوں میں مرکوز ہوتی جا رہی ہے۔

> گزشتہ توازن درہم برہم ہو چکا ہے نہ صرف طبقات بلکہ قوموں کے مابین بھی۔ 1945ء کے بعد سے اب تک عالمی صورتحال کبھی بھی اس قدر ہلچل اور انتشار کا شکار نہیں رہی۔ عالمی طاقتوں کے باہمی تعلقات میں تناؤ اور کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے اور امریکہ کی عالمی تسلط کی ہوس ایک کے بعد دوسری جنگ کو جنم دے رہی ہے۔ اس حوالے سے عراق جنگ کوئی حادثہ نہیں بلکہ ایک عمومی رجحان کا اظہار تھا۔ اس میں وہ تمام مضمرات شامل ہیں جو مشرق وسطیٰ اور عالمی سطح پر عمومی صورتحال کی غمازی کرتے ہیں [.....] بظاہر پرسکون سطح کے نیچے غصے، ناامیدیوں اور ناراضگیوں کا لاوا مجتمع ہو چکا ہے۔ عدم استحکام خود اس صورتحال کی کوکھ میں موجود ہے۔ اس لئے وہ تبدیلیاں جو ایک مختلف صورتحال میں بے اثر یا معمولی اثرات مرتب کرتیں موجودہ صورتحال میں دیوہیکل تغیرات کا باعث بن رہی ہیں ان تبدیلیوں کی نوعیت سیاسی بھی ہو سکتی ہے معاشی بھی اور عسکری بھی۔ لیکن ہر معاملے میں نتائج اسباب سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے غیر جدلیاتی اور سطحی طرز فکر جس کا انحصار واقعات کے بہاؤ پر ہوتا ہے اسے سطح کے نیچے

گہرائی میں موجود قوانین کی بھرپور عملداری کا کبھی گماں تک نہیں ہوتا اسی لئے وہ عوامل کی وضاحت ایک یا دوسرے حادثاتی عناصر میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں ---- مثلاً جارج بش کے اقدامات یا بن لادن کا پاگل پن وغیرہ ---- بلا شبہ ان انفرادی عناصر کا بھی ایک مخصوص کردار ہوتا ہے لیکن اصل وجہ یہ حقیقت ہے کہ سرمایہ داری نظام عالمی پیمانے پر اپنی انتہاؤں کو پہنچ چکا ہے اور قومی ریاست اور نجی ملکیت کے اپنے داخلی تضادات کے باعث لڑکھڑا رہا ہے۔ (6)

موجودہ عہد کا دھماکہ خیز کردار کوئی حادثہ نہیں بلکہ محض اس حقیقت کا اظہار ہے کہ عالمی سطح پر سرمایہ داری بحیثیت ایک تاریخی ترقی پسندانہ نظام کے اپنی تمام تر صلاحیتوں سے محروم ہو چکی ہے۔ 1945ء سے 1974ء کے عرصے کے دوران پیداواری قوتوں کی ترقی نے حیران کن نتائج حاصل کیے لیکن اب نجی ملکیت اور قومی ریاست کی جکڑ بندیاں اسی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئی ہیں۔ اور آج انسانی ترقی کی راہ میں حائل یہی دو سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔ مستقبل میں نسل انسانی کی ترقی کا انحصار ان بیہودہ رکاوٹوں کو اکھاڑ پھینکتے ہوئے عالمی سوشلزم کی بنیاد پر ایک عقلی اور ہم آہنگ معاشی نظام کی استواری پر ہے۔ اچانک اور تیز ترین تبدیلیاں موجودہ صورتحال کا خاصہ ہیں۔ لینن نے کہا تھا کہ سیاست مجتمع شدہ معیشت ہوتی ہے۔

عالمی معیشت کی انتہائی پریشان کن صورتحال کی عکاسی تمام طبقات کی نفسیات سے ہوتی ہے جس کا پہلا اظہار حکمران طبقے کے رویوں سے ہوتا ہے۔ اس وقت سرمایہ داری نظام کے نمائندگان کا موڈ جنونی رجائیت اور گہری مایوسی کے بیچ جھول رہا ہے۔

سرمایہ داری نظام کا عالمی بحران اپنی بنیاد میں زائد پیداوار کا بحران ہے (جس کا اظہار زائد پیداواری صلاحیت کی صورت میں ہو رہا ہے۔ قرضوں اور خساروں

نے اس زوال میں مزید شدت پیدا کر دی ہے تاہم یہ محض اس بنیادی مسئلے کی علامات ہیں۔ ایک دہائی سے زائد عرصے پر محیط گلوبلائزیشن کے باوجود ماضی کے تضادات میں سے کوئی ایک بھی ختم نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس یہ تضادات اپنی شدت اور وسعت میں ہزاروں گنا اضافے کے ساتھ بہت بڑے پیمانے پر دوبارہ سر اٹھا رہے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک تصادموں کا ایک نہ تھمنے والا سلسلہ انتہائی تیز رفتاری سے پھیلتا جا رہا ہے۔قومی مسئلہ ختم ہونے کی بجائے نہ صرف ہر جگہ زور پکڑتا جا رہا ہے بلکہ انتہائی مہلک کردار کا حامل بھی ہوتا جا رہا ہے۔ ایک کے بعد دوسری جنگ بھڑک رہی ہے۔ یہ ''آزاد منڈی کی معیشت'' کی محدود اور سانس روک دینے والی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عالمی معیشت کے جمود کی عکاسی ہے۔ یہ خون آشام سرمایہ داری کا عہد ہے۔ یہی وہ بنیادی تضادات ہیں جو عالمی طور پر امریکہ کے کردار میں تبدیلی اور اس کے انتہائی جارحانہ سامراجی پالیسیوں کے اختیار کرنے کی درست وضاحت کرتے ہیں۔ ہر ملک کے سرمایہ داروں کو یہ آہنی ضرورت درپیش ہے کہ وہ غیر ملکی منڈیوں پر قبضہ جمائیں' جیسے ہڈیوں پر کتے لڑتے ہیں۔اس قسم کی صورتحال میں یہ سوچ کہ برائے نام غیر جانبدار عالمی ادارے سامراجیوں کی باہمی لڑائیوں کو ختم کرا سکتے ہیں اتنی ہی احمقانہ ہے جتنی یہ سوچ کہ کوئی فرد آدم خور چیتے کو گھاس کھلانے پر آمادہ کر سکتا ہے۔اس کا اطلاق صرف اقوام متحدہ پر نہیں ہوتا بلکہ عالمی تجارتی تنظیم پر بھی ہوتا ہے جس کا مستقبل بھی اب مشکوک ہے۔

تاہم عالمی معیشت یا سیاست میں چیزیں اتنی سادہ نہیں ہوتیں۔ جدلیاتی اعتبار سے ایک چیز دوسری پر اثر انداز ہوتی ہے اور عالمی تجارت کا نحیف جال اس حد تک ٹوٹ پھوٹ سکتا ہے کہ اس کا ازالہ ممکن نہ ہو۔ عالمی معیشت علاقائی بنیادوں پر ٹکڑوں میں بٹ سکتی ہے۔ کیونکہ ہر سامراجی گروہ دنیا کے مختلف خطوں پر اپنا تسلط مستحکم کرنے

کی جلدی میں ہے۔

یوں ہم تاریخ کے ایک ایسے عہد میں داخل ہو رہے ہیں جو گزشتہ نصف صدی کے برعکس 1930ء کی دہائی سے زیادہ مماثل ہوگا۔ یہ عالمی معیشت کیلئے ایک طوفان خیز عہد اور ایک ملک اور براعظم کے بعد دوسرے میں جنگوں' انقلابات اور ردانقلابات کا پس منظر ثابت ہوگا۔

یہ تضادات پہلے ہی ساری دنیا میں تصادموں' جنگوں اور دھماکہ خیز صورتحال کا باعث بن رہے ہیں۔ اس وقت دنیا میں جتنے تصادم اور بغاوتیں پھوٹ رہی ہیں تاریخ میں ان کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ انہی نقطہ ہائے اشتعال میں سے ایک کشمیر ہے۔

باب نمبر 2

امن کی عظیم جعل سازی

اتحاد جن کی پہلی شرط ہی علیحدگی ہے! جدو جہد یں جن کا پہلا قانون عدم فیصلہ ہے۔سکون اور استحکام کے نام پر وحشی اور بے معنی اشتعال، پھر انقلاب کے نام پر انتہائی استحکام اور امن کا مقدس درس، جذبے جن میں سچائی نہ ہو، سچائیاں جو جذبوں سے عاری ہوں۔ ایسے ہیرو جن کا کوئی جراتمندانہ کارنامہ نہ ہو۔ واقعات کے بغیر تاریخ، ترقی جس کو چلانے کا واحد تسلسل وقت ہو، جو مسلسل تکرار کے تناؤ اور رعائتوں سے تھک گئی ہو۔ایسے تنازعے اور چپقلشیں جو بار بار ابھر کے اپنے آپ کو ایک بے معنی انتہا پر پہنچا کر اپنی شدت کھو دیتی ہیں اور اپنے آپ کو کبھی حل کیے بغیر بکھر جاتی ہیں۔انتہائی فخر سے پیش کی گئی جانفشانی وسرگرمی اور حکمرانوں کا دنیا کے خاتمے کا خوف اور پھر اس کے ساتھ گھٹیا ترین سازشیں اور درباروں کے مضحکہ خیز کھیل جو دنیا کے رکھوالے پیش کرتے ہیں۔

کارل مارکس (1)

کشمیر---ایٹمی جنگ کا جواز

تقسیمِ ہند اور براہِ راست برطانوی راج کے خاتمے کے پچاس سال بعد تک بھی کشمیر ابھی تک ایک رستا ہوا زخم ہے۔ایسا لگتا ہے کہ اس تنازعے کا دور دور تک کوئی حل موجود نہیں۔ساڑھے تین جنگیں اور کئی دہائیوں کی سرکاری اور غیر سرکاری سفارتکاری بھی برصغیر کے اس سلگتے ہوئے مسئلے کا کوئی تلاش کرنے میں ناکام رہی ہیں۔

1989ء سے لے کر اب تک نوے ہزار لوگ مارے جا چکے ہیں اور کوئی ایسا خاندان نہیں جو ریاستی تشدد اور مسلح دہشت گردی کے ہاتھوں متاثر نہ ہوا ہو۔سات سال پہلے ہندوستان اور پاکستان ، دونوں ممالک اعلانیہ طور پر ایٹمی طاقت بن گئے تھے،اور اسی کے ساتھ ہی جنگ کا آخری دور شروع ہوا جس میں کارگل کی جنگ اور نئی دہلی میں پارلیمنٹ ہاؤس پر حملہ شامل تھے۔اس وقت امریکہ نے بھی اپنے غیرضروری سفارتکاروں کو برصغیر سے واپس بلا لیا تھا کیونکہ امریکہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ جلد ہی ایٹمی جنگ کا آغاز ہو جائے گا۔پاکستان اور بھارت کے ایٹمی طاقت بننے کے بعد کشمیر، جو کہ دونوں کے درمیان تنازعے کا باعث ہے،عالمی طور پر ایک اہم مسئلے کے طور پر ابھرا ہے۔

کارگل کے واقعے کے دوران برصغیر کے ان دونوں ممالک کی آپس کی سفارتی سازشوں میں امریکی سامراج نے ایک اہم کردار ادا کیا۔

> جنوری 1998ء میں،ایک اہم امریکی عہدیدار، جو کہ جنوبی ایشیا کے معاملات پر معمور تھا، نے اپنی آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے بتایا کہ کشمیر کی واشنگٹن میں کیا اہمیت ہے۔اس نے کہا ''کبھی کبھار ہم جنوبی ایشیا میں جنگ کے بارے میں فکر مند ہوتے ہیں، لیکن مسئلہ کشمیر ہماری نیندیں برباد نہیں کرتا۔''(2)

1998ء میں پاکستان اور بھارت کی جانب سے کیے جانے والے ایٹمی دھماکوں نے پوری دنیا کو حیران کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ واشنگٹن کو بھی ان دھماکوں کا پہلے سے علم نہیں تھا۔ اگلے ہی سال کارگل میں لڑائی نے ساری دنیا کو یہ یاددہانی کرائی کہ مسئلہ کشمیر ابھی بھی سلگ رہا ہے۔ دونوں اطراف طبلِ جنگ بج رہا تھا، ذرائع ابلاغ یہ بھولتے ہوئے کہ ایٹمی جنگ کے کتنے بھیانک نتائج ہو سکتے ہیں، ایٹمی جنگ کا واویلا کر رہے تھے۔ پرافل بدوائی اور اچن ونائک اس بھیانک صورتحال کو ایسے بیان کرتے ہیں:

> ایٹمی ہتھیار فوجی اور عام شہری میں تمیز کئے بغیر وسیع پیمانے پر تباہی لاتے ہیں۔ بے شک یہ باقی سب ہتھیاروں سے مختلف ہیں اور جو چیز ان کو زیادہ خوفناک بناتی ہے وہ یہی ہے کہ یہ بلا امتیاز قتل کرتے ہیں اور بہت بڑے پیمانے پر قتل کرتے ہیں۔ ایٹمی ہتھیار جس انداز میں قتل کرتے ہیں وہ انتہائی خوفناک اور ظالمانہ ہے۔ جہاں یہ بم گرتا ہے وہاں 20 کلومیٹر تک کے دائرے میں درجہ حرارت بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے جس سے ہر جاندار شے ختم ہو جاتی ہے، اس کے زوردار دھماکے کے باعث تمام عمارتیں زمین بوس ہو جاتی ہیں۔ آگ کے طوفان برپا ہوتے ہیں جن سے ایک تیز روشنی نکلتی ہے جس میں زہریلے مادے کی بہت بڑی مقدار پائی جاتی ہے۔ اس زہریلے مادے کا کچھ حصہ تو فوری طور پر اثر کرتا ہے اور باقی فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے جو آنے والی کئی صدیوں تک موجود رہتا ہے۔ (جیسا کہ پلوٹونیم 239 کی نصف زندگی 24,400 سال ہے)۔(3)

ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹمی دھماکے کا شکار ہونے والے لوگوں پر کی جانے والی تحقیق سے یہ بات سچ ثابت ہوتی ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں سے جو موت واقع ہوتی ہے وہ انتہائی سفاکانہ ہے، جو زخم آتے ہیں وہ بہت دیر تک باقی رہتے ہیں اور صحت

کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ لوگوں کی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ان دو شہروں پر حملے کے بعد لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ ''زندہ بچ جانے والے مرنے والوں پر رشک کرتے ہیں۔''

> ہر وہ ملک جو ایٹمی طاقت ہے، اس نے ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے کے جامع منصوبے بنائے ہوئے ہیں۔ ان ممالک کی دفاعی حکمت عملی کے باعث ان منصوبوں کی نوعیت میں تھوڑا بہت فرق ہو سکتا ہے، جیسا کہ ہم ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال میں پہل نہیں کریں گے اور صرف ان ممالک کے خلاف استعمال کریں گے جو ایٹمی طاقت ہیں یا یہ کہ یہ ہتھیار ہماری قوت مزاحمت کو بڑھانے کے لئے ہیں اور ہم انہیں غیر ایٹمی ممالک کے خلاف حفظِ ماتقدم کے طور پر استعمال کریں گے، تمام پانچوں ایٹمی طاقتوں (P5) کے پاس ان ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کے بارے میں مکمل منصوبے موجود ہیں۔ یہ منصوبے محض ارادوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ انتہائی قابل اعتراض ہیں۔ ان منصوبوں میں ان ہتھیاروں کے استعمال کرنے کی تربیت، انتہائی مہنگے دفاعی ڈھانچے کا قیام (جس پر صرف امریکہ کا چار ہزار ارب ڈالر خرچہ آیا ہے) اور ایسے جنگی منصوبوں کی تخلیق شامل ہے جن میں ایٹمی ہتھیار مرکزی کردار ادا کریں۔ (4)

اسی لئے برطانیہ، جو کہ سب سے کم ترقی یافتہ ایٹمی ریاست ہے، نے اب یہ راز افشا کر دیا ہے کہ اس کے پاس بھی زیرِ زمین پناہ گاہیں موجود ہیں جن میں وائٹ ہال اور دوسری سرکاری عمارتوں کی ہو بہو نقل موجود ہے اور اس پناہ گاہ میں ایک 'مین سٹریٹ' بھی ہے۔

ایٹمی قوت مزاحمت صرف ایک خیال یا دفاعی حکمت عملی کا کوئی مجرد نظریہ نہیں ہے۔ اس کے ذریعے دوسرے ممالک کو وسیع پیمانے پر تباہی کی دھمکی دے کر اپنے آپ کو محفوظ بنایا جاتا ہے، ایک ایسی دھمکی جو قابل اعتماد ہو اور جسے ضرورت پڑنے پر

عمل میں بھی لایا جا سکے۔اس کو قابل اعتماد بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اتنے ہی بڑے پیمانے پر عسکری صلاحیت بھی موجود ہو اور ایٹمی حملہ کرنے کی تیاری بھی ہو۔اس کے لئے حملہ کرنے کی خواہش کا اظہار بھی بہت ضروری ہے۔

ونا ئک اور بدوائی ایٹمی صلاحیت اور 'قوت مزاحمت' کے پیچھے موجود ذہنیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> اخلاقی طور پر ایٹمی قوت مزاحمت انتہائی قابلِ اعتراض، قابل نفرت اور قابل تذلیل ہے اور کوئی مہذب شخص اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ لوگ جو ایٹمی قوت مزاحمت کی وکالت کرتے ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنا تحفظ اس انداز سے کریں کہ وہ کسی بھی وقت 'دشمن ملک' کے بے گناہ شہریوں پر ظلم ڈھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہ لوگ اس قسم کے ہتھیاروں کے استعمال کو نہ صرف جائز اور معمول کی چیز بناتے ہیں بلکہ انہیں فوجی حکمت عملی کا لازمی جزو بھی قرار دیتے ہیں۔ایٹمی قوت مزاحمت ایسے ہی ہے جیسے اخلاقیات کا گلا گھونٹ کر تشدد کو قابلِ ستائش عمل گردانا جائے۔
>
> ایٹمی ہتھیاروں کی زبان میں نہ صرف مردانگی، جارحیت اور اخلاقی دیوالیہ پن پایا جاتا ہے بلکہ اس میں دھوکہ دہی، مدح سرائی اور گمراہی بھی ہے۔ایٹمی ہتھیاروں کی بحث میں غیر انسانی اور جھوٹی انسانیت کی دونوں سمتیں پائی جاتی ہیں۔اسی لئے 'باہمی نقصان'، 'نقصان کی قابل قبول سطح' اور 'ایٹمی سفارتکاری' وغیرہ جیسی باتیں کی جاتی ہیں۔امریکی سائنسدانوں نے پہلے دھماکے (جولائی 1945ء) کو گیجٹ (Gadjet) کا نام دیا تھا جبکہ جاپان پر جو پہلے بم گرائے گئے ان کے نام 'چھوٹا لڑکا' اور 'موٹا آدمی' تھے۔سوویت یونین نے اپنے پہلے بم کا نام 'دی آرٹیکل' رکھا۔برطانیہ نے اپنے ایٹمی دھماکے کا نام 'ہری کین'،

فرانس نے 'بلیو ماؤس' اور چین نے 'ڈیوائس 596' رکھا۔ بھارت نے 1974ء میں اپنے پہلے کامیاب دھماکے کا نام 'مسکراتا ہوا بدھا'' رکھا جبکہ 1998ء کے دھماکوں کو 'شکتی' کا نام دیا گیا۔(5)

نیوکلئیر ازم کی بحث ایسی چیزیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے جن کے بارے میں اخلاقی طور پر کبھی سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا خاتمہ یہیں نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعے ایٹمی ہتھیاروں کے انتہائی بھیانک کردار اور ایٹمی قوت مزاحمت کو ایک ایسا عمل بنایا جاتا ہے جو روزمرہ کی معمولی سی بات ہو۔ عام طور پر 'قومی سلامتی'، 'قومی مفاد' اور 'قومی وقار' کے نام پر ایٹمی ہتھیاروں کی صفائی پیش کی جاتی ہے۔

ایٹمی ہتھیاروں کے وجود اور ان کے پھیلاؤ کی بنیادی وجہ طاقتور ریاستوں کی باہمی عداوت' بدگمانی اور تجارتی میدان میں مقابلہ بازی ہے۔ دونوں اطراف مقابلے کا سماں ہوتا ہے۔ ایک طرف کے اسلحے کے انبار پر دوسری طرف کے لوگ رشک کرتے ہیں اور اس طرح دونوں طرف اسلحے کے ڈھیر لگتے جاتے ہیں، ایک میزائل دوسرے میزائل کو جنم دیتا ہے اور پھر دونوں جانب کے نظریہ دان مقابلے پر نظریے پیش کرتے ہیں تاکہ اس اسلحے کی دوڑ کی دلیل دی جا سکے۔

ایٹمی ہتھیاروں کا غیر اخلاقی پن پاکستان اور بھارت میں مزید عریاں ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ دونوں دنیا کے غریب ترین ممالک ہیں اور ان کے حکمران اپنی عوام کی اکثریت کو معمولی سا تحفظ بھی فراہم نہیں کر سکے۔ اس کے باوجود برصغیر کے کئی پالیسی ساز اور رائے عامہ تشکیل دینے والے افراد یہ دھوکہ دیتے ہیں کہ ایٹمی ہتھیار نسبتاً سستے ہیں اور یہ معیشت پر بوجھ نہیں بنتے۔ بھارت اور پاکستان میں ایٹم بم کے حمایتی ایٹمی ہتھیاروں پر ہونے والے اخراجات کو اصل سے کم بتاتے ہیں۔ یہ ممالک پہلے ہی وسائل کی کمی کا شکار ہیں اور ان ایٹمی ہتھیاروں کے باعث انتہائی ضروری ترقیاتی کاموں کے لئے بھی وسائل نہیں بچتے۔ ایٹمی اسلحے کی یہ دوڑ ان کی معیشتوں کو

تباہ کرسکتی ہے۔

چونکہ تمام ممالک اپنے ایٹمی ہتھیاروں اور میزائل پروگراموں کی معلومات کو انتہائی حساس قرار دے کر راز میں رکھتے ہیں اس لئے کسی بھی فوج میں ایٹمی اور رسمی ہتھیاروں کا تناسب اور ان پر اٹھنے والے اخراجات کے بارے میں درست اعداد و شمار نہیں دیئے جاسکتے۔

ایٹمی آڈٹ' کے مطابق 1940ء سے 1996ء کے درمیان امریکہ نے (1996ء کی شرح مبادلہ پر) اپنے ایٹمی پروگرام پر 5500 ارب ڈالر خرچ کئے۔ اگر ان اخراجات میں ایٹم بموں کو (مستقبل میں) ناکارہ بنانے اور ماحولیاتی آلودگی ختم کرنے کا خرچ شامل کیا جائے تو یہ 5821 ارب ڈالر تک پہنچ جاتے ہیں۔ 1996ء تک امریکہ میں ہونے والے فی کس اخراجات 21,646 ڈالر تھے۔ یہ رقم 1998ء میں دنیا کی اوسط فی کس آمدنی سے چار گنا زیادہ ہے۔ یہ رقم اتنی زیادہ ہے کہ اگر ایک ڈالر کو ایک سیکنڈ میں گنا جائے تو اس ساری رقم کو گننے کیلئے 184,579 سال لگیں گے۔ اگر ایک ڈالر فی انچ کے حساب سے اینٹیں بنائی جائیں اور انہیں ایک دوسرے کے اوپر رکھا جائے تو یہ دیوار چاند تک پہنچ کر واپس آجائے گی۔

بروکنگز میں ہونے والی تحقیق کے چند حیران کن حقائق درج ذیل ہیں:

* نقل و حمل کے نظام پر 3,241 ارب ڈالر لاگت آئی (کل پروگرام کی لاگت کا 55.7 فیصد)

* دفاعی ڈھانچہ، مواصلات اور جاسوسی کے نظام پر 831.1 ارب ڈالر لاگت آئی (کل پروگرام کی لاگت کا 14.3 فیصد)

* 'بم کے دفاع' کی مد میں احمقانہ طور پر 937.2 ارب ڈالر کی

بھاری رقم خرچ کی گئی، جس میں بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کی گئیں جن میں 1500 زیر زمین پناہ گاہیں شامل ہیں۔

امریکی حکومت کی طرف سے غیر ایٹمی قومی دفاع' پر کئے جانے والے اخراجات کے بعد یہ اخراجات باقی تمام شعبوں سے زیادہ ہیں۔ یہ اخراجات صحت، تعلیم، ماحولیات، خلائی تحقیق اور قانون کے نفاذ جیسے شعبوں کے مشترکہ اخراجات سے بھی زیادہ ہیں۔اس رقم سے جو ترقی حاصل کی جا سکتی تھی اس کے ضائع ہونے کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں۔اگر امریکی حکومت وہ 98ارب ڈالر جو 1940ء سے لے کر 1996ء تک ہر سال اوسطاً ایٹم بم پر خرچ کرتی رہی ہے کا نصف بھی ترقیاتی کاموں پر خرچ کرتی تو اپنے دوہرے معیار اور عدم مساوات پر مبنی معاشرے میں سے غربت اور محرومی کا ہر نشان مٹا سکتی تھی۔

بھارت کی حکومت کا فوج پر کیا جانے والا خرچ اس کے صحت، تعلیم اور دوسرے سماجی شعبوں پر کئے جانے والے مشترکہ خرچ کا دگنا ہے۔ ایک ایٹم بم کی قیمت میں 3200 گھر بنائے جا سکتے ہیں۔ ایک اگنی میزائل پر آنے والے خرچے سے 1300 0 بنیادی صحت کے مراکز چلائے جاسکتے ہیں۔(6)

جنگ، امن اور غربت

اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے انسانی ترقی کے اعشاریے کے مطابق 174 ممالک میں بھارت اور پاکستان تقریباً آخری نمبر پر ہیں۔انسانی ترقی کے اعشاریے کے مطابق 1992ء میں پاکستان 120ویں نمبر پر تھا جو 1999ء میں 138 میں نمبر پر آ گیا۔ جبکہ 1995ء سے اب تک بھارت کا نمبر 130 اور 140 کے درمیان ہے۔ یہ فہرست صرف غربت کی بنیاد پر مرتب نہیں کی گئی بلکہ اس

میں بنیادی انسانی ضروریات سے انتہائی سنگدلانہ غفلت اور لاپرواہی کے ساتھ ساتھ سرکاری اخراجات کی غلط ترجیحات بھی شامل ہیں۔

دونوں ممالک میں کشمیر سمیت تمام جگہوں پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں۔ دونوں ریاستوں میں ایسی طاقتیں موجود ہیں جو اپنے مفادات کے لئے کام کررہی ہیں۔ سامراج کی لوٹ مار کے بعد جنوبی ایشیا کی غربت کی وجہ عسکری ساز وسامان اور مسلح افواج پر بڑھتے ہوئے اخراجات ہیں۔

> سیاچن میں دونوں اطراف کے فوجی مارے جاتے ہیں، گو کہ اکثر اوقات مارے جانے کی وجہ دشمن فوج کی بجائے سردی کی شدت ہوتی ہے۔ دونوں ممالک اتنے سخت موسم میں لڑائی کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر اخراجات کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر 93-1992 میں سیاچن میں بھارت کا روزانہ کا خرچہ 5 کروڑ روپے (19 لاکھ 40 ہزار ڈالر) تھا جو سالانہ دفاعی بجٹ کا دس فیصد بنتا ہے۔ (7)

واہگہ پر ایک دوسرے کے والہانہ استقبال ہو رہے ہیں، لیکن دوسری طرف سیاچن میں سپاہی سردی سے مر رہے ہیں۔ کرکٹ کے میدان میں دوستی کو فروغ دیا جا رہا ہے لیکن میزائلوں کے تجربوں میں بھی تیزی آ گئی ہے۔ اس امن کے عمل کے دوران دفاعی بجٹ میں اس طرح اضافہ کیا گیا ہے جیسے کسی جنگ کے دوران کیا جاتا ہے۔ دونوں طرف اسلحے کے انبار لگائے جا رہے ہیں۔ اس دوران امریکی پاکستان کو F-16 طیارے بیچ رہے ہیں جبکہ دوسری طرف بھارت کو AWACS اور F-18 طیارے فروخت کئے جا رہے ہیں۔ جتنا پیسہ اب اسلحے پر صرف کیا جا رہا ہے اتنا تاریخ میں کسی بھی دو ملکوں کے درمیان امن کے دور میں نہیں لگایا گیا۔ آج پاکستان اور بھارت مشترکہ طور پر جتنا پیسہ اسلحے کی خریداری پر خرچ کرتے ہیں وہ پوری دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ دوسرے نمبر پر سعودی عرب ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان

اعتماد سازی کا نام نہاد عمل شروع کیا گیا ہے جس کا بہت واویلا کیا جاتا ہے لیکن اس سارے عمل کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ وزارتی سطح پر ایک نئی براہِ راست ٹیلی فون لائن قائم کی جاتی ہے۔

بش انتظامیہ کی اسلامی عسکریت پسندوں کے خلاف جنگ میں حمایت کرنے کے انعام کے طور پر امریکہ پاکستان کو 75 ایف-16 طیارے خریدنے کی اجازت دے رہا ہے۔ یہ پاکستان کی ان خدمات کے عوض بہت معمولی ہے جس میں اس نے اپنے پرانے دوستوں اور اتحادیوں کو واشنگٹن کے حوالے کر دیا تھا۔

پاکستان کی ریاست نے ان F-16 طیاروں کے لئے 3 ارب ڈالر ادا کئے ہیں۔ اگر اسلحے پر خرچ کی جانے والی اس بھاری رقم کو ترقیاتی کاموں پر خرچ کے حوالے سے دیکھیں تو ان حکمرانوں کی نیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ پاکستان کے ہر سو مربع کلومیٹر کے علاقے میں عالمی معیار کے بنیادی صحت کے مراکز کی تعمیر پر ایک ارب ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔

گیارہ F-16 طیاروں کی قیمت (پچاس کروڑ ڈالر) میں ایک لاکھ دیہاتوں میں چار کمروں کے سکول بنائے جا سکتے ہیں۔ جن سے ہر سال چالیس لاکھ بچے تعلیم حاصل کر سکتے ہیں

2005-06ء کے بجٹ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے 11.7 ارب روپے رکھے گئے تھے۔ صرف پانچ F-16 طیاروں کی قیمت سے اس رقم کو دگنا کیا جا سکتا تھا۔ صحت کے شعبے کے لئے مختص کی گئی کل رقم 4.128 ارب روپے ہے۔ صرف دو F-16 طیاروں کی قیمت سے اس رقم کو دگنا کیا جا سکتا تھا۔ پچھلے 58 برسوں میں پاکستان نے 24 سیمنٹ فیکٹریاں لگائیں ہیں۔ مزید 24 فیکٹریاں لگانے کے لئے ایک ارب ڈالر کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں تقریباً 50 شوگر ملیں ہیں اور مزید پچاس شوگر ملیں لگانے کے لئے ایک ارب ڈالر کی ضرورت ہے۔ کھاد کی پیداوار کو دگنا کرنے کے

لئے بھی اتنی ہی رقم درکار رہے۔ اگر اس رقم کو فوجی ساز و سامان کی خریداری پر ضائع نہ کیا جاتا تو پاکستان کی پیداواری صلاحیت اور ڈھانچے کو خاطر خواہ ترقی دی جا سکتی تھی۔ لیکن یہ فوجی اخراجات سرمایہ دارانہ نظام کی ضرورت ہیں۔

امریکہ بھارت کو کم از کم 126 جدید ترین لڑاکا طیارے بیچنا چاہتا ہے۔ ان جدید ترین F-16 یا پھر F-18 طیاروں کی کل قیمت ساڑھے تین ارب ڈالر بنتی ہے۔ یہ تو آغاز ہے۔ امریکہ کی اسلحے کی صنعت اور پینٹا گان بھارت کی اسلحہ خریدنے کی صلاحیت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا جا رہا ہے کہ امریکہ بھارت کو جدید ترین الیکٹرانک کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم، دفاعی سیٹلائٹ کی ٹیکنالوجی، بحری ساز و سامان، میزائل سے دفاع اور جلد اطلاع کا نظام بیچے گا۔

اسرائیل کی بھارت کو اسلحے اور دفاعی ٹیکنالوجی کی فروخت میں بھی تیزی آتی جا رہی ہے۔ روس کے بعد اسرائیل بھارت کو اسلحہ فروخت کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے۔ اسلحے اور فوجی ساز و سامان کے علاوہ اسرائیل بھارت کو جدید ایٹمی ہتھیار، میزائل ٹیکنالوجی اور خلاء سے کام کرنے والا جاسوسی کا نظام بھی بیچ رہا ہے۔

اسرائیل اور نئی دہلی کے درمیان بہت سنجیدہ مذاکرات چل رہے ہیں جس میں اسرائیل بھارت کو نیا اینٹی میزائل سسٹم Arrow بیچنا چاہتا ہے۔ یہ سودا امریکہ کی منظوری کے بغیر طے نہیں پا سکتا۔ Arrow کم اور درمیانے درجے کے بین البراعظمی میزائلوں کے خلاف بہت زیادہ موثر ہے۔ پاکستان کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کو لے جانے کے لئے یہی میزائل ہیں۔ پاکستان کے پاس کوئی اینٹی میزائل سسٹم بھی نہیں ہے۔ اگر بھارت کے پاس Arrow سسٹم آ جاتا ہے تو پاکستان کی ایٹمی قوت مزاحمت کمزور ہو جائے گی جس کے باعث بھارت کسی بھی بڑے تنازعے کے دوران اپنے میزائلوں کے ذخیرے کو مؤثر طور پر استعمال کر سکتا ہے۔

بھارت جلد ہی ریڈار کے نئے جدید نظام AWACS کو نصب کرنا شروع کر

دے گا۔ جدید دور کی جنگوں میں تیزی سے حرکت کرتی ہوئی فوجوں کے کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم پر بہت زیادہ انحصار کیا جاتا ہے۔جن ملکوں کے پاس یہ نظام نہیں ہوتا ان کی شکست یقینی ہوتی ہے جیسا کہ عرب فوجوں کی پے در پے شکستوں میں یہ بات واضح ہوئی ہے۔

AWACS کے ذریعے بھارتی کمانڈر پاکستان کی مکمل فضائی حدود اور پاک فضائیہ کی مکمل نقل وحرکت پر نظر رکھ سکیں گے اور تقریباً ہر طیارے کو اڑنے سے لے کر واپس زمین پر آنے تک دیکھ سکیں گے۔ اسرائیل سے ملنے والے اس ریڈار کے ذریعے دن رات ، سردی گرمی ، بارش ، دھند، گرد وغبار ہر قسم کے حالات میں پاکستان کی زمینی افواج کی مکمل حرکت پر نظر رکھی جا سکے گی۔

بھارت کی تیز ترین اسلحے کی خریداری کے باعث ، جس میں فرانسیسی اور روسی لڑاکا طیارے، سینکڑوں ٹینک، بکتر بند گاڑیاں' بھاری توپ خانہ اور نئے میزائل سسٹم کی تنصیب شامل ہے، پاکستان کی افواج بھارت کے مقابلے میں جتنی کمزور اب ہیں اتنی پچھلے 58 سالوں میں کبھی نہیں تھیں۔

پاکستان بھارت کے مقابلے میں اسلحے کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ پاکستان کے پاس صرف پانچ سے چھ دن کی جنگ کا سامان موجود ہے جبکہ بھارت کی 13 لاکھ کی فوج اپنے صنعتی ڈھانچے کے باعث کئی ہفتوں تک جنگ لڑ سکتی ہے۔ بھارتی بحری افواج با آسانی کراچی اور گوادر کا محاصرہ کر سکتی ہیں جس سے پاکستان کی تیل اور خام مال کی درآمدات بند ہو جائیں گی۔

موجودہ امن مذاکرات سے نئی دہلی اور اسلام آباد کے درمیان فوجی تناؤ میں کسی حد تک کمی واقع ہوئی ہے۔اس کی ایک وجہ پاکستان کی بڑھتی ہوئی عسکری کمزوریاں ہیں جس کے باعث وہ مشکل میں ہے اور بھارت کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے۔

بھارت کی عسکری قوت کو چین کے برابر لانے کی خواہش میں امریکہ خطے میں عدم توازن پیدا کر رہا ہے جس کے باعث جنگ کی صورت میں پاکستان کو اپنی ایٹمی صلاحیت پر زیادہ انحصار کرنا پڑے گا۔

پاکستان کے حکمران اسلحے کی اس دوڑ میں پاگل پن کا شکار ہو گئے ہیں۔اس نام نہاد امن کے عمل کے دوران پاکستان کا دفاعی بجٹ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہ 2003ء میں 180 ارب روپے، 2004ء میں 193.6 ارب روپے اور 2005ء میں تقریباً 277 ارب روپے تھا۔

اگلے پانچ سالوں میں بھارت اسلحے کی خریداری پر پچاس ارب ڈالر سے زائد خرچ کرے گا۔ یہ رقم بھارت کے محنت کشوں کے خون اور پسینے سے نچوڑی جائے گی۔ اپنے قلیل وسائل کے باوجود پاکستان اپنے دفاعی اخراجات میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ دونوں ممالک بوئنگ، لاک ہیڈ اور دوسری کمپنیوں سے ہی خریداری کریں گے جن میں اکثر امریکی کمپنیاں ہیں۔

2003ء میں، اٹھارہ ماہ کے جنگی جنون کے بعد پاکستان اور بھارت کا حکمران طبقہ ایک بار پھر دوستی اور امن کی باتیں کر رہا ہے۔تاہم شروع کی چند معمولی کارروائیوں کے بعد مسئلہ کشمیر امن کے اس عمل میں ایک رکاوٹ کے طور پر سامنے آ گیا ہے۔ برصغیر کے حکمران مذاکرات کو طول دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔لیکن وہ ان مذاکرات کو کتنا طویل کر سکتے ہیں؟ جنگ اور امن کا یہ بھیانک کھیل ایک خوفناک شکل اختیار کر گیا ہے۔اس سے نہ صرف کشمیر کے مظلوم عوام کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی ہیں بلکہ پورے برصغیر کے محنت کش محرومی اور غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ دونوں حکومتیں محنت کشوں پر مصائب ڈھا رہی ہیں تاکہ استحصال پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام جاری رہ سکے۔ان نااہل حکمرانوں نے کشمیر کی دلکش وادی کو جہنم بنا دیا ہے جس کا حسن وہاں کے مظلوم عوام کے لہو سے ماند پڑ گیا ہے۔ جہاں ہر طرف مایوسی اور غصہ

پایا جاتا ہے۔ یہ غم اس راہزنی کا ہے جوان کے راہبروں نے ان کے ساتھ کی ہے۔ یہ راہبر پاکستان، بھارت اور کشمیر کا حکمران طبقہ ہے جو ان کے مقدر کا فیصلہ کرتا ہے۔لیکن ان تمام غداریوں کے باجود لائن آف کنٹرول کے دونوں جانب کی جدوجہد میں ایک حیران کن حوصلہ اورعزم پایا جاتا ہےاوراس جدوجہد میں نوجوانوں کا کردار قابلِ ستائش ہے۔

لاغر جمہوریت

1947ء میں پاکستان اور بھارت کی بورژوازی کے قائدین جدید سرمایہ دارانہ ریاستوں کے قیام کا خواب دیکھ رہے تھے۔ کچھ دہائیوں تک وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

اگر ہم تقسیم کے بعد بھارت کی اقتصادی اور معاشی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں شروع میں ''نہرووئین سوشلزم'' کا مرحلہ نظر آتا ہے جو تین دہائیوں تک جاری رہا۔ درحقیقت یہ ’ریاستی سرمایہ دارانہ نظام‘ تھااوراس کا سوشلزم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ان نیم کینیشین پالیسیوں کو ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک نے بھی اپنی معاشی ترقی کے ابتدائی دور میں اپنایا تھا۔

نہرو بنیادی طور پر ایک مغربی آزاد خیال شخص تھا اوراس نے ان پالیسیوں پر عملدرآمد کرنے کی کوشش کی۔ 74 فیصد معیشت کو قومی تحویل میں لے لیا گیا اور سرکاری صنعتی ڈھانچہ بھارتی سرمایہ دار طبقے کوانتہائی کم قیمت پر وسائل اور خام مال مہیا کرنے لگا تاکہ وہ اپنے منافعوں میں اضافہ کرسکیں۔اندرونی منڈی کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے غیر ملکی کمپنیوں پر بھاری محصولات عائد کئے گئے اوراسی قسم کے دوسرے اقدامات بھی تاکہ بھارت کی بورژوازی ملک کو ایک جدید سرمایہ دارانہ ریاست بنا سکے۔

اس مرحلے کے اتنے طویل ہونے کی دو وجوہات ہیں:

اول یہ کہ عالمی سرمایہ داری کا تاریخ میں طویل ترین عروج 1948ء سے 1973ء کے دوران تھا۔اس عروج کے اثرات کے باعث بھارت 50 اور 60 کی دہائی میں اپنی ترقی کی رفتار کو کسی حد تک برقرار رکھ سکا۔ دوسرے، سرد جنگ کے دوران بھارت کے حکمران کامیابی کے ساتھ سوویت یونین اور مغرب کے درمیان مفادات کا کھیل کھیلتے رہے اور دونوں اطراف سے مراعات حاصل کرتے رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بھارت کی بورژوازی کے کچھ حصوں نے ان اقدامات کے باعث بہت فائدہ حاصل کیا جس کے نتیجے میں ان کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔لیکن عوام کی حالت ابتر ہوتی گئی اور نہرو وئین سوشلزم کا تجربہ بری طرح ناکام ہوا۔ بھارت کی بورژوازی تاریخ میں تاخیر سے داخل ہوئی تھی اور اسی وجہ سے وہ بھارت میں قومی جمہوری انقلاب کے بنیادی تقاضے پورے کرنے میں ناکام رہی۔ ریاست کی طرف سے ہر قسم کا تحفظ اور چھوٹ فراہم ہونے اور دنیا میں سب سے بڑی افرادی قوت مہیا ہونے کے باوجود وہ ناکام ہوئی۔ وہ مغربی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی ٹیکنالوجی اور سرمائے کا مقابلہ نہ کر سکی۔ ریاست قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی اور دیوالیہ پن کی طرف بڑھ رہی تھی۔

جب 1980ءمیں اندرا گاندھی اقتدار میں آئی تو اس نے عوامی ہمدردی کے جذبے سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے شعلہ بیان تقریریں کرنا بند کر دیں اور سرمایہ داروں سے دوستی کی۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ سرمایہ دار اس کی سیاسی پشت پناہی کرتے رہیں۔ 80 کی دہائی کی کامیابی کمزور اور عارضی تھی۔ 1986ء تک شرح ترقی بہت کم تھی۔ 1988ء اور 1991ء کے درمیانی عرصے میں صرف ایک سال شرح ترقی 7.6 فیصد تھی جس کے باعث اس دوران اوسط شرح ترقی کچھ بلند ہوئی۔ لیکن یہ ترقی زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکی اور مالیاتی اسراف کے دباؤ کے تحت بھارت

کی معیشت ایک گہری کھائی کے دہانے پر پہنچ گئی۔

اس بحران کے دباؤ کے تحت بھارتی حکمرانوں نے ایک قومی ریاست کی تشکیل کا خیال ذہن سے نکال دیا۔اس طرح 'قومی مفاد' کے معنی اور مقاصد تبدیل ہونا شروع ہوگئے۔ بھارت کی عالمی معیشت کے ساتھ جڑت، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے غلبے اور عالمی سطح پر سرمایہ داری کے بحران نے ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنی پالیسیاں تبدیل کریں، اپنے سماجی معاشی منصوبوں میں ترامیم کریں اور اپنے ریاستی سرمایہ داری کے تناظر کو ازسرِنو مرتب کریں۔

تاہم نوے کی دہائی میں کینیشئن ازم متروک ہوگیا۔ نرسمہا راؤ کی کانگرس حکومت کے دوران، اس وقت کے وزیرِ خزانہ منموہن سنگھ نے بھارت کی منڈیوں کو ریاستی تحفظ سے آزاد کردیا تاکہ عالمی سرمایہ داری کے گدھ اس پر حملہ آور ہوسکیں۔ اسی لئے اسے بھارت میں منڈی کی اصلاحات کا خالق کہا جاتا ہے۔ان اصلاحات کا مطلب آئی ایم ایف کی پالیسیوں کا بے رحمانہ اطلاق تھا۔ان پالیسیوں کے تحت ملٹی نیشنل کمپنیوں کو جو رعائتیں اور مراعات ملیں ان کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

بیرونی سرمایہ کاری کے لئے سازگار فضا بنانے کا مطلب یہ ہے کہ محنت کش طبقے پر حملے کئے جائیں اور کروڑوں غریب لوگوں کے معیارِ زندگی کو مزید گرایا جائے۔

2004ء میں سامراجی طاقتوں نے اپنے پرانے وفادار ملازم، من موہن سنگھ کو واپس لانے کی بھرپور کوشش کی تاکہ وہ ان اصلاحات کو جاری رکھ سکے۔ نیولبرل ازم کی ان بدمستیوں میں اضافہ کرنے کے لئے من موہن سنگھ نے ایک اور سفاک سرمایہ دارانہ اصلاح پسند پلانیاپان چندمبرم کو اپنا وزیرِ خزانہ مقرر کیا۔

اگر ہم بھارتی سرمایہ دارانہ نظام کے تاریخی ارتقاء اور موجودہ حالات کا دیانتداری کے ساتھ تجزیہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سرمایہ داری کو جاری رکھنے والی کینیشئین اور فرائیڈ مین ازم (ٹریکل ڈاؤن معیشت) کے دونوں طریقہ کار

بھارت میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ان منڈی کی اصلاحات کی پالیسیوں کا تسلسل ان کروڑوں انسانوں کے حالاتِ زندگی کو مزید ابتر کرے گا جنہوں نے ان پالیسیوں کو مسترد کرتے ہوئے ان کے خلاف ووٹ دیا تھا۔

بھارتی (اور دوسرے سابق نوآبادیاتی ممالک میں) سرمایہ داری کا شدید ہوتا ہوا بحران ایسے حالات پیدا کر رہا ہے جہاں معاشی ترقی معاشرتی اور سماجی ترقی میں نہیں ڈھلتی۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کے زوال میں معاشی اور سماجی ترقی کے گراف الٹ سمت میں چلنا شروع کر دیتے ہیں۔

سامراجی طاقتوں کی طرف سے ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری اور معاشی ترقی موجود تضادات کو حل کرنے کی بجائے انہیں اور زیادہ شدید کر دیتی ہے۔ سامراجی غلبے کے طوق کے زیر اثر سماجی و معاشی ترقی کی طرز پسماندگی کو ختم کرنے کی بجائے، جدت اور پسماندگی کے درمیان فرق کو بڑھا دیتی ہے۔اس سے معاشرے میں اضطراب اور عدم استحکام میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ان تاریخی فاصلوں کا خاتمہ سرمایہ دارانہ ارتقاء سے ممکن نہیں۔صرف ایک انقلابی چھلانگ ہی تاریخی ارتقاء کے ان درمیانی مرحلوں کو عبور کر سکتی ہے۔اس طرح ان معاشروں کی یہ تاریخی قدامت ان کے لئے رعایت بن جاتی ہے کیونکہ انہیں ان مرحلوں سے نہیں گزرنا پڑتا جن سے ترقی یافتہ معاشروں کو اپنے ارتقاء کے دوران گزرنا پڑا۔

بھارت میں دنیا کی 17 فیصد آبادی ہے لیکن اس کا عالمی پیداوار میں حصہ 2 فیصد ہے جبکہ عالمی تجارت میں اس کا حصہ ایک فیصد ہے۔ اصلاحات کی جارحانہ پالیسیوں کے نتیجے میں مزید لاکھوں لوگ غربت کی لکیر سے نیچے چلے گئے ہیں۔ سرکاری طور پر چار کروڑ چالیس لاکھ لوگ بے روزگار ہیں۔انفارمیشن ٹیکنالوجی کا شعبہ، جس کے بارے میں بہت

شور مچایا جاتا ہے صرف 8 لاکھ لوگوں کو روزگار دے سکا ہے۔ بھارت کی آبادی میں ہر سال دو کروڑ نفوس کا اضافہ ہوتا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ اگلے سات سالوں میں انہیں ہر سال 15 کروڑ نئے روزگار کے مواقع پیدا کرنے پڑیں گے۔ موجودہ حالات کو برقرار رکھنے کے لئے بھی بھارت کو ہر سال دس فیصد شرح ترقی کی ضرورت ہے۔ واجپائی کے پچھلے چھ سالہ دور اقتدار میں اوسط سالانہ شرح ترقی 5.7 فیصد تھی۔ اور یہ شرح ترقی بھارت کی 77 فیصد آبادی تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ ماضی کے تجربات سے یہ بات واضح ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں یہ اہداف حاصل کرنا ناممکن ہے۔(8)

گزشتہ تین سالوں میں ساڑھے چار لاکھ سرکاری نوکریوں کو ختم کیا گیا ہے۔ اسی طرح نجی شعبے میں بھی ایک لاکھ نوکریاں ختم ہوئیں۔ لہٰذا یہ بیہودہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے کہ بیرونی یا نجی سرمایہ کاری سے زیادہ نوکریاں پیدا ہوتی ہیں۔

آئینی تحفظات اور ذات اور جنس کی بنیاد پر امتیاز کی قانونی ممانعت کے باوجود بھارت میں نچلی ذات کے لوگ اور محنت کش خواتین ظلم اور تشدد کا شکار ہوئے ہیں۔غریب گھرانوں کی عورتوں کا جہیز کی وجہ سے قتل پورے برصغیر میں بڑھتا جارہا ہے۔

1984ء میں صرف ممبئی میں اسقاط حمل کے چالیس ہزار واقعات کا پتہ چل سکا۔ بھارت کے بنیادی صحت کے مراکز کی رپورٹوں کے ریکارڈ کے مطابق تامل ناڈو کے چھ اضلاع میں نومولود بچیوں کے قتل کے 3178 واقعات ہوئے۔ 1989ء کے ایک اندازے کے مطابق احمد آباد گجرات میں ہر سال نومولود بچیوں کے قتل کے دس ہزار واقعات ہوتے ہیں۔

راجھستان کے کچھ دیہی علاقوں میں ہر سال ڈیڑھ سو کے قریب

بچیوں کا قتل کیا جاتا ہے۔ان دورافتادہ دیہاتوں میں ایک ایسا گاؤں بھی ہے جہاں دس ہزار کی آبادی میں صرف پچاس جوان لڑکیاں رہتی ہیں۔ 1999ء میں ممبئی کے 84 فیصد گائنا کالوجسٹ ڈاکٹروں نے یہ اقرار کیا کہ وہ ایسے ٹیسٹ کرتے ہیں جن سے پیدا ہونے سے پہلے بچوں کی جنس کا پتہ چل سکے اور اکثر بچیوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔(9)

جنسی عدم مساوات کا سوال طبقاتی سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔عورتوں کے خلاف جنسی تعصب اس لئے برتا جاتا ہے تاکہ محنت کش خواتین کا استحصال کیا جا سکے۔ برصغیر میں مرد اور عورت محنت کش کی آمدن میں فرق بہت زیادہ ہے۔ بچے کی پیدائش کے صرف تیس فیصد کیس ایسے ہوتے ہیں جو تربیت یافتہ افراد یا دائیاں سر انجام دیتی ہیں۔اوران میں سے بھی اکثر مائیں درمیانے یا امیر طبقے کی خواتین ہوتی ہیں۔آزادی محنت کش خواتین کے حالاتِ زندگی کو بہتر نہیں بنا سکی اور وہ بدستور مشکلات کا شکار ہیں جبکہ درمیانے اور امیر طبقے کی عورتوں کی عیاشیوں کا تسلسل آزادی کے بعد بھی جاری ہے۔

ایک اور معاشی نقطہ جس کے بارے میں زیادہ بات نہیں کی جاتی وہ بجٹ کا خسارہ ہے یہ اس وقت شرح پیداوار کا دس فیصد ہے۔اس فرق کو مٹانے یا کم کرنے کے لئے سنگھ حکومت کو مٹی کے تیل، کھاد، چاول، گندم اور دوسری بنیادی ضروریات پر حکومت کی طرف سے دی گئی چھوٹ کا خاتمہ کرنا پڑے گا۔ یہ پہلے سے تباہ حال عوام کے لئے ایک بہت بڑا دھچکا ہوگا۔

سرکاری اور مغربی پراپیگنڈے کے برعکس بھارت کا زرعی شعبہ تیزی سے زوال پذیر ہو رہا ہے۔ بھارت کے ساٹھ فیصد محنت کش زرعی شعبے سے وابستہ ہیں لیکن زرعی شعبے کا قومی پیداوار میں حصہ 22 فیصد ہے۔

آندھرا پردیش کے تجربے کو دیکھ کر ایک بار پھر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ منافع

پر مبنی نظام کی ترجیحات کیا ہوتی ہیں اور یہ سماجوں کو کس طرح برباد کرتا ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ آندھرا پردیش میں سے کئی دریا گزرتے ہیں اور اس پانی کو کاشت کاری کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے زیادہ تر سرمایہ کاری محکمہ انہار کی بجائے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبے میں کی گئی۔ اسی وجہ سے وہاں کا بنیادی ڈھانچہ کمزور رہ گیا جس کی وجہ سے وہاں فصلیں برباد ہوگئیں اور لوگوں کو قحط کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی غم اور مایوسی کے نتیجے میں کئی زرعی مزدوروں نے کیڑے مار دوا پی کر اپنی زندگیوں کا خاتمہ کرلیا۔ سرکاری اور نجی بینکوں سے دیے جانے والے قرضے صرف 15 سے 20 فیصد زرعی مزدوروں اور چھوٹے کسانوں تک پہنچ پاتے ہیں۔ اس لئے انہیں زرعی قرضے لینے کے لئے روایتی بنیوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہ سود خور 36 فیصد سے لے کر 120 فیصد تک کا سود وصول کرتے ہیں۔ اور فصل تباہ ہو جائے تو یہ ان غریب و مقروض کسانوں کے لئے کسی قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ تیزی سے کی جانے والی منڈی کی اصلاحات کے باعث بھارت کے زرعی شعبے میں سرمایہ کاری میں کمی آئی ہے۔ 1980ء سے لے کر 2000ء تک حکومت کی طرف سے زرعی شعبے میں کئے جانے والے اخراجات کل اخراجات کے 44 فیصد سے کم ہو کر 23 فیصد رہ گئے ہیں جس میں سب سے زیادہ نقصان آبپاشی کے شعبے کو پہنچا ہے۔

ابھرتا ہوا طوفان

آنے والے دنوں میں ان معاشی پالیسیوں کے بھیانک نتائج برآمد ہوں گے۔ ان ’اصلاحات‘ کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات سماج میں بے پناہ اضطراب اور خلفشار کو جنم دیں گے۔ کسی بھی قسم کا استحکام پیدا نہیں ہو سکے گا۔ معاشرہ دونوں قطبین کے درمیان شدید ہچکولے کھائے گا اور اس طرح کی ہنگامہ خیز صورتحال میں ایک نئے زور و شور سے بھرپور انقلابی و ردِ انقلابی طوفان ابھریں گے۔

ہندو بنیاد پرست عوامی جنون اور پاگل پن کو بھڑکانے کی کوشش کریں گے۔ان کے کچھ لیڈر ابھی سے اس قسم کے بیان دے رہے ہیں۔ وشوا ہندو پریشد کے لیڈر پراوین ٹوگیڈیا اور اشوک سنگھال نے بی جے پی کی شکست کو ہندووتا کا انتقام قرار دیا۔

سنگھ پریوار (جو کہ بی جے پی، شیو سینا، بجرنگ دل اور راشٹریا سیوک سویان سنگ کا اتحاد ہے) اور دوسری ہندو شاونسٹ جماعتیں اس لوٹ مار میں شامل ہو رہی ہیں۔ وہ اس بے چینی اور مایوسی کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کی کوشش کریں گی۔ وہ سماج کے پسماندہ حصوں کو استعمال کرتے ہوئے رجعتی طاقتوں اور ہندووتا کی گھناؤنی قوتوں کو بڑھاوا دیں گے۔لیکن ایسے تناظر کے امکانات کافی مخدوش ہیں۔

یو پی اے کی حکومت جس کی قیادت کانگرس کر رہی ہے یقینی طور پر اپنے وعدے پورے کرنے میں ناکام رہے گی جس کے بعد عوامی مظاہروں کا ایک نیا دور شروع ہو گا۔محنت کشوں کا یہ ابھار شدت اختیار کرے گا اور تیزی سے بائیں جانب حرکت کرے گا۔اس سے کمیونسٹ پارٹیوں کے لیڈروں پر ان کی اپنی پارٹی کی نچلی پرتوں سے دباؤ بڑھے گا۔ اگر ان لیڈروں نے تحریک کو گمراہ کرنے کی کوشش کی اور اسے سرمایہ دارانہ حدود کے اندر مقید رکھا تو بھارت کی کمیونسٹ پارٹیوں کے اپنے اندر، جن کے ارکان کی تعداد تیس لاکھ سے زیادہ ہے، بہت بڑی ہلچل پیدا ہو جائے گی۔

عام محنت کش اور کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم اراکین نے ابھی سے کمیونسٹ پارٹیوں کی مصالحانہ پالیسیوں پر سوال اٹھانے شروع کر دیئے ہیں۔عوامی ابھار کے دور میں انقلابی حل کی تلاش شدت اختیار کرے گی۔ ان حالات میں مارکسزم اور انقلابی سوشلزم کی حقیقی قوتیں کمیونسٹ پارٹیوں میں وسیع بنیادوں پر عوامی حمایت حاصل کر سکتی ہیں۔اس قسم کی پیش رفت ان کمیونسٹ پارٹیوں کو دوبارہ انقلابی کمیونزم

کے راستے پر ڈال سکتی ہے۔کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا CPI اور بالشوازم کی روایات کا ٹوٹا ہوا تاریخی راستہ دوبارہ سے جڑ جائے گا۔

گزشتہ 57 برس کی تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ بے پناہ وسائل اور افرادی قوت ہونے کے باوجود موجودہ نظام عوام کا ایک مسئلہ بھی حل نہیں کر سکا بلکہ عوام کے معیارِ زندگی میں بتدریج کمی آئی ہے۔

بھارتی پرولتاریہ نے وقتاً فوقتاً سماج کو بدلنے کی اہلیت کا ثبوت دیا ہے۔ایک سوشلسٹ انقلاب کے علاوہ بھارتی عوام کے دکھوں کا مداوا کوئی نہیں کرسکتا۔ صرف سوشلزم کے ترقی پسندانہ نظام کے ذریعے ہی ذلت، غربت، بھوک، جہالت' بیروزگاری، بیماری اور استحصال کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔عوام دوبارہ متحرک ہو رہے ہیں۔اور جب دنیا کا اتنا بڑا محنت کش طبقہ متحرک ہوگا تو کوئی طاقت اسے روک نہیں سکے گی اور کوئی رکاوٹ اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکے گی۔ایک بالشویک لیننسٹ قیادت اور ایک درست مارکسی تناظر اور حکمت عملی کے ذریعے سوشلسٹ انقلاب کی فتح زیادہ دور نہیں ہوگی۔اس انقلاب سے نہ صرف محنت کشوں کے استحصال کا خاتمہ ہو گا۔بلکہ کشمیر اور دوسری مظلوم اقوام پر ریاستی جبر کا بھی خاتمہ ہوگا۔ بھارت میں ہونے والا سوشلسٹ انقلاب وہ بنیادیں فراہم کرے گا جس پر برصغیر کی رضا کارانہ سوشلسٹ فیڈریشن قائم ہوگی۔اس سے اس زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کی حتمی نجات کا رستہ ہموار ہوگا جن کی منزل ایک کمیونسٹ سماج ہے۔

اسلامی نظریاتی مملکت کی ناکامی

پاکستان ایک کھائی کے دہانے پر لڑکھڑا رہا ہے۔ بورژوازی کی ناکامی اور دہائیوں کے استحصال کے بعد فوج ایک ایسی سیاسی قوت کے طور پر ابھری ہے جس کو نہ تو وسائل کی کمی کا کوئی خدشہ ہے اور نہ ہی کسی مدمقابل کا سامنا۔ پاکستان کی فوج

پاکستان میں سب سے بڑی جاگیردار، صنعت کار اور ٹرانسپورٹر ہے اور دنیا کی سب سے بڑی افواج میں سے ایک ہے لیکن یہ جس سماج پر حکومت کر رہی وہ انتہائی غیر یقینی کیفیت میں ہے جس کو مذہبی بنیاد پرستی، گروہی عداوتوں اور علاقائی لڑائیوں نے تقسیم کر رکھا ہے۔ یہاں کی حکومت کی کوئی سمت نہیں ہے، انتظامیہ بدعنوان اور نااہل ہے۔اس معاشرے میں کسی شخص کی جان محفوظ نہیں اور نہ ہی کسی کو انصاف تک رسائی حاصل ہے۔عزت نفس ختم ہو چکی ہے اور معاشرہ مایوسی کا شکار ہے۔

جب نوخیز بورژوازی اور جاگیردار طبقہ پاکستان میں سیاسی طور پر مستحکم ریاست قائم کرنے میں ناکام ہوا تو فوجی بیوروکریسی نے براہِ راست مداخلت کرتے ہوئے ''قومی مفاد' کے ' تحفظ' کے لئے 1958ء میں مارشل لاء لگا دیا۔ ایوب آمریت نے انتہائی بھونڈی نقالی کرتے ہوئے وہی کچھ کرنے کی کوشش کی جو جنرل ڈگلس میکارتھر نے جنوبی کوریا، جاپان' تائیوان اور دوسری جگہوں پر کیا تھا۔ جنرل ایوب نے فوجی طاقت کے ذریعے ملک میں زرعی اصلاحات اور صنعتی انقلاب لانے کی کوشش کی ۔لیکن ایوب بری طرح ناکام ہوا اور اس کی پاکستان کو ایک جدید بورژوا ریاست بنانے کی کوشش کے نتیجے میں یہاں 69-1968ء کی انقلابی تحریک نے جنم لیا۔اس انقلاب نے نہ صرف اس کی ظالم حکومت کا خاتمہ کیا بلکہ یہ تحریک کو جمہوری تبدیلی کی حدود پھاڑتے ہوئے سوشلسٹ انقلاب کی طرف لے گیا اور سرمایہ داری کے خاتمے کا نقارہ بجا دیا۔لیکن ایک حقیقی انقلابی پارٹی نہ ہونے کے باعث انقلاب اصل رستے سے ہٹ گیا۔اس انقلاب کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ یہ انقلابی ابھار جو پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا تھا اس کو گمراہ کرنے کے لئے پاکستان اور ہندوستان کے حکمران طبقے کو جنگ شروع کرنی پڑی۔

1980ء کی دہائی میں پاکستان میں ٹریکل ڈاؤن معیشت متعارف کرائی گئی۔ محصولات میں کمی، پرائیویٹائیزیشن، ڈاؤن سائزنگ اور عالمی بینک اور آئی ایم

ایف کے دوسرے احکامات پر اسی دور میں عملدرآمد ہوا۔اس سے پاکستان سامراج کے شکنجے میں مزید پھنستا چلا گیا اور غلامی کا طوق زیادہ وزنی ہوگیا۔

یہ نیولبرل پالیسیاں پاکستان کے لاکھوں غریب عوام کے لئے ایک ایسی تباہی کا آغاز تھا جس کا کوئی انت نہیں۔ اگر ہم سرکاری اعداد و شمار کا جائزہ لیں جو انتہائی رجعتی ہوتے ہیں تو پتہ چلے گا کہ حالات ابتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کی رپورٹ کے مطابق جہاں تک انسانی ترقی کے معیار کا سوال ہے اس میں پاکستان بے پناہ وسائل اور افرادی قوت ہونے کے باوجود مشکلات سے دوچار ہے۔

> پاکستان میں اوسط عمر 64 سال ہے جبکہ باقی برصغیر میں یہ 67 سال ہے۔ ہر ہزار پیدا ہونے والے بچوں میں سے 76 پیدائش کے وقت مر جاتے ہیں۔ ہر سال مناسب سہولیات کے فقدان کے باعث دوران حمل یا زچگی کے وقت 165,000 عورتیں مر جاتی ہیں اور 101 بچے پانچ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ جبکہ آبادی کا 80 فیصد حصہ غربت میں رہ رہا ہے‘‘۔(10)

سٹیٹ بینک کی سالانہ رپورٹ کے مطابق 37.5 فیصد حصہ انتہائی غربت میں رہتا ہے (یعنی ایک ڈالر یومیہ سے بھی کم) جبکہ ایشیائی ترقیاتی بینک کے مطابق یہ 44 فیصد ہے۔آبادی کا 78 فیصد حصہ صحت کی غیر معیاری سہولیات اور قدیم غیر سائنسی طرز کا طریقہ علاج اپنانے پر مجبور ہے۔صحت کی سہولیات،تعلیم اور سماجی بہبود کے معیار کے حوالے سے پاکستان کا شمار آخری دس ملکوں میں ہوتا ہے جن میں سے آٹھ افریقی ممالک ہیں۔

> صحت پر ہونے والے حکومت کے اصل اخراجات سالانہ شرح پیداوار کا 0.7 فیصد ہیں جبکہ تعلیم پر 2 فیصد سے کم ہیں۔ 1996ء کے سرکاری اعداد وشمار کے مطابق بیروزگاری کی شرح 5.37 فیصد تھی جو

بڑھ کر 2005ء میں 8.27 فیصد ہوگئی ہے۔ آزاد تجزیہ نگاروں کے مطابق آبادی کا 25 فیصد سے زیادہ حصہ بے روزگار ہے۔ تعلیم کے شعبے کے زوال کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 2000-1999ء میں ایک لاکھ ستر ہزار سکول تھے جن میں پانچ سے نو سال کی عمر کے تین کروڑ تیس لاکھ بچے زیر تعلیم تھے۔ 2004ء تک سکولوں کی یہ تعداد ایک لاکھ چھپن ہزار تک پہنچ گئی اور طلباء کی تعداد ایک کروڑ 74 لاکھ تک گر گئی۔(11)

انسانی حقوق کی ایجنسی پاکستان میں خواتین کے خوفناک حالات یوں بیان کرتی ہے۔

خواتین کے حالات کسی بھی معاشرے کی صورتحال کا ایک اہم اعشاریہ ہوتے ہیں۔ سرکاری رپورٹ کے مطابق 2004ء کے دوران نام نہاد غیرت کے نام پر 'قتل' کے واقعات میں ایک ہزار خواتین کو قتل کیا گیا۔ 10 ہزار سے زائد خواتین کی آبروریزی کی گئی۔ ہیومن رائیٹس واچ کے مطابق ہر 24 گھنٹے کے دوران آبروریزی کے 8 واقعات کی رپورٹ دی جاتی ہے۔ گزشتہ سال ہر روز 4 خواتین کا قتل کیا گیا اور یہ تمام قتل 'خاندان کی عزت' کے نام پر ہوئے۔ جو خواتین خاوند کے ہاتھوں بدسلوکی کا شکار ہوئیں ان کی شرح 70 فیصد سے 90 فیصد تک ہے اور آبروریزی' جنسی تشدد اور گھریلو تشدد کا شکار ہونے والی پاکستانی خواتین کی شرح بہت ہی زیادہ ہے۔(12)

فرخ سلیم خواتین کے خلاف ہونے والے بعض بدترین پرتشدد واقعات کی وضاحت کرتا ہے:

2004ء میں ایسی خواتین کے 42 واقعات سامنے آئے جن کے چہروں پر تیزاب پھینکا گیا اوران کا حلیہ زندگی بھر کیلئے بگڑ گیا۔ 19 ایسی

خواتین کے واقعات بھی سامنے آئے جنہیں سرعام برہنہ کیا گیا اوران کی تذلیل کی گئی۔ 78 فیصد محنت کش خواتین کو اپنے کام کی جگہوں پر جنسی طور پر ہراساں کیا گیا۔ 58 فیصد نرسوں' 91 فیصد گھریلو نوکرانیوں اور 95 فیصد بھٹہ مزدوروں کو مختلف انداز میں جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔(13)

ایدھی فاؤنڈیشن (پاکستان کے ایک خیراتی ادارے) کے بقول اسے ہر سال کوڑے کے ڈھیر سے 250 نوزائیدہ لاوارث بچے ملتے ہیں ان میں سے تقریباً سب کی سب بچیاں ہوتی ہیں! ہر سال کالے اسلامی قانون جسے ''حدود آرڈیننس'' کہا جاتا ہے' کے تحت 10,000 مقدمات کا اندراج کیا جاتا ہے۔ یہ قانون زناکاروں کو سزا دیتا ہے۔ اس قانون کے تحت جن لوگوں پر مقدمہ چلایا جاتا ہے اور سزا دی جاتی ہے ان کی بھاری بھرکم اکثریت خواتین پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس قانون کے تحت دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے۔ اس لئے اگر کسی عورت کی آبروریزی کی گئی ہو تو وہ اپنے خلاف ہونے والے اس جرم کی تصدیق نہیں کرسکتی۔

یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں ہر روز تقریباً 10,000 افراد غربت کی لکیر سے نیچے چلے جاتے ہیں۔ ہزاروں لوگ بے روزگاری کی اذیت برداشت نہیں کرسکتے اور خودکشی کرلیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ خودسوزی کرنے سے قبل اپنے بچوں کو قتل کردیتے ہیں (14)

سارے ملک میں غربت کا عفریت بڑھتا جارہا ہے کیونکہ روزمرہ ضروریات اورسہولیات کی قیمتیں تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ غذائی اجناس اور دیگر بنیادی ضرورت کی چیزوں پر افراط زر کی شرح 14 فیصد ہے۔ آٹے اور مٹی کے تیل جیسی بنیادی ضرورت کی چیزوں کی قیمت میں محض گزشتہ تین سالوں میں دوگنا اضافہ ہوا ہے۔ اس سے پہلے سے غربت کے شکار عوام کے مصائب میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ شرح ترقی میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن ترقی کی یہ شرح سماجی ترقی کا باعث نہیں بن رہی ہے۔ اس کے برعکس اس ترقی کی طرز کچھ اس طرح کی ہے اور پاکستانی سرمایہ داری کا بحران اس قدر شدید ہے کہ جی ڈی پی میں اضافے کا نتیجہ غربت میں مزید اضافے اور عوام کے معیار زندگی میں مزید گراوٹ کی شکل میں برآمد ہو رہا ہے۔

> اعداد و شمار کے حوالے سے یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ تیز معاشی ترقی کے نصف سے زائد فوائد اوپر کی 20 فیصد آبادی کو پہنچ رہے ہیں۔ نیچے کی 20 فیصد آبادی کو 8 فیصد سے بھی کم حصہ مل رہا ہے۔ حتیٰ کہ پاکستان کا سنجیدہ بورژوا اخبار ''ڈان'' یہ تسلیم کرتا ہے کہ: ''غربت' افراط زر' ناانصافی اور عوامی سہولیات کی فرسودگی کے ہاتھوں عام پاکستانی تباہ و برباد ہو کر بداعتمادی کا شکار ہے اور زندگی کی مسرتوں سے بے زار ہے۔ لوگوں کو مشترکہ قومی مقاصد کے حصول کیلئے کام کرنے کی تحریک دینے کیلئے فضا ناسازگار ہے۔(15)

حتیٰ کہ سٹیٹ بینک آف پاکستان کا گورنر بھی پاکستان کو ''اشرافیہ کی معیشت'' قرار دیتا ہے۔ 22 مئی 2005ء کو لاہور میں ''پاکستانی معیشت کی مینجمنٹ'' کے موضوع پر ہونے والے تین روزہ سالانہ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے سٹیٹ بینک آف پاکستان کے گورنر ڈاکٹر عشرت حسین نے درج ذیل باتیں کیں:

> پاکستان کے جی ڈی پی میں ٹیکس کا تناسب جمود کا شکار رہا اور ٹیکس کا نیٹ ورک گیارہ لاکھ افراد تک محدود رہا جن میں سے ساڑھے چار لاکھ افراد تنخواہ دار ملازم تھے۔ بالواسطہ ٹیکسوں کی طرف مراجعت پر انحصار سے درمیانی اور تھوڑی آمدنی رکھنے والے گروپوں پر بے تحاشا بوجھ بڑھ گیا ہے۔''---- اگر آنے والے دس سالوں کیلئے معیشت تسلسل کے ساتھ 8-7 فیصد کی شرح سے بڑھتی ہے تو فزیکل انفراسٹرکچر کی قلت'

گھٹن اور ناکافی پن عیاں ہو جائے گا۔‘‘اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا کہ موجودہ مالیاتی تقسیم کے تحت سرکاری شعبے کے ترقیاتی پروگرام کے ذریعے انفراسٹرکچر کی صرف آدھی سالانہ ضرورتوں کیلئے پیسہ فراہم کیا جاسکتا ہے۔(16)

یہ بیان پاکستانی معیشت کے چند بڑے منیجروں میں سے ایک کا بالواسطہ اعتراف ہے کہ اس نظام کا مستقبل تاریک ہے۔لیکن اس تناظر کا ایک اور اہم پہلو بھی ہے جس کو یہ بورژوا معیشت دان سمجھنے سے قاصر ہیں کیونکہ ان کے پاس جدلیاتی فہم و فراست کا فقدان ہے۔وہ یہ کہ معاشی ترقی کا یہ طریقہ کار اور طرز سماجی تضادات میں انتہائی تیزی سے اضافہ کریں گے۔اس سے انقلابی دھماکے جنم لے سکتے ہیں جن سے پاکستان میں سرمایہ داری کا دھڑن تختہ ہوسکتا ہے۔اس طرح کے منظرنامے کے کشمیر اور برصغیر کے دیگر حصوں پر زبردست اثرات مرتب ہوں گے۔

روسو،جس کے افکار نے 1789 ء کے فرانسیسی انقلاب پر گہرے اثرات ڈالے،نے لکھا تھا:

‘‘آدمی آزاد پیدا ہوا ہے لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔’’(17)

بھارت اور پاکستان کشمیر کے عوام کو کچھ بھی دینے سے قاصر ہیں۔کشمیر کے عوام کو ان ملکوں کے حالات نظر آ رہے ہیں۔تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیونکر رضا کارانہ طور پر انہی حالات کا شکار ہونا چاہیں گے؟ گزشتہ چھ دہائیوں کے دوران بھارت اور پاکستان کی حکمران اشرافیہ محض ایسے معاشرے تخلیق کر پائی ہے جہاں بیماری،جہالت،بیروزگاری،جنسی تشدد،بدعنوانی،جرائم اور تشدد کی بھرمار ہے۔ان کو دیکھ کر گھن تو آ سکتی ہے لیکن وہ کسی قوم کیلئے دلکشی کا ذریعہ نہیں ہو سکتے۔

‘‘آزادی’’ کی نصف صدی کے بعد برصغیر کی حالت اس سے کہیں زیادہ بدتر

ہے جتنی کہ تقسیم کے وقت تھی۔ حکمرانوں نے کوئی مسئلہ حل نہیں کیا ہے اور وہ اپنی اس شرمناک ناکامی کا اعتراف کرنے سے بھی انکاری ہیں۔ سرمایہ دارانہ بنیادوں پر ترقی پذیر معاشروں کے عوام کے معیار زندگی میں کسی قسم کی بہتری کی کوئی توقع رکھنا ایک یوٹوپیائی خواب ہے۔ تمام اعشاریے اس کے برعکس صورتحال کی عکاسی کر رہے ہیں۔ یہ حکمران نہ تو جنگ کر سکتے ہیں اور نہ ہی امن بحال رکھ سکتے ہیں۔ جنگ اور امن کے تمام کھیل ایک فریب ہیں تاکہ وہ اپنی ناکامی کی پردہ پوشی کر سکیں اور عوام کی توجہ ان کو درپیش فوری مسائل سے ہٹا سکیں۔

سوویت یونین کے انہدام' دیوار برلن کے گرنے'' بائیں بازو'' اور مقبول عام لیڈروں کی مصالحت اور انتہائی جنگجو ٹریڈ یونین لیڈروں کی طرف سے ہتھیار ڈال دینے کی وجہ سے ان کو اپنی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے میں مدد ملی ہے۔

آخر یہ امن کس کیلئے ہے؟

نام نہاد آزادی کے 50 سال بعد بھی برصغیر کے حکمرانوں کی طرف سے سامراج کی غلامی تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ امریکی معیشت کے بحران اور 9/11 کے واقعات کے بعد امریکی سامراج کی طرف سے جارحانہ فوجی' معاشی اور سفارتی موقف اختیار کرنے کی وجہ سے ان ملکوں پر اس ڈگر پر چلنے کیلئے مزید دباؤ بڑھ گیا۔ یہی وہ معاشی پس منظر ہے جس میں'' قومی مفاد'' کی تعریف اور ترجیحات میں ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یہ تمام تر عمل ایک تماشا ہے جو نام نہاد بین الاقوامی برادری (حقیقی معنوں میں سامراجی آقاؤں) اور سادہ لوح امن پسندوں کو خوش کرنے کیلئے رچایا گیا ہے۔ مالیاتی سرمائے کا کردار بدلنے سے نام نہاد'' قومی مفاد'' کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ اس کھیل کا نام معیشت ہے۔

آج کے عہد کی سرمایہ دارانہ معیشت کے حالات میں سامراجی سرمایہ کاروں اور غریب ملکوں کے حکمرانوں کے تقاضے ایک ہی ہیں۔ وہ سرمایہ کاری (بڑھتے ہوئے استحصال) کیلئے سازگار 'ماحول' پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں ایک طرف وہ محنت کشوں کے حقوق کے خلاف ایک زبردست طبقاتی جنگ میں مصروف ہیں وہاں انہیں بڑے یونٹ درکار ہیں جہاں وہ زیادہ روک ٹوک اور اخراجات کے بغیر سرمائے اور اجناس کو حرکت دے سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے مقاصد کیلئے امن بھی درکار ہے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ روکنے کے سامراجی مقاصد میں یہ بنیادی محرک ہے۔

> یہ کوئی راز کی بات نہیں کہ بھارت اور پاکستان نے امریکہ اور دیگر جی-8 سامراجی ممالک کے زبردست سیاسی اور سفارتی دباؤ کے تحت جنوری 2004ء میں 'جامع' مذاکرات کا عمل شروع کرنے کیلئے مذاکرات کی میز کا رخ کیا۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ سابق امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے دعویٰ کیا تھا کہ 6 جنوری 2004ء کو بھارت اور پاکستان کی طرف سے جاری ہونے والا مشترکہ اعلامیہ اس نے تحریر کیا تھا۔(18)

لیکن پھر انہیں دو دشمنوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ انتخاب بڑی منڈی اور سستی محنت کے ذریعے یعنی بھارت کا ہوگا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ سامراج کی مکمل تابعداری کے باوجود کس طرح پاکستانی حکمرانوں کو بہلایا پھسلایا جا رہا ہے کہ وہ اپنے بڑے بھائی بھارت کو زیادہ سے زیادہ رعائتیں دیں۔

کلدیپ نیر کو انٹرویو دیتے ہوئے بھارت کے سابقہ 'لبرل' وزیر اعظم اندر کمار گجرال نے کہا تھا'

''(مشرف) کے پاس کون سے رستے ہیں؟ اس کے ملک کو بے شمار مسائل کا سامنا ہے۔ امریکیوں نے جو اس کے دوست ہیں' اسے بتا دیا ہے کہ وہ صورتحال کو خراب نہ کرے۔'' (19)

سچ تو یہ ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے غیر انسانی اصول کے تحت بھارت نے نہ صرف پاکستانی حکمرانوں کو دفاع کے میدان میں اپنا مطیع بنا لیا ہے بلکہ انہوں نے سفارتی عمل کے ذریعے اپنا موقف جبراً منوالیا ہے۔

18 اپریل 2005ء کو دہلی سے جاری ہونے والے ''تاریخی'' اعلامیے میں جن کامیابیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کشمیر کے مسئلہ کے ''حتمی حل'' کیلئے مذاکرات جاری رکھنے پر اتفاق کیا گیا ہے۔ یہی بات اندرا گاندھی اور ذوالفقار علی بھٹو نے 34 سال قبل شملہ معاہدہ میں کی تھی اور وہ بھی زیادہ ٹھوس انداز میں۔

اسی طرح حق خودارادیت کے مسئلے کو کشمیر کے پاکستان کے ساتھ بحیثیت مجموعی تعلق سے الگ کر دیا گیا ہے اور کشمیریوں کے آزادی کے حق اور جدوجہد کو سرحد پار سے دراندازی اور دہشت گردی کے الزامات کے سیاہ بادلوں نے دھندلا دیا ہے۔

دہلی مذاکرات میں سفارتکاروں کی سطح پر پاکستان کی جو درگت بنی اس پر ایک سینئر سفارتکار اور سابقہ خارجہ سیکریٹری شمشاد احمد اپنی پریشانی اور غصے کا اظہار کرتا ہے۔ اس نے لکھا:

> ایک بزرگ صحافی اور بھارت کا 'صدا بہار آدمی' کلدیپ نیر نئی دہلی میں ہونے والی حالیہ پاک بھارت سربراہی ملاقات کے بعد کشمیر کے مسئلے کو اس طرح دیکھتا ہے ''کشمیر اب قطعاً بنیادی مسئلہ نہیں رہا یہ بھارت اور پاکستان کے ایجنڈے پر سرفہرست نہیں ہے۔ اب یہ اعتماد سازی کیلئے کیے جانے والے متعدد اقدامات میں سے ایک ہے۔'' (20)

مسٹر شمشاد کو جو بات سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ سفارتکاری' جنگ اور سیاست میں جو چیز ترجیحات کا تعین کرتی ہے وہ منافع پر مبنی معاشی نظام کی ضرورتیں ہیں۔ منڈی کی معیشت کے اعداد و شمار کی سرد مہر دنیا میں دیانتداری' سچائی' اعتماد' اخلاقیات' اصول وغیرہ آخری تجزیے میں بے کار اجناس ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سرمایہ داری کی ضرورتیں جنگوں کو ناگزیر بنا دیتی ہیں اور جنگ کے شعلے بھڑکاتی ہیں۔ یوں عام لوگوں کی آرزوؤں اور ضرورتوں کی بنیاد پر نہ تو جنگ لڑی جائے گی اور نہ ہی امن مذاکرات ہوں گے بلکہ یہ کام بڑی بڑی اجارہ داریوں کے مفادات کی خاطر کیے جائیں گے۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ اہم باتیں پہلے۔ اسی طرح حکمران طبقے کے مفادات کو ہمیشہ ترجیح دی جاتی ہے۔ مشرف اور من موہن کی نام نہاد ''تاریخی'' سربراہی ملاقات خاص کر بڑے کاروبار کے مفادات کے پیش نظر منعقد کی گئی تھی۔ 'مشترکہ کاروباری کونسل' اور 'تجارت کے مشترکہ وزارتی کمیشن' کو دوبارہ بحال کیا گیا۔ اہل ثروت افراد کی بات پہلے مانی گئی۔

دہلی میں اپریل 2005ء میں ہونے والیمشرف من موہن سربراہی ملاقات کے حوالے سے جاوید نقوی نے اپنے کالم میں لکھا تھا:

> سیاست کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ غریبوں سے ووٹ لینے اور امیروں سے انتخابی مہم کیلئے فنڈ لینے کا شریفانہ کھیل ہے جس میں ہر فریق سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ اس کو دوسرے سے تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ پاکستان اور بھارت میں امن کا عمل بڑی حد تک اسی طرح کی سیاسی چھینا جھپٹی کا نتیجہ ہے جو ہر ملک میں شدت اختیار کر گئی ہے۔ یہاں اکثر غالب طبقات کے مفادات کو عوام کی آواز بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔
>
> صدر پرویز مشرف نے بھارتی ایڈیٹروں کے ایک وفد سے بات

چیت کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کی توجہ سیاست سے ہٹ کر کاروبار اور تجارت پر مرکوز ہوگئی ہے۔ وہ درست کہہ رہا ہے اور یہی حال وزیراعظم من موہن سنگھ کا ہے جس کا یقین ہے کہ نہ صرف جنوبی ایشیا میں بلکہ ہر جگہ تجارتی قافلوں کے سامنے سے سرحدیں ہٹا دینی چاہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان امن پروان چڑھانے کی سب سے زیادہ خواہش فیڈریشن آف انڈین چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری اور کنفیڈریشن آف انڈین انڈسٹری جیسے کاروباری اشرافیہ کے کلبوں کے ارکان میں پائی جاتی ہے۔

تاہم جب دونوں ملکوں میں نیولبرل معیشت کا دور دورہ ہے تو ان ملکوں کو واشنگٹن ڈی سی کے خون آشام سیاسی عقوبت خانوں میں بہلا پھسلا کر لے جانے کا سب سے یقینی طریقہ یہی ہے کہ امن مذاکرات میں ان لوگوں کو غلبہ حاصل ہو جن کے مفادات نیویارک سٹاک ایکسچینج کے انڈیکس سے وابستہ ہوں۔ دوسرے الفاظ میں اگر معاشی مجبوریوں کے پیش نظر بھارت اور پاکستان میں دشمنی کو ختم کرنا ضروری ہو' اور ہمیں کوئی معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں کہ معیشت ایک اہم عنصر ہے تو پھر یہ فوری بحث شروع ہو جاتی ہے کہ ہمیں امن کے خالی خولی نام سے اپنے لیے کس قسم کے معاشی راستے ہموار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتی ہے کیونکہ معیشت اور جنگ میں ایک گہرا تعلق ہے جس کی واضح مثال پال وولفووٹس کو ورلڈ بینک کا نیا صدر بنایا جانا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف طبقات کے لوگوں کیلئے امن اور استحکام کے معنی الگ الگ ہیں۔ ان کا مطلب رکشا کھینچنے والے اس شخص کیلئے کچھ اور ہے جو پہاڑی کے اوپر کی طرف سفر کی شدید گرمی برداشت کرتا ہے اور اس باوقار شخص کیلئے ان کے معنی اور ہوتے ہیں جو وہ سکے گنتا

ہوا اس بل کھاتی سڑک پر سفر کرتا ہے جو اس نے رکشے والے کو اس کی محنت کے عوض دینے ہوتے ہیں۔ بھارت اور پاکستان کے تناظر میں یہ بات درست ہوسکتی ہے کہ یہ دونوں امن کی وکالت کرتے ہیں لیکن جب وہ اپنے ان مقاصد کا اظہار کرتے ہیں تو ان کے پیچھے کارفرما محرکات بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب ہماری یہ دو حکومتیں عوام کے نام سے امن کی بات کرتی ہیں تو وہ دیگر لوگوں کے مقابلے میں آبادی کے ایک مخصوص حصے کی واضح طرفداری کر رہی ہوتی ہیں۔ سی آئی آئی یا ایف آئی سی سی آئی کے کسی رکن یعنی کسی مستند کاروباری آدمی کیلئے پاکستان کا ویزا حاصل کرنا حیران کن حد تک آسان ہوگیا ہے۔ ایک طرح کی خفیہ ضمانت موجود ہے کہ کوئی بھی حکومت ان امیر و کبیر لیڈروں کے سفر یا ایجنڈے میں رکاوٹ ڈالنے کیلئے کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔ ویسے تو ہونا بھی یہی چاہیے۔

لیکن امن کے داعی یہ لوگ نیکسلائیٹوں، نام نہاد ماؤ اسٹ گروپوں کے بارے میں کتنا علم رکھتے ہیں جن کی بھارت کے وسیع علاقوں پر اتر پردیش کے جنوب میں واقع حیدرآباد سے لے کر شمال میں واقع بہار تک اور ان کے درمیان میں اوڑیسا، مہاراشٹرا اور مدھیا پردیش کے چھوٹے چھوٹے علاقوں---- پر حاکمیت اور کنٹرول ہے؟ (21)

امن کی نازک شاخ

پاکستان اور بھارت کی حکومتوں نے معاشی اور دفاعی مفادات کے تحت نظریاتی اور سیاسی موقف میں تبدیلی کے باعث امن کا موجودہ ڈرامہ رچایا ہے۔ لیکن یہ نظریاتی اور سیاسی موقف پوری طرح تبدیل نہیں ہوا۔ ایک طرف تو اپنے اپنے ملک

میں عوامی تحریکوں کو دبانے اور ان پر جبر جاری رکھنے کے لئے 'بیرونی دشمن' کے خلاف ایک خاص حد تک نفرت، جنون اور قومی شاونزم کے جذبات ابھارنے ضروری ہوتے ہیں۔ ریاستی ڈھانچے اور جبر کو قائم رکھنے کے لئے اسے نظریاتی بنیادیں فراہم کرنا ان کی مجبوری ہوتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے تو دونوں حکومتوں نے ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے مذہبی منافرت کو بھی استعمال کیا ہے۔

دوسری طرف ریاستی کارندوں، بیوروکریٹوں، جرنیلوں اور ان کے حواریوں کے ریاست کے وجود اور عوام پر ریاست کی دہشت قائم رکھنے سے اپنے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ایسی پالیسیاں نہیں اپنا سکتے جس میں ریاست کا کردار کم ہو جائے۔ اسی لئے امن کے موجودہ دور میں ہمیں کنفیوژن اور جمود نظر آتا ہے۔ دونوں اطراف سے دوستی اور امن مذاکرات کے ساتھ ساتھ بھارت دشمن اور پاک دشمن پراپیگنڈہ بھی جاری ہے۔

دونوں کے درمیان یہ مذاکرات ہو رہے ہیں کہ مذاکرات کئے جانے چاہئیں۔ چھوٹے افسران اور سپاہی انتہائی مشکل حالات سے دوچار ہیں۔ کوئی بھی بھارتی سپاہی کشمیر جانے کی خواہش نہیں رکھتا۔ پاکستان کی مسلح افواج میں امیر اور غریب پرتوں کے مابین طبقاتی کشمکش تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ بے شک اس طبقاتی کشمکش کا اظہار مذہبی جنونیت اور قاتلانہ حملوں کی صورت میں نظر آ رہا ہے لیکن اس کی بنیادی وجہ جرنیلوں اور سپاہیوں کے درمیان امارت، مراعات اور رتبے کی بڑھتی ہوئی خلیج ہے۔

دونوں ممالک کا المیہ یہ ہے کہ نہ تو وہ آپس میں جنگ کے متحمل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی دیرپا امن ان کے مفاد میں ہے۔ ان دونوں حکومتوں کی حالت اتنی نازک ہے کہ امن کا موجودہ عمل جو اشرافیہ نے شروع کیا ہے اسے کوئی بڑا واقعہ، حادثہ یا بحران الٹ سکتا ہے۔ امن اور دوستی کے گیت پل بھر میں جنگی ترانوں میں تبدیل ہو سکتے

ہیں۔ دہشت گردی دوبارہ زور پکڑ سکتی ہے اور دونوں ملکوں کے حکمران خواہ ایسی جنگ نہ ہی کریں جس میں کروڑوں افراد لقمہ اجل بن جائیں لیکن ایک دفعہ جنگی جنون ضرور ابھار سکتے ہیں۔ ان حکومتوں کی کمزور اور دھما کہ خیز بنیادوں کو دیکھتے ہوئے اس تناظر کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

ستمبر 2002ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے جنرل پرویز مشرف نے یہ بات تسلیم کی کہ پاکستان اور بھارت دونوں کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی کو دیکھتے ہوئے اس بات میں کوئی حیرانگی نہیں ہونی چاہئے کہ جنوبی ایشیا ''دنیا کا سب سے خطرناک خطہ'' ہے، اور اس خطے کا امن کسی ایک واقعے، دہشت گردی یا دفاعی غلطی کا مرہونِ منت نہیں ہونا چاہئے''۔

اپریل 2005ء کی سربراہی ملاقات کے بارے میں ''اکانومسٹ'' لکھتا ہے:

> جنرل پرویز مشرف اور وزیراعظم من موہن سنگھ نے ایک زیادہ بہتر چیز کا دعویٰ کیا -- یہ کہ 'امن کا عمل نا قابل واپسی ہے' حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔(22)

سربراہی ملاقات کے محض 10 دن بعد کلدیپ نیر نے لکھا تھا:

> اس نقطہ نظر سے با آسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ امن کا عمل ''نا قابل واپسی'' ہے۔ لیکن من موہن سنگھ نے اتنے ہی واضح انداز میں یہ بات بھی کی تھی کہ پارلیمنٹ ہاؤس پر ہونے والے حملے کی طرح کسی بھی اہم عمارت پر ہونے والا حملہ اس عمل کو واپس کر سکتا ہے ...... یہ ہو سکتا ہے کہ مشرف بدل گیا ہو یا شاید نہ بدلا ہو لیکن پاکستانی حکومت کی اسٹیبلشمنٹ نہیں بدلی ہے۔(23)

فاقوں کا امن؟

نئی دہلی اور اسلام آباد میں سفارتکاری کا کھیل تماشا جاری ہے۔ جبکہ انت

ناگ، ہندواڑہ، بارمولا اور سوپور کے میدانوں میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ اعداد و شمار اس وقت تک ایک غیر جذباتی اور بے معنی چیز رہتے ہیں جب تک انسان ان میں براہ راست شامل نہ ہو۔ پھر بھی ایک پوری قوم ایک بہت بڑی فوجی مشینری کے ظلم اور جبر تلے کچلی جارہی ہے لیکن اس قوم کی جرات اور مزاحمت کا جذبہ روز ازل کی طرح مضبوط ہے۔ کشمیر میں ایک ظالمانہ جنگ جاری ہے۔

جن مسائل کو ''بنیادی'' مسائل کہا جاتا ہے ان کے حوالے سے دونوں طرف کی حکمران اشرافیہ ایک انچ پیش رفت کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ان کی حیثیت محض اتنی ہے کہ وہ اندازے لگاتے پھریں اور یوٹوپیائی خواب دیکھیں۔ اس سے ان کی یہ تاریخی نااہلی ثابت ہوتی ہے کہ وہ کشمیر کا مسئلہ حل نہیں کر سکتے۔

بھارتی حکمران یہ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ مسئلہ اس وقت خود بخود حل ہو جائے گا جب ایک بار پاکستان دہشت گردوں کی مدد بند کر دے گا۔ پاکستانی حکمران یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس بغاوت کا آغاز بغیر کسی بیرونی مدد کے مقامی لوگوں کی تحریک کے ذریعے ہوا تھا اور وہ اس کی ''سیاسی'' اور ''اخلاقی'' مدد کر رہے ہیں۔ نام نہاد انتخابات کے باوجود نوجوانوں کا ایک بڑا حصہ آج بھی اپنی اے کے 47 بندوقیں پھینکنے کو تیار نہیں۔ کسی بھی اہم مسئلے پر کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ دونوں طرف کی حکمران اشرافیہ قطعاً نااہل ہے اور دونوں طرف کے وفود کے پاس کوئی سیاسی سمت نہیں۔ سرینگر، مظفر آباد بس سروس کا اجراء برصغیر کے سفارتکاروں کی مہارت اور حوصلے کی بجائے برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا کے دباؤ کے نتیجے میں ہوا تھا۔ سامراجیوں کے نزدیک یہ قدم محض ایک دکھاوا تھا۔ وہ چاہتے ہیں کہ فوجی تصادم نہ ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی حد تک عداوت کو بھی بحال رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ دونوں فریقوں کو بھاری بھرکم قیمتوں پر تباہی کے ہتھیار فروخت کرنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تقسیم کرو اور حکمرانی کرو کی پالیسی کو جاری رکھنے کیلئے

دونوں ملکوں میں ایک محدود نفرت برقرار رہے۔

بھات اور پاکستان کے حکمران کشمیر کے مسئلے کو اپنے مخصوص مفادات اور جابرانہ داخلی حکمرانی کو جاری رکھنے کیلئے استعمال کرتے رہے ہیں۔اس کے علاوہ کشمیر میں ان کے سٹریٹیجک اور معاشی مفادات ہیں۔مثال کے طور پر ان کے دریاؤں کے منبے کشمیر میں ہیں۔بدقسمتی یہ ہے کہ زیادہ تر کشمیری لیڈروں' مسلح تنظیموں اور سیاسی پارٹیوں نے بھارت اور پاکستان کے حکمرانوں اور ریاستی ایجنسیوں کے دلالوں کا کردار ادا کیا ہے۔گزشتہ 58 سالوں میں بے وفائی' غداری اور دھوکہ دہی کا ایک لمبا سلسلہ نظر آتا ہے۔

برصغیر کی دو باہم برسرپیکار ریاستوں اور حکمران طبقوں کے درمیان امن کے موجودہ عمل کے حوالے سے پرامید ہونا یا کوئی توقع رکھنا نہ صرف یوٹو پیائی ہے بلکہ ایک بہت بڑا دھوکہ ہے۔ ان حکومتوں نے عوام کو جس غربت ، بدحالی، ظلم اور استحصال میں دھکیلا ہے اس کے پیش نظر خطے میں امن' دوستی اور خوشحالی تو درکنار کوئی حقیقی استحکام بھی قائم نہیں ہوسکتا۔

1914-18ء کی سامراجی جنگ میں لینن نے ''امن اور روٹی'' کا شاندار نعرہ استعمال کیا تھا۔''امن'' اور ''روٹی'' کے مسئلے کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ان کو الگ کرنا حکمران طبقات کے ہاتھوں میں کھیلنے کے مترادف ہے۔اگر عوام کی غربت اور سماجی ومعاشی بدحالی کو امن اور دوستی کے مسئلوں کے ساتھ نہ جوڑا جائے تو یہ سارا عمل بے کار ہے۔سماجی اور معاشی انصاف کے بغیر کسی قسم کا استحکام ممکن نہیں اور استحکام کے بغیر دیرپا امن نہیں ہوسکتا۔لیکن موجودہ نظام کا تضاد یہ ہے کہ یہ غربت' بدحالی اور بیماری کا خاتمہ کرنے کی بجائے ان میں اضافہ اور شدت پیدا کر رہا ہے۔اس سے سماجی اور سیاسی بے چینی پیدا ہوتی ہے جس کے نتیجے میں بغاوتیں جنم لیتی ہیں۔داخلی بغاوتوں کو کچلنے اور انہیں ماند کرنے کیلئے حکمرانوں کا ایک طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ خارجی

خطرات اور تصادم تخلیق کرتے ہیں۔ پروشیا کے عظیم فوجی ماہر کارل وان کلازوٹز نے اپنی کلاسیکی کتاب ''Vom Kriege'' (جنگ کے بارے میں) میں لکھا تھا کہ:

> ''جنگ دیگر (پرتشدد) ذرائع سے (داخلی) پالیسیوں کو جاری رکھنے کا نام ہے۔'' (24)

برطانوی سامراج سے برصغیر کی آزادی کا حصول کسی جدوجہد کا نتیجہ نہیں تھا۔ یہ مذاکرات کے ذریعے طے پائی تھی اور یہ کروڑوں لوگوں کی آزادی کی شاندار جدوجہد سے غداری تھی۔ سب سے بڑھ کر برصغیر کی تقسیم برطانوی سامراج کا ایک جرم تھا جو اس نے برصغیر کے ''ہندو'' اور 'مسلمان' لیڈروں کی ملی بھگت سے کیا تھا تاکہ سماجی انقلاب کا راستہ روکا جاسکے۔ وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ تھے کہ اگر انہوں نے اپنے پیچھے ایک متحدہ ہندوستان چھوڑا تو پھر عوام کی جدوجہد محض قومی آزادی کی دہلیز پر نہیں رکے گی بلکہ یہ آگے بڑھ کر ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے سماجی اور معاشی آزادی حاصل کرے گی۔ یہی وجہ تھی کہ سامراجیوں نے مذہبی بنیادوں پر ہندوستان کو تقسیم کر دیا۔ لیکن ایک منصوبے کے تحت سامراجی ایک منقسم کشمیر بھی اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ یہ منصوبہ اس مقصد کیلئے بنایا گیا تھا تاکہ برصغیر سے ان کے چلے جانے کے بعد یہ دشمنی دیر تک چلتی رہے۔ اور یہ چلتی رہی ہے۔

اتنے بڑے مسئلے کو حل کرنے کیلئے اور کشمیر اور باقی ماندہ برصغیر کے مظلوم عوام کے آدرشوں کی تکمیل کیلئے ایک بہت بڑے نظریے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا نظریہ جو زندگی سے زیادہ قریب ہو، وہ نظریہ جو عوام کی قسمت اور تاریخ کا دھارا بدل سکتا ہو۔ صرف ایک سوشلسٹ انقلاب کا نظریہ ہی کشمیر کی آزمائش کو ختم کرسکتا ہے۔

باب نمبر 3

صدیوں کا جبر

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ صرف خدمت شاہاں کے خوں بہا دیتے
نہ دیں کی نذر کے بیعانہ جزا دیتے
نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا

فیض احمد فیض (1)

مغل بادشاہ جہانگیر نے ہمالیائی ریاست کشمیر کو ’جنت ارضی‘ کہا تھا۔ یوں تو کشمیر برصغیر کے بے تحاشا ادب (نثر اور شاعری) کا موضوع رہا ہے لیکن اس طرح کی کمال تمثیل نگاری شاید ہی کسی نے کی ہو جس طرح ایک کشمیری براہمن اور بھارت کے پہلے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے کی۔ اپنی خودنوشت سوانح عمری میں وہ لکھتا ہے۔

ایک بے انتہا حسین وجمیل دوشیزہ کی طرح جس کا حسن نہ صرف انسانی

خوبصورتی بلکہ انسانی تصور سے بھی بالا ہو۔کشمیر کے دریاؤں' وادیوں' جھیلوں اور خوبصورت درختوں کا دلکش نسوانی حسن بھی کچھ ایسا ہی تھا۔اور پھر اس کے سحر انگیز حسن کا دوسرا پہلو ابھرتا ہے۔ یہ اس کے بلند و بالا پربت' افقی چٹانیں' برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں' گلیشیئر اور وادی کی جانب بہتے ہوئے جھرنوں کے تیز اور بے رحم دھاروں کا مردانہ حسن تھا۔اس کے سینکڑوں روپ اوران گنت پہلو تھے۔لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتے ہوئے' کبھی اداس غم میں ڈوبے ہوئے ... یہ اس محبوبہ کی مانند تھا جس کی صورت کے خدوخال صرف خواب میں نمایاں ہوتے ہیں اور آنکھ کھلتے ہی اوجھل ہو جاتے ہیں...(2)

تضادات سے بھرپور خطہ

کشمیر کی واحد بڑی صنعت کی جڑیں اس کے دستکاروں کی روایتی ہنرمندی میں پیوست تھیں جو انتہائی دیدہ زیب اور پر پیچ طرز بناوٹ پہ شالیں تیار کرتے تھے۔ زراعت کوئی زیادہ آمدنی والا شعبہ نہیں تھا لیکن یہاں بھی دستکاروں کی نسبت حکمران اور تاجر زیادہ سرمایہ کماتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ نپولین نے ایک کشمیری شال جوسفائین (Josphine) کو بھی بھیجی تھی جس نے اسے پیرس میں فیشن کے جنون کا روپ دے ڈالا اور یوں اس شال کی مانگ اس حد تک بڑھ گئی کہ جس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور اس سے تاجروں نے بے پناہ منافع حاصل کیا۔لیکن کشمیری عوام تمام تر تاریخ میں غربت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے رہے۔اس حالت زار پر تبصرہ کرتے ہوئے نہرو اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے :

کشمیر باقی ماندہ بھارت سے کہیں زیادہ پر تضاد خطہ ہے۔فطری حسن اور قدرتی نعمتوں سے مالا مال اس خطے میں چاروں اطراف غربت کی

حکمرانی ہے اور یہاں انسانوں کو بمشکل زندہ رہنے کیلئے مسلسل جدوجہد کرنا پڑتی ہے کشمیر کے مردو خواتین دیکھنے میں خوبصورت اور گفتگو میں خوش اخلاق ہیں۔وہ ذہین ہیں اور اپنے ہاتھوں کا استعمال دانشمندی سے کرتے ہیں۔ان کے پاس رہنے کیلئے ایک خوبصورت اور امیر ملک ہے پھر وہ اس خوفناک حد تک مفلس کیوں ہیں؟(3)

کشمیر کی تاریخ کا اہم ترین پہلو ظالموں کا جبر اور اس کے خلاف مظلوموں کی جدوجہد ہے۔اشوکا وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے کشمیر پر قبضہ کیا۔اس وقت کشمیر مورین سلطنت کا حصہ تھا جو بنگال سے افغانستان اور دکن سے پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی۔ اشوکا کی وفات کے بعد کشمیر جھلکا کی حکمرانی میں ایک بار پھر آزاد ہو گیا۔اشوکا کی طرح اس نے بھی بدھ مت کا مذہب اپنایا اور گوتم بدھ کے اسٹوپے (Stupas) تعمیر کروائے۔اس نے ریاست کا انتظام و انصرام چلانے کیلئے اٹھارہ محکمہ جات کا قیام عمل میں لایا۔ پہلی صدی عیسوی میں شمال مغربی چین کی طرف سے کشنوں نے وادی پر حملہ کیا جو پورے شمالی ہندوستان کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے۔کشن بادشاہ فن، علم اور فن تعمیر سے بے پناہ لگاؤ کی وجہ سے مشہور تھے۔علم و دانش کی نمو اور افزائش نوان کے عہد حکومت کی نمایاں خصوصیت تھی۔ سیاح و تاجر اپنے ساتھ صرف سامان تجارت ہی نہیں بلکہ ادب وفن کے نئے نظریات بھی لاتے تھے۔کشنوں کا عہد حکومت 178 عیسوی تک جاری رہا جس کے بعد بدھ مت زوال پذیر ہو گیا اور براہمن ازم کو ایک بار پھر عروج ملا۔

نیا مذہب جو کشمیر کے اندر سے پروان چڑھا شیوازم کے نام سے مشہور ہوا۔کشمیر ہنوں کے حملوں سے بھی نہ بچ پایا جنہوں نے چھٹی صدی عیسوی میں یورپ کے زیادہ تر علاقوں میں دہشت پھیلا رکھی تھی می ہیرا گولا کا آمرانہ دور حکومت 530 عیسوی صدی تک جاری رہا۔

کلہانا کے بقول وہ....

''انسانیت کا ایک خوفناک دشمن تھا جس کے دل میں بچوں کیلئے رحم تھا نہ عورتوں کیلئے کوئی ہمدردی وترس اور نہ ہی وہ بزرگوں کا احترام کرنا جانتا تھا''(4)

اس کے بعد قائم ہونے والی کرکوتا سلطنت کا سب سے مشہور بادشاہ للیتا دِتہ تھا۔ اس نے آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں حکمرانی کی۔کشمیر کی سرحدوں سے باہر بے شمار فتوحات جیسے کارناموں کے پہلو بہ پہلو وہ بہت زیادہ شراب بھی پیتا تھا اور اکثر شراب کے نشے میں انتہائی احمقانہ حرکات بھی کر گزرتا تھا۔ ایک بار اس نے سرینگر کو جلا ڈالنے کی فرمائش کر دی۔اس کے وزیروں نے اس کے احکامات کی تعمیل نہ کی بلکہ خشک گھاس کے کئی گٹھوں کو آگ لگا دی جس پر بادشاہ خوشیاں مناتا رہا۔ اگلے دن بادشاہ اس فرمائش پر اس وقت تک شرمندہ رہا جب تک کہ اس کے وزیروں نے اسے بتا نہیں دیا کہ انہوں نے اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی تھی۔ للیتا دتہ کا بیٹا جایا پیڈا اپنے دورحکمرانی کے آخری ایام میں انتہائی لالچی ہو گیا تھا اور بھاری ٹیکسوں کے نفاذ کے ذریعے اپنی رعایا کا شدید استحصال کرتا رہا۔تین سال تک تو وہ اپنی رعایا کی تمام تر فصل حتیٰ کہ کاشت کاروں کا ذاتی ذخیرہ بھی چھین لیتا تھا۔ 782 عیسوی میں اس کی موت کے بعد کے دور میں قتل و غارت اور لوٹ مار کی حکمرانی کا معروف طریقہ رائج رہا۔ 855 صدی عیسوی میں اتپالا سلطنت کے بانی اوانتی ورمن نے تخت پر قبضہ کیا۔اس کے بیٹے اور جانشین سم کارا ورمن کا دور حکومت اس سبب سے بدنام تھا کہ اس میں بے تحاشہ ٹیکس لگائے گئے۔اس کا وہ اقدام جس کے کشمیریوں کی بعد کی نسلوں پر بے پناہ اثرات مرتب ہوئے وہ یہ تھا کہ وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے بیگار (آمدورفت کیلئے جبری مزدوری) کو باقاعدہ نظام کی شکل دی۔سنگلاخ پہاڑوں اور سڑکوں کی قلت کے سبب ساز و سامان اور اشیاء کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے

کا واحد طریقہ یہ تھا کہ آدمی انہیں پیٹھ پر اٹھا کر لے جائے۔ ناگزیر طور پر یہ ذمہ داری دیہات کے لوگوں پر ڈالی گئی جنہیں مجبوراً اپنے گھر چھوڑنا پڑتے تھے اور اکثر اوقات کبھی نہ لوٹ کر آنے کیلئے۔

دسویں صدی عیسوی کے بعد اقتدار کی جنگ شدت اختیار کر گئی۔ نہرو نے کلہانہ کی کتاب ''بادشاہوں کا دریا''(River of kings) کے ترجمہ کے پیش لفظ میں اس صورتحال کو یوں بیان کیا ہے۔

> ہمیں بہت زیادہ محلاتی سازشیں، قتل و غارت، غداریاں، خانہ جنگیاں اور ظلم وستم دیکھنے کو ملتا ہے...... قرون وسطیٰ کے زرہ بکتر چمکدار اسلحہ سے لیس جاگیردارانہ جنگی سردار، احمقانہ جوانمردی، حقارت آمیز ظلم، موت تک نبھائی جانیوالی وفاداری اور بے تکی دھوکہ دہی نظر آتی ہے۔ ہمیں شاہی دستوں کی سازشیں، جنگ و جدل اور افواج اور اوباش شہزادیوں کے بارے میں پڑھنے کو مواد ملتا ہے۔(5)

939 صدی عیسوی میں واسا کارا کی موت کے ساتھ ہی اتپالا سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا لیکن بعد میں آنے والے حکمرانوں نے بھی اس خطے کے عوام پر وحشیانہ جبر و تشدد کو جاری و ساری رکھا۔ 1089ء میں لوہارہ سلطنت کے بادشاہ کالسا کی موت کے بعد انکارسا اس کا جانشین بنا اس نے عارضی طور پر لوہارہ (پونچھ کے قریب واقع لوہارن کی وجہ سے یہ نام رکھا گیا تھا) اور کشمیر کی سلطنت کو متحد رکھا۔

اس کی حکمرانی کے قیام کے محض 22 دنوں بعد ہی اس کے بھائی حارسا نے اس کا تختہ الٹ دیا۔ حارسا کے دور حکومت کی غلط پالیسیوں کے باعث بدحالی اور اضطراب نے جنم لیا۔

> ان حکمرانوں کا اخلاقی دیوالیہ پن اس انتہا کو پہنچ چکا تھا کہ اس کا باپ کالسا اپنے بیٹوں کی بیویوں کو زبردستی اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بناتا تھا۔ حارسا نے اس کے جواب میں انتقاماً اپنے باپ کی بیویوں اور اپنی بہنوں کے

ساتھ ناجائز تعلقات استوار کر رکھے تھے۔عوام کیلئے یہ شدید مصائب کا دور تھا۔1099ء میں ایک سیلاب کی تباہ کاریوں کے باعث فصلیں برباد ہوگئیں اور نتیجتاً قحط پڑ گیا۔ ہزاروں لوگ بھوک اور بیماری کی وجہ سے دم توڑ گئے۔ایک محلاتی بغاوت کے نتیجے میں حارسا 43 سال کی عمر میں شہزادیوں اور اپنے قانونی وارث سمیت مارا گیا۔ 1128ء میں جب جایا شیما تخت نشین ہوا اس وقت یہ خطہ انتہائی قابل رحم صورتحال سے دوچار تھا۔(6)

سیلابوں' قحط اور وبائی بیماریوں سمیت ریاستی جبر کے عذاب کا خمیازہ بھی عوام کو بھگتنا پڑا۔

ہزاروں فاقہ کشی کے ہاتھوں دم توڑ گئے یا غلام بنا کر فروخت کر دیئے گئے۔ صرف ملک پر حکمرانی کرنے والے بالا دست طبقے کے چند لوگوں کی حالت بہتر تھی جبکہ عوام کی اکثریت غربت کی اتھاہ گہرائیوں میں سسک رہی تھی۔لیکن قتل و غارت اور اقتدار کی کشمکش جاری رہی۔

اس کے بعد منگول آئے۔ 1320ء میں ذوالقدر خان جو دولا چا کے نام سے بھی مشہور تھا نے 17000 گھڑ سوار اور پیادہ سپاہیوں کی فوج کے ساتھ بارہ مولا کے درے سے تیزی سے پیش قدمی شروع کی۔کشمیر کا بادشاہ سہادیوا فرار ہوگیا اور دولا چا آٹھ ماہ تک سرینگر کو لوٹتا رہا۔پنڈت جونا راجہ لکھتا ہے:

ایسا لگتا تھا کہ کشمیر عہد تخلیق سے قبل کا کوئی خطہ ہو' یہ ایک وسیع میدان تھا جہاں لوگوں کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا اور اس میں گھاس ہی گھاس تھی۔(7)

تاہم دولا چا درہ بانہال میں اپنے انجام کو پہنچا۔جونہی اس نے سفر کا آغاز کیا تو اس کی ساری فوج ایک طوفان کی زد میں آ کر صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔

ہندوؤں کا عہد حکمرانی اب زوال پذیر ہو چکا تھا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس عہد کے آخری عرصے میں آنے والے ہندو حکمرانوں نے شمالی ہندوستان میں

مسلمانوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کا توڑ کرنے کیلئے علیحدگی کی پالیسی اپنائی۔ انہوں نے درے بند کر دیئے اور خود اونچے پہاڑوں کی حفاظتی دیواروں کے پیچھے چھپ گئے۔ کشمیر ایک محصور چھاونی بن کر رہ گیا جہاں عوام غربت کی دلدل میں دھنسے ہوئے تھے اور کم ہوتی ہوئی ریاستی آمدن نے عوام کیلئے ٹیکسوں اور بدحالی کی ایک نئی لہر کو جنم دیا۔

مسلمان صوفی و مبلغ بلبل شاہ کی تبلیغ سے قائل ہو کر لداخ سے تعلق رکھنے والے بدھ حکمران رینچن نے اسلام قبول کر کے اپنا نیا نام صدرالدین رکھا اور یوں وہ کشمیر کا پہلا مسلمان حکمران کہلایا۔ اقتدار کی کشمکش کے ایک مختصر دورانیے کے بعد شاہ میر جس نے رینچن کو اقتدار حاصل کرنے میں مدد فراہم کی تھی، کشمیر کا نیا حکمران بن گیا۔ اس نے اپنے آپ کو سلطان قرار دیتے ہوئے اپنا نام شمس الدین رکھا۔ اس کے بعد شہاب الدین 1354ء میں سلطان بن کر تخت نشین ہوا اور لکشمی نامی ایک ہندو عورت سے شادی کی۔ اس کے بعد قطب الدین برسر اقتدار آیا اور اس کی وفات کے بعد 1389ء میں اس کے بیٹے سکندر نے عنان حکومت سنبھالی۔ ان بادشاہوں کے دور حکومت میں تمام انتظامی عہدوں پر ہندو فائز رہے اور سنسکرت درباری زبان تھی۔ مختلف قسم کے تاوان ادا کرنے اور جنگی اخراجات پورے کرنے کی خاطر سکندر نے بھاری ٹیکس عائد کیے اور ہندوؤں کے مندروں کی لوٹ مار شروع کر دی۔ اس کے دور حکومت میں ہندوؤں پر ڈھائے جانے والے مظالم اور ایذا رسانی کو روائتی طور پر کشمیر سے پنڈتوں کی پہلی ہجرت کا سبب قرار دیا جاتا ہے جب کشمیر سے گیارہ پنڈت خاندانوں نے ہجرت کی۔ تاہم کشمیری مسلمان اس کی ان پالیسیوں کی حمایت میں نہیں تھے اور وہ اس کے احکامات کے برخلاف ہندوؤں کو پناہ دیتے تھے۔ سکندر کا چھوٹا بیٹا سلطان زین العابدین جو بڈشاہ کے نام سے مشہور تھا 1420ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے دربار میں شاعروں اور موسیقاروں کی بھرمار تھی۔

اس نے فارسی کو نئی سرکاری زبان کی حیثیت سے متعارف کروایا' بافت سازی اور کاغذ سازی جیسے فنون بھی اسی نے متعارف کروائے۔

درحقیقت زین العابدین جو ایک متاثرکن شخصیت کا مالک حکمران تھا' نے ہندوؤں کو جبر کے ذریعے مسلمان بنانے کے سلسلے کا خاتمہ کرتے ہوئے یہ فرمان جاری کیا کہ جن لوگوں کو جبر کے ذریعے ان کے عقیدے بدلنے پر مجبور کیا گیا ہے انہیں مکمل آزادی ہے کہ وہ دوبارہ اپنے عقائد اپنالیں۔ حتیٰ کہ اس نے ہندوؤں کو امدادی رقوم فراہم کیں تاکہ وہ اپنے ان مندروں کو ازسرنو تعمیر کرسکیں جنہیں اس کے باپ نے مسمار کر دیا تھا۔ گو مختلف نسلی اور مذہبی گروہوں کو باہمی شادیوں کی اب بھی اجازت نہیں تھی پھر بھی وہ انتہائی پرامن اور دوستانہ ماحول میں مل جل کر رہنے لگے۔ زین العابدین نے ایران اور وسطی ایشیا کے کئی دورے اس غرض سے کیے تاکہ وہ اپنی رعایا کو کتابوں کی جلد سازی اور لکڑی کی کندہ کاری کے فن کے علاوہ شال اور قالین سازی کے فنون سے آشنائی دلا سکے۔ اور یوں اس نے شالیں بنانے کے اس فن کی بنیاد رکھی جو کشمیر کی شہرت کا سبب بنا۔ لیکن 1470ء میں اس کی وفات کے بعد ایک بار پھر اس کے بیٹوں کے درمیان تخت نشینی کیلئے لڑائیوں کا آغاز ہوگیا۔

1540ء میں بابر کے بیٹے ہمایوں کے عہد اقتدار میں مرزا حیدر تغلق آخرکار کشمیر کو فتح کرنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن ایک کٹر سنی ہونے کی وجہ سے اس نے شیعوں پر جو مظالم ڈھائے وہی اس کے زوال کا سبب بنے اور 1555ء میں غازی چک کشمیر کا بادشاہ بنا۔ چک ایک بار پھر پونچھ' لداخ' کشتواڑ سمیت وادی سے باہر کے بعض علاقوں کو بھی اپنے زیرتسلط لے آئے۔ زین العابدین کی وفات کے بعد یہ سلطنت زوال کا شکار ہوگئی۔ اس کی جانشینی کیلئے لڑائیوں' نااہل حکمرانوں اور اشرافیہ کے اندر سازشوں کے بے انت سلسلے نے ایک نئی بیرونی جارحیت کی راہ ہموار کردی۔

دوسری جانب مقامی سطح پر سرپرستی سے محرومی کے سبب کشمیری شاعر' مصور اور

کاتبین نے روزگار کی تلاش میں وادی کو خیر آباد کہتے ہوئے دہلی اور لاہور کے مغلیہ درباروں کا رخت سفر باندھا اور یوں وہ اپنے ملک کی ثقافتی زندگی بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ کشمیری ثقافت کا مٹ جانا خاص کر اس حقیقت کے باعث مشکل ہو گیا کہ کشمیر کی تاراجی کے ساتھ ہی کشمیری دربار میں نئے گل کھل اٹھے۔ سلطان یوسف شاہ کی بیوی ذونی تسندھار گاؤں کے ایک کسان کی بیٹی تھی جسے صوفی درویش نے اس کی سحر انگیز آواز کے باعث اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس کی زیر نگرانی اس نے فارسی سیکھی اور خود گیت لکھنے شروع کر دیے۔ ایک روز یوسف شاہ اپنے مصاحبین کے ہمراہ کھیتوں سے گزرتے ہوئے اس کی سریلی آواز سنتے ہی اس کی سحر انگیزی پر مر مٹا وہ اسے دربار میں لے گیا اور اپنے ساتھ شادی پر آمادہ کر لیا۔ یوں زونی بحیثیت ملکہ دربار میں داخل ہوئی اور اسے حبہ خاتون (وہ عورت جس سے محبت کی جائے) کا نام دیا گیا۔

حبہ خاتون نے کشمیری زبان کو ادبی شکل دی اور ہندی اور فارسی طرز موسیقی کے سنگم سے تخلیق ہونے والی موسیقی کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے خواتین کو اپنی خواہشوں کے مطابق بننے سنورنے کی آزادی دی اور چہرے اور ہاتھوں پر مخصوص رنگوں اور سفوف کے ساتھ انمٹ نقوش بنانے کی قدیم سرکیشیائی روائیت کو از سر نو زندہ کیا۔ ملاں غضبناک حد تک برہم تھے جو اس کے کام کو شیطانی کام سمجھ رہے تھے جسے خدا کے گستاخ اور اوباش صوفیوں کی حمایت حاصل تھی۔ تاہم جب تک یوسف شاہ تخت نشین تھا حبہ خاتون کو چھونے کا تصور بھی محال تھا۔ وہ ملاؤں کی منافقت کا تمسخر اڑاتی تھی، اسلام میں صوفی ازم کی طرز فکر کا دفاع کرتی تھی اور خود کو ایسے پھول سے تشبیہہ دیتی تھی جو انتہائی زرخیز زمین میں کھل کر اپنی خوشبوئیں بکھیر رہا تھا اور جسے اکھاڑنا ناممکن ہو۔ 1583ء میں مغل شہنشاہ اکبر نے اپنے پسندیدہ جرنیل کو کشمیر کی سلطنت پر قبضہ کرنے کیلئے بھیجا۔ بغیر کسی لڑائی کے یوسف شاہ اپنی سواری پر مغلوں کے کیمپ

میں گیا اور مزاحمت کیے بغیر ہتھیار ڈال دیئے۔ اس نے محض یہ مطالبہ کیا کہ اسے تخت نشین رہنے دیا جائے اور اپنی تصویر والے سکے بنانے کی اجازت دی جائے۔

لیکن اسے گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ کشمیری اشرافیہ کے افراد یوسف شاہ کی غداری پر سخت برہم ہوئے اور انہوں نے اسی کے بیٹے یعقوب شاہ کو مسند اقتدار پر بٹھا دیا۔ تاہم وہ ایک کمزور اور غیر معتدل نوجوان تھا جس نے شیعہ اور سنی ملاؤں کو ایک دوسرے کے گلے کاٹنے پر لگا دیا اور بالآخر اکبر نے یہ مہم سر کرنے کیلئے بہت بڑی فوج بھیجی جس نے 1588ء کے موسم گرما میں کشمیر پر قبضہ کرلیا۔ اسی سال موسم سرما میں شہنشاہ خود وادی کے شہرت یافتہ رنگ و روپ دیکھنے کیلئے کشمیر آیا۔ جب اکبر نے حبہ خاتون کے شوہر کو جلاوطن کیا تو اس کی حیثیت اور رتبہ ڈرامائی انداز میں تبدیل ہو گیا۔ دسویں صدی کی دو طاقتور ملکاؤں سوغندہ اور دیدہ جنہوں نے قائم مقام کی حیثیت سے امور سلطنت سنبھالے تھے' کے برعکس حبہ خاتون کو محل سے بے دخل کر دیا گیا۔ پہلے پہل تو اس نے صوفیاؤں کے ہاں پناہ لی لیکن کچھ عرصے بعد وہ گاؤں گاؤں گھوم کر جبر و تسلط کا شکار قوم کے درد اور تکلیفوں کا اظہار اپنے گیتوں کی زبان میں کرنے لگی۔ اس بات کے کوئی تاریخی شواہد نہیں ملتے کہ اس کی موت کب اور کہاں واقع ہوئی۔ پچھلی صدی کے وسط میں ایک قبر دریافت ہوئی جس کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے کہ یہ اسی کی قبر ہے اور آج بھی عورتیں تحریک آزادی میں شہید ہونے والے نوجوانوں کا ماتم کرتے ہوئے اسی کے گیت گاتی ہیں۔

مغلوں کی آمد

مغلوں کے وادی پر قبضے کو کشمیر کی جدید تاریخ کا نقطہ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔ تقریباً دو صدیوں تک کشمیر ایک ایسی سلطنت کا انتہائی شمالی حصہ رہا جس کی طاقت کی بنیاد دہلی میں تھی۔ اکبر بادشاہ قرار پایا اور اس کے نام سے خطبہ پڑھایا جاتا تھا اور

اس کے نام کے سکے بنائے جاتے تھے ۔اس کے باوجود کہ اکبر کو لبرل اور سیکولر خوبیوں کا مالک کہا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس نے انتہائی غربت اور محرومی کے شکار لوگوں کو اپنا مطیع بنا رکھا تھا۔ بحیثیت شہنشاہ اکبر نے کشمیر میں تین بار قیام کیا۔

جب 1597ء میں اس نے اپنا آخری دورہ کیا تو اس کے ساتھ پرتگال کا ایک رومن کیتھولک عیسائی جیروم زیویئر بھی تھا جس نے شدید قحط سالی کا شکار وادی پر ایک تحریر لکھی اور وضاحت کی کہ کس طرح لوگ محض خوراک حاصل کرنے کی خاطر اپنے بچوں کا سودا کر رہے تھے۔ اکبر کا بیٹا اور جانشین جہانگیر کشمیر کے ساتھ اپنی افسانوی محبت کی وجہ سے مشہور ہے۔وہ 1605ء میں تخت نشین ہوا اور اس نے کشمیر میں 700 سے زائد باغات تعمیر کروائے۔اس کے بعد اس کا بیٹا شاہجہاں 1627ء میں تخت نشین ہوا۔ اسے بھی کشمیر سے بے پناہ محبت تھی اور خصوصاً موسم گرما میں ہندوستان کے گرم میدانوں سے دور یہ وادی مغل اشرافیہ کی ایک مشہور پناہ گاہ بن گئی۔ کشمیر میں مغلوں کی تمام تر سرمایہ کاری کا مقصد مغل اشرافیہ کیلئے عیش وعشرت کا سامان بہم پہنچانا تھا۔

مثال کے طور پر جب اکبر نے کشمیر کا پہلا دورہ کیا تو اس سے پہلے 3000 سنگ تراش' پہاڑی کانکن' پتھر توڑنے والے اور 2000 کھدائی کرنے والے افراد بھیجے گئے تھے جن کا کام اس سڑک کو ہموار بنانا تھا جس پر سے بادشاہ کے قافلے نے گزرنا تھا۔مغلوں کے عہد میں کشمیریوں پر گورنروں کی مطلق العنانی میں بے تحاشا ٹیکسوں کے نفاذ کی صورت میں جو طرز حکمرانی مسلط تھا وہ کشمیریوں کیلئے قطعی طور پر اجنبی نہیں تھا۔اگرچہ مغلوں کے عہد حکومت میں نسبتاً استحکام رہا لیکن محنت کشوں کے استحصال اور مصائب میں کوئی کمی نہیں آئی ۔اورنگزیب کا دور حکومت اس کے عہد میں ہندوؤں اور شیعوں پر ڈھائے جانے والے مظالم سے آج بھی داغدار ہے۔اورنگزیب کے جانشین کے عہد میں انتظامیہ کی زوال پذیری کے سبب بدانتظامی پھیلنا شروع ہوگئی۔

بغاوتیں، قتل عام لوٹ مار، گرفتاریاں اور پھانسیاں روزمرہ کا معمول بن گیا۔

1720ء میں بڑے پیمانے پر ہندو۔شیعہ۔سنی فسادات پھوٹ پڑے۔
1723ء کی شدید قحط سالی میں چاول کی قیمتیں سونے کے برابر ہو گئیں۔1746ء میں ایک تباہ کن سیلاب آیا جس کے بعد قحط سالی پھیل گئی جن کے نتیجے میں یہ مانا جاتا ہے کہ تین چوتھائی لوگ موت کی آغوش میں چلے گئے 1738ء میں جب نادرشاہ نے مغل اقتدار کے مرکز دہلی پر حملہ کیا تو اس سے کشمیر پر مغل بادشاہوں کی گرفت کمزور پڑ گئی یوں کشمیر کو مزید حملہ آور غارت گروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا (8)

افغانوں کی جارحیت

1753ء میں ایک افغان جنرل عبداللہ خان اسحٰق اکاسی نے 1500 سپاہیوں پر مشتمل فوج کے ساتھ شوپیاں کی لڑائی میں اپنے مخالف عبدالقاسم خان کی فوج کو شکست دی۔ جب احمد شاہ درانی نے وادی پر قبضہ کر کے اسے افغان سلطنت کا حصہ بنایا تو یہ صورتحال کشمیریوں کے لئے ایسی ہی تھی جیسے انھیں تپتے آہن سے دہکتے الاؤ میں پھینک دیا گیا ہو۔

باوجود اس کے کہ ان کا مذہب مشترک تھا لیکن قبائلی، ثقافتی اور لسانی تفریق کا مطلب یہ تھا کہ ان پر معمول کے آمرانہ تسلط کی طرز حکمرانی ایک بار پھر رائج ہوگئی۔

جبر مقامی لوگوں سے روپے پیسے کی کھلی لوٹ مار کی صورت اختیار کر گیا جس کی مخالفت یا نافرمانی کا نتیجہ وحشیانہ تشدد کی صورت میں برآمد ہوتا تھا۔ کشمیری عوام (مرد و خواتین دونوں) خوف کے سائے تلے رہ رہے تھے۔ بے شمار لوگوں کو گرفتار کر کے غلام بنا کر افغانستان بھیجا گیا۔ اس سے قبل وادی کے عوام نے کبھی بھی ایسی وحشیانہ انتظامیہ نہیں دیکھی تھی۔ احمد شاہ درانی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے حاجی کریم داد کو گورنر مقرر کر کے وادی کے خودساختہ آزاد

حکمران جوان شیر کو سزا دینے کیلئے فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ جوان شیر کو بھی کشمیری سنیوں کی مخالفت کے باعث شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ کریم داد بھی اتنا ہی سفاک تھا جتنا کہ اس کے پیش رو تھے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں سے پیسے بٹورنے کی خاطر اس نے شال بافوں پر ہر شال کی قیمت پر ایک آنہ فی روپیہ کے حساب سے ٹیکس عائد کیا۔

افغانوں کا غلبہ 50 سال سے کچھ زائد عرصے تک قائم رہا۔ جغرافیائی ربط اور مشترکہ مذہب کے باوجود افغانیوں کے جابرانہ اور استحصالی طرز حکومت نے کشمیریوں کو بدحالی سے دوچار کر دیا۔

جن افغانیوں نے کشمیر پر حکومت کی ان کا مقصد کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کرنا ہوتا تھا چونکہ انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کتنے دنوں بعد انہیں واپس کابل بلا لیا جائے گا اور ان کی جگہ کسی نئے من پسند ضرورت مند کو بھیج دیا جائے گا۔

> جارج فوسٹر کے تخمینے کے مطابق مغلوں کے دور حکومت میں کام کرنے والی 40 ہزار شال لوموں کے مقابلے میں 1783ء میں 16 ہزار لومیں رہ گئیں تھیں۔ (9)

رنجیت سنگھ نے اپنا عروج زوال پذیر افغان سلطنت کی قیمت پر حاصل کیا۔ 1799ء میں جب زمان شاہ افغانستان کا بادشاہ تھا تو رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور زمان شاہ نے اسے راجہ کا خطاب دیا۔ 1802ء میں رنجیت سنگھ نے امرتسر فتح کیا۔

سکھوں کو دعوت

چھ سال تک قحط کا شکار رہنے کے بعد کشمیر کا خزانہ خالی ہو گیا۔ افغان حکمران عظیم

خان کا خیال تھا کہ اس کے ایک عہدیدار ریونیو کلکٹر پنڈت بیربل دھر نے کوئی گھپلا کیا ہے۔ عظیم خان نے اس کو گرفتار کروا کر اکاؤنٹس کا آڈٹ کروایا۔ جب بیربل دھر کو ضمانت پر رہا کیا گیا تو وہ دو مسلمان جاگیرداروں ملک کامدار اور ملک نامدار کی مدد سے وادی سے فرار ہو گیا۔ بیربل جموں چلا گیا جہاں اس کی ملاقات رنجیت سنگھ کے پسندیدہ خدمت گار گلاب سنگھ سے ہوئی۔ اب کی بار بیربل دھر نے رنجیت سنگھ کیلئے افغانوں کے خلاف حمایت کا پیغام بھیجا۔ اس دفعہ رنجیت مدد دینے کے ضمن میں زیادہ محتاط تھا اور اس نے پنڈت بیربل کے بیٹے راجہ کک کو اپنا مشن مکمل ہونے تک یرغمال بنائے رکھا۔ رنجیت سنگھ نے بھمبر سے لے کر شوپیاں تک مقامی حکمرانوں سے بھی مدد طلب کی تاکہ اس کی فوج کو ایک محفوظ رستہ میسر آ سکے۔ 26 فروری 1819ء کو لاہور سے رنجیت سنگھ کے ولی عہد کھڑک سنگھ کی زیر کمان ایک ہراول دستہ روانہ ہوا۔ خود رنجیت دو ماہ کے بعد روانہ ہوا اور اس نے وزیر آباد میں پڑاؤ ڈالا۔

سکھ فوجوں کی آمد کی خبر سن کر عظیم خان کا چھوٹا بھائی جبار خان، جو کشمیر کا انچارج تھا' اپنی فوجیں سری نگر سے لے کر شوپیاں سے تقریباً 5 میل دور ہری پور کے مقام پر آ گیا۔ 3 جولائی 1819ء کو دونوں فوجوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔

اپنی فوجی زندگی کی ابتداء سے ہی رنجیت سنگھ ایسٹ انڈیا کمپنی کی آرٹلری کی کامیابیوں سے بہت کچھ سیکھ چکا تھا۔ اس کی سکھ توپوں نے گھڑ سوار افغانوں پر برتری حاصل کر لی۔ جبار خان زخمی ہو کر پسپائی اختیار کر گیا اور واپس سری نگر چلا گیا۔ افغان اور کشمیری افراتفری کا شکار ہو گئے اور کشمیر سکھوں کے قبضے میں آ گیا۔

> سکھوں اور رنجیت سنگھ جیسے حکمران سے مدد طلب کر کے جو پہلے ہی کشمیر کے خلاف دو مہمات کی قیادت کر چکا تھا اور جو کشمیریوں پر مظالم ڈھانے والے افغانوں کا ایک حد تک حلیف تھا ایک بار پھر کشمیر کے بالادست طبقات غیر ملکی حکمرانوں کو کشمیر میں مداخلت کرنے کی دعوت

دینے کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔(10)

کشمیر کی ساری تاریخ گواہ ہے کہ کشمیری اشرافیہ کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے۔پنڈت پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے:

> آقاؤں کی تبدیلی محض ایک بے معنی تبدیلی ثابت ہوئی۔سکھ افغانوں کے مقابلے میں کچھ کم ظالم' غارت گر' تنگ نظر اور جنونی نہ تھے۔ کشمیر پر سکھوں کی ظالمانہ حکومت 28 سال تک جاری رہی۔اگر افغان مسلم اشرافیہ کے ساتھ کم ظلم روا رکھتے تھے تو سکھ گورنر ہندو جاگیرداروں کے ساتھ ذرا نرمی برتتے تھے۔تاہم تمام گروہوں کی غریب پرتیں یکساں مصائب کا شکار تھیں۔(11)

ایک کے بعد دوسرے سکھ گورنر نے ظلم وتشدد' استحصال اور سنگدلی کا بہیمانہ رقص جاری رکھا۔سکھوں کے عہد حکومت میں یورپ کے جن چند لوگوں نے کشمیر کا دورہ کیا تھا ان میں سے ایک ڈاکٹر ولیئم مورکرافٹ تھا جس نے 1823ء میں کشمیر کا دورہ کیا۔اس نے اپنے دس روزہ دورے کے دوران کچھ اس طرح کے مشاہدات کیے:

> ہر جگہ لوگوں کی حالت انتہائی دگرگوں تھی' سکھ حکومت کی طرف سے ان پر بے تحاشا ٹیکس لگائے گئے تھے اور اس کے افسر ہر طرح سے ان کا استحصال کرتے تھے اور ان پر جبر کرتے تھے۔اس نظام کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی آبادی رفتہ رفتہ کم ہونا شروع ہوگئی ہے۔قابل کاشت زمین کا محض 1/6 حصہ زیر کاشت تھا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھوک کے مارے لوگ بڑی تعداد میں بھارت چلے گئے۔ ایک وقت میں کم ازکم 6800 مریضوں کی فہرست موجود تھی۔ان کی اکثریت انتہائی حقارت آمیز بیماریوں کا شکار تھی۔ان بیماریوں کے اسباب ناکافی اور نامکمل غذا' نم آلود اور غیر ہوادار رہائشی مکانات' انتہائی گندگی اور انتہا درجے کی بے راہ روی تھی۔تجارت کے ہر شعبے پر ٹیکس نافذ تھا: قصاب' نانبائی' کشتی

ران، ایندھن فروخت کرنے والے، نوٹری پبلک، بھنگی، طوائفیں اور شال باف-- یہ تمام لوگ ایک طرح کا کارپوریشن ٹیکس ادا کرتے ہیں۔(12)

مورکرافٹ گورنر ہری سنگھ نرلا سے یہ سن کر حیران ہو گیا کہ اس نے مہاراجہ کیلئے صوبے کی طرف سے کرایہ داری کی مد میں رقم اکٹھی کرنے کے علاوہ خود بھی 25 لاکھ روپے جمع کئے تھے۔

بھلے دنوں میں کشمیر سکھ سلطنت کو سب سے زیادہ آمدن دینے والا صوبہ تھا۔ مور کرافٹ نے اس بات کا بھی مشاہدہ کیا کہ:

''کشمیریوں کے ساتھ جانوروں سے ذرا بہتر سلوک روا رکھا جاتا تھا۔''(13)

وائن نے سکھ حکمرانی کے جبر و استبداد کی مزید وضاحت کی ہے:

1830ء کی دہائی کے اواخر میں وادی اور قریبی علاقے اس طرح کی خوفناک صورتحال سے دوچار تھے کہ معمولی سی بہتری بھی بہت تاخیر سے ہوتی تھی۔ 'سکھوں کے جبر و استبداد کے سبب سالانہ ریونیو محض چند ہزار روپوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا، حتیٰ کہ خود کشمیری اپنی غربت کا مذاق اڑاتے تھے: 'کشتواڑ ابربادی کی وجہ ہے جہاں لوگ دن کے وقت بھوکے ہوتے ہیں اور رات کے وقت ٹھٹھرتے رہتے ہیں۔ جو کوئی بھی وہاں جا کر واپس لوٹتا ہے تو وہ اس بانس کی طرح باریک اور پتلا ہوتا ہے جس کے ساتھ فقیر کے آستانہ پر جھنڈا لہرایا جاتا ہے۔(14)

کشمیر کی جدید تاریخ کے انتہائی ہنگامہ خیز دور کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب کشمیر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وسیع ہوتی ہوئی سلطنت کا حصہ بنا اور میکاولی کے چیلے ڈوگرا گلاب سنگھ کو عروج نصیب ہوا۔ اس نے 1809ء میں 3 روپے ماہوار تنخواہ کے عوض رنجیت سنگھ کی سکھ فوج میں رسالے دار سپاہی کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی

تھی۔ 1819ء میں ملتان کے محاصرے کے دوران اس نے جس شجاعت کا مظاہرہ کیا اس کے عوض اسے انعام ملا۔ اگلے سال رنجیت سنگھ نے اسے جموں جاگیر کا مالک بنا دیا۔ 27 جون 1839ء کو رنجیت سنگھ مر گیا۔ گلاب سنگھ نے انگریزوں کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کر دیا۔ انگریز پہلے ہی سکھ سلطنت جیسی قابل رشک سلطنت کے درباروں میں کسی ایجنٹ کے متلاشی تھے اور ان کی شدید خواہش تھی کہ اس سلطنت کو فتح کیا جائے۔

انگریز اور ڈوگرے: کشمیری منڈی کی جنس بن گئے

10 فروری 1846ء کو دریائے ستلج کے کنارے پر واقع ایک چھوٹے سے گاؤں سوبارون میں پہلی سکھ۔ انگریز جنگ کی ایک لڑائی ہوئی۔ انگریزوں نے اس لڑائی کو ''بھارت کا واٹرلو'' قرار دیا تھا۔ گلاب سنگھ نے سکھوں سے غداری کی اور اس کی دھوکہ دہی اور غداری کے سبب وہ زبردست مقابلے کے بعد جنگ ہار گئے۔ برطانیہ 75 لاکھ روپے کی علامتی رقم کے عوض نے جموں اور کشمیر گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا۔

انگریزوں کیلئے یہ بات کہیں زیادہ موزوں تھی کہ وہ جموں وکشمیر کو براہ راست اپنے کنٹرول میں لینے کی بجائے گلاب سنگھ کو اس علاقے کا خودمختار مہاراجہ بننے کی اجازت دے دیں کیونکہ یہ علاقہ 25 سال تک براہ راست اس کی عملداری میں رہا تھا۔ لارڈ ہارڈنگ کی یہ تجویز دوہری دلکشی کی حامل تھی کیونکہ مہاراجہ گلاب سنگھ اس کیلئے پیسے ادا کرنے پر بھی تیار تھا۔

لارڈ ہارڈنگ معاہدہ امرتسر کا بڑا منصوبہ ساز تھا اور اسی نے کشمیر گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے اس کردار کی وجہ سے کچھ برطانوی افسروں نے اس پر کڑی تنقید کی۔ گاف کی جگہ کمانڈر انچیف کا عہدہ سنبھالنے والے

سر چارلس نپیئر نے اس فیصلے پر تیز و تند تنقید کی تھی:

کتنے اعلیٰ شخص کو بادشاہ بنایا گیا ہے! ایک ایسا شخص جو ذلت اور غداری کی غلیظ ترین گہرائیوں سے اٹھ کر اعلیٰ نسل کا شخص بن گیا ہے' اس نے اپنا غلاظت سے بھرا ہوا سر اوپر اٹھایا اور برطانیہ نے اس پر تاج سجا دیا؟ وہ ایک قابل نفرت اور حقارت آمیز ولن ہے جو کشمیری عوام کے گلے کاٹتا رہا ہے۔(15)

گاف کے ایڈ-ڈی-کیمپ ہربرٹ ایڈورڈز نے گلاب سنگھ کے بارے میں یہ کہا تھا:

''وہ ایک گدھ کی طرح مکار ہے۔ وہ دور کھلے آسمان میں انتہائی ہوشیاری سے شیر اور چیتے کی لڑائی دیکھتا رہا، جو ایک ہرن پر آپس میں لڑ رہے تھے۔ جب دونوں لڑتے لڑتے مر گئے تو اس نے اپنے پر پھیلائے، بڑے تحمل سے اڑتا ہوا نیچے آیا اور ہرن کے گوشت پر عیاشی کرنے لگا۔'' (16)

برطانوی گورنر جنرل لارڈ ہنری ہارڈنگ نے خود یہ اعتراف کیا تھا کہ گلاب سنگھ:

''ایشیا کا سب سے بڑا بدمعاش تھا!''(17)

اس ذلت آمیز فروخت کے گھاؤ کا درد آج تک کشمیریوں کے احساسات میں سلگتا ہے:

ایک کشمیری وکیل نے ایک اور انداز میں اس سودا بازی کا اظہار کیا تھا' ''ہم میں سے ہر ایک کو 3 روپے کے عوض ڈوگرا حکمران کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا تھا۔''(18)

کشمیری لوگ ہمیشہ یہ محسوس کرتے رہے تھے کہ ڈوگرے جموں کو اپنا گھر اور وادی کو مفتوحہ علاقہ تصور کرتے رہیں۔

جب گلاب سنگھ نے لاہور کا قلعہ خالی کیا تو وہ سکھ خزانے کا ایک بڑا حصہ اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب رہا، اس دور کے ایک آدمی محمد لطیف نے لکھا' روپے اور چاندی کے سکوں سے بھرے ہوئے 16 چھکڑے تھے جبکہ پانچ سو گھڑ سواروں میں ہر ایک کو سونے کی مہروں کا ایک ایک تھیلا دیا گیا تھا اور اس کے اردلیوں کو بھی زیورات اور دیگر قیمتی اشیاء دی گئیں تھیں۔ سکھ سپاہیوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کیلئے چھکڑوں پر اسلحہ بھی لادا گیا تھا۔(19)

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اگر برطانوی سامراجی کشمیر پر قبضہ کر لیتے اور وہ برطانوی ہندوستان کا حصہ ہوتا تو جب 1947ء میں برصغیر کی تقسیم ہوئی' تقسیم کے اصولوں کے تحت اسے بھی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جاتا اور غالب مسلم اکثریت کی حامل وادی بلاشبہ پاکستان کے حصے میں آتی۔

تاہم برطانیہ کیلئے یہ ایک اچھا سودا تھا۔ اب کشمیر کی ریاست میں، جو دو بڑی سلطنتوں کے درمیان میں تھی، ان کے پاس ایک وفادار ایجنٹ موجود تھا۔ 9 نومبر 1846ء کو انہوں نے وادی پر قبضہ کرنے میں گلاب سنگھ کی مدد کی تھی اور اس کے بعد ڈوگرے ہمیشہ برطانوی توقعات پر پورے اترے' جہاں کہیں بھی برطانوی سلطنت کو افرادی قوت یا پیسے کی ضرورت پیش آئی وہ مدد کیلئے پیش پیش تھے۔

''جموں اور کشمیر کا تحفہ قبول کر لینے کے بعد گلاب سنگھ نے اپنے آپ کو زرخرید غلام گردانا تھا' یہ ایک موزوں اظہار تھا۔''(20)

1857ء کی جنگ آزادی کے دوران گلاب سنگھ نے دہلی کا محاصرہ کرنے میں انگریزوں کو مدد دینے کی غرض سے اپنے بیٹے رنبیر سنگھ کو 2000 پیادہ فوج' 200 گھڑ سواروں اور چھ بڑی توپوں کے ساتھ بھیجا تھا۔ اگست 1857ء میں گلاب سنگھ مر گیا لیکن اس کے جانشین انگریزوں کے وفادار رہے۔ انہوں نے پنجاب میں ان فوجی دستوں کیلئے بہت بھاری رقم بھیجی جن کی تنخواہ بقایا تھی۔ ''کشمیر میں بھی،

جو پنجاب پر انگریزوں کے قبضے کے بعد برطانوی ہندوستان کی سرحد پر واقع تھا''باغیوں'' کو پناہ لینے سے روک دیا گیا۔ ملکہ وکٹوریہ نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کو ''موسٹ اگزالٹڈ آرڈر آف دی سٹار آف انڈیا'' کا خطاب دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کو سلامی دینے والی توپوں کی تعداد 19 سے بڑھا کر 21 کر دی گئی۔ 80-1878ء میں انگریزوں اور افغانوں کے درمیان ہونے والی جنگ میں کشمیر کے ڈوگروں نے فوجیوں اور توپ خانے کی مدد سے برطانیہ کا ساتھ دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران 1914ء اور 1917ء میں 1200 سپاہیوں پر مشتمل سیکنڈ کشمیر رائفلز برطانیہ کی مدد کیلئے گئی۔ دوسری عالمی جنگ میں بھی اسی طرح کی مدد فراہم کی گئی۔ کشمیری فوجی دستوں نے مشرقی افریقہ' مصر' میسوپوٹیمیا اور فرانس کے محاذوں پر جنگ میں حصہ لیا۔ انہوں نے ان آپریشنوں میں بھی حصہ لیا تھا جو فلسطین میں ترکوں کی شکست کا سبب بنے۔

ڈوگروں کی حکمرانی کشمیریوں کیلئے کسی ڈراؤنے خواب سے کم نہیں تھی۔ وائین نے گلاب سنگھ کے خوفناک مظالم کا بھی مشاہدہ کیا تھا:

> 1837ء میں پونچھ جودھیان سنگھ کو انعام میں دی گئی جاگیروں میں سے ایک تھی' کے گورنر شمس الدین نے بے تحاشا ٹیکسوں کے خلاف ایک بغاوت کی قیادت کی۔ اسے اور اس کے حامیوں کو شدید سزا دی گئی۔ گلاب سنگھ نے جن لوگوں کو قیدی بنایا تھا ان میں سے کچھ کی زندہ کھالیں کھینچیں گئیں۔ پھر اس نے حکم دیا کہ ایک یا دو کھالوں میں بھوسہ بھرا جائے' ان کے ہاتھ اکڑے ہوئے تھے اور اس انداز سے باندھے گئے تھے جیسے گڑگڑا کر کوئی التجا کر رہے ہوں۔ پھر نعشیں سیدھی کھڑی کی گئیں اور سر جن کو کاٹ کر جسم سے الگ کر دیا گیا تھا گردنوں پر الٹے رکھ دیے گئے پھر ان کو رستے کے اطراف میں کھڑا کر دیا گیا تا کہ پاس سے گزرنے والے لوگ انہیں دیکھ سکیں۔ (21)

چوتھا اور آخری ڈوگرہ حکمران ہری سنگھ 1925ء میں اقتدار پر براجمان ہوا۔ مہاراجہ ریاستی آمدن عیاشیوں اور جنسی لذت میں اڑاتا رہا جبکہ لوگ مایوسی اور بدحالی کی دلدل میں دھنستے چلے گئے۔

1920ء کی دہائی میں گواشا ناتھ کاؤل نے اپنی کتاب ''کشمیر تب اور اب'' میں لکھا تھا کہ

> سری نگر کا شہر دل دہلا دینے والا ایک منظر پیش کر رہا تھا۔ زینہ کدل اور گاؤ کدل میں واقع طوائفوں کے دو مراکز میں خواتین کو انتہائی سستے داموں انتہائی ظالمانہ مصائب کا سامنا تھا۔ دن ہو یا رات چوریاں عام تھیں۔ انتظامیہ کا مسلم دشمن رویہ اپنے عروج پر تھا۔ بھکاری اتنے زیادہ تھے کہ ان کے جتھوں کے جتھے ایک دمڑی (روپے کا 144واں حصہ) پر ٹوٹ پڑتے تھے مزدوری اس قدر سستی تھی کہ ایک کھیوڑ (80 پونڈ) شالی 4 آنے میں صاف کی جاتی تھی۔ خواتین بن بلائے گھر گھر جا کر کام کرتی تھیں۔ ناخواندگی اس قدر شدید تھی کہ صرف چند خوش نصیب لوگ ہی پڑھ لکھ سکتے تھے۔ بیروزگاری اس قدر زیادہ تھی کہ 10 یا 12 افراد کے کنبے میں سے بمشکل ہی کوئی فرد برسرروزگار تھا۔ شرح پیدائش کم تھی اور شرح اموات قابل علاج بیماریوں کے سبب زیادہ تھی کیونکہ ان کیلئے کسی قسم کا علاج میسر نہ تھا۔ عام لوگ سیر و تفریح کے نام ہی سے نابلد تھے۔ گندے کپڑے زندگی کا ایک عام پہلو تھا کیونکہ صابن کمیاب بھی تھا اور مہنگا بھی۔ سکھوں کی صورتحال بھی اتنی ہی خوفناک تھی۔ بحیثیت ایک طبقے کے پنڈت ذرا بہتر نظر آتے تھے... سری نگر میں مسلمانوں کے 90 فیصد مکانات بھارتی ساہوکاروں نے رہن رکھے ہوئے تھے۔ (22)

زمین سے جو پیداوار حاصل ہوتی تھی حکومت اس کا دو تہائی سے تین چوتھائی تک حصہ لے لیتی تھی۔ ایک برطانوی امن پسند' ہوریس الیگزانڈر نے کشمیر امن کمیٹی کو

بتایا تھا کہ:

''مہاراجہ حکومت اگر کشمیریوں کو کوڑوں کی سزا دیتی تھی تو پونچھیوں کو بچھوؤں سے رام کرتی تھی۔''(23)

پنجاب کے ایک سماجی کارکن رچررڈ سائمنڈز نے لکھا تھا:

''ہر گائے، بھینس اور بھیڑ پر ٹیکس عائد تھا' اور حتیٰ کہ ہر بیوی پر بھی۔''(24)

ان دگرگوں حالات کے باوجود لوگ فطری طور پر تشدد سے نفرت کرتے تھے۔ ایک سرکاری اہل کار والٹر لارنس نے گزشتہ صدی کے شروع میں لکھا تھا:

مختصراً یہ کہ کشمیری کاشتکاروں کے ساتھ کسان غلاموں کا سا سلوک کیا جاتا تھا اور درحقیقت انہیں کاشتکاری پر مجبور کیا جاتا تھا۔ انہیں اپنی زمینوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور انہیں کسی بھی وقت سرکاری اہل کاروں یا بااثر افراد کیلئے کام کرنے کی غرض سے بلایا جا سکتا تھا...(لیکن) دیہات میں جرم نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ میں نے کبھی بھی فصلوں کی چوری کے کسی واقعہ کے بارے میں نہیں سنا۔ افراد کے خلاف تشدد انتہائی کم ہے، زیادہ سے زیادہ وہ اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ کسی مخالف کی پگڑی گرا دیتے ہیں اور اس کو اس کے چغے سے پکڑ لیتے ہیں۔ انہیں خونی منظر دیکھنے سے نفرت ہے۔(25)

طبقاتی جدوجہد کی تاریخ

یہ ایک تاریخی تضاد ہے کہ پرستان نما اس خوبصورت علاقے کے جن لوگوں کو خون بہانے اور تشدد سے نفرت تھی وہ حکمران طبقات اور ان کے سرمایہ دارانہ نظام کے جرائم کی وجہ سے آج خون میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن کشمیر کی تاریخ مزدوروں' کسانوں اور خاص کر نوجوانوں کی جدوجہد کے حوالے سے بہت زرخیز

ہے۔

1924ء کے موسم گرما میں کشمیری مزدور بغاوت پر اتر آئے۔ سری نگر میں ریشم کے ایک کارخانے کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔اگلے دن انہوں نے سرکاری زمین پر قبضہ کرلیا اور سارا شہر بند ہوگیا۔ مہاراجہ نے انتہائی ظالمانہ جبر کا استعمال کیا۔ فوج طلب کر لی گئی اور ہڑتال کو بے رحمی سے کچل دیا گیا۔ سعد دین شاول کو فیکٹری سے نکال دیا گیا۔ لیکن یہ اس دیوہیکل جدوجہد کا محض نقطہء آغاز تھا جس نے ابھی شروع ہونا تھا۔

جس طرح مسلم حکمرانوں نے ہندوؤں اور دیگر مذہبی اقلیتوں کو جبر کا نشانہ بنایا تھا اسی طرح ڈوگروں نے' خاص کر ہری سنگھ کی حکومت نے کشمیری مسلمانوں' خاص کر مظلوم طبقات سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک روا رکھا۔ ہری سنگھ اور اس کے مشیر کٹر ہندو تھے۔ ان میں اس کی بیوی مہارانی تیرادیوی' اس کا بھائی چند اور ایک سوامی جس کو بعض لوگ ''کشمیر کا راسپوٹین'' بھی کہتے ہیں، شامل تھے۔

معاشی اعتبار سے ریاست کی طرف سے بے تحاشا ٹیکس اکٹھے کرنے کی پالیسی، کشمیریوں پر زمین کی ملکیت کی پابندی اور چھوٹے چھوٹے سرکاری اہلکاروں کی بے پناہ بدعنوانی نے اس بات کو یقینی بنا دیا تھا کہ مسلمان ''زندہ رہنے'' کی ایک مخصوص سطح سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بے تحاشا ٹیکس اکٹھے کرنے کے رجحان کی بنیاد گلاب سنگھ نے رکھی تھی۔اس نے وہ 75 لاکھ روپے پورے کرنے کا عزم کیا ہوا تھا جو اس نے انگریزوں کو کشمیر کے عوض دیے تھے۔ اس کے جانشین بھی کشمیریوں کا خون نچوڑتے رہے۔ نہ صرف یہ کہ ٹیکسوں کی شرح بہت زیادہ تھی بلکہ درحقیقت کوئی بھی چیز ٹیکس سے مستثنیٰ نہیں تھی! فصلیں' پھل' جانوروں کی چراگاہیں' دستکاریاں (شالین' قالین وغیرہ)' شادیاں' تقریبات' مزدوری جس میں گورکنی

اور حتیٰ کہ جسم فروشی بھی شامل تھی سب پر ٹیکس لاگو ہوتا تھا۔

بدنام زمانہ بیگار کا نظام جس کے تحت حکومت سڑکوں وغیرہ کی تعمیر جیسے ریاستی منصوبوں کیلئے اپنے شہریوں سے جبراً کام کرواسکتی تھی دوبارہ متعارف کیا گیا۔ جن لوگوں کو ''ریکروٹ'' کیا جاتا تھا وہ انکار کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے تھے اور انہیں اپنی خدمات کے عوض بہت کم یا بالکل ہی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ مزید یہ کہ کام زیادہ تر موسم گرما کے دوران کیا جاتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب کسانوں کو اپنی فصلوں کی دیکھ بھال کیلئے گھروں پر رہنے کی شدید ضرورت ہوتی تھی۔ سرکاری طور پر سر والٹر لارنس (سیٹلمنٹ آفیسر 95-1889ء) کی تجویز پر بیگار ختم کر دیا گیا تھا لیکن یہ نظام بلا روک ٹوک جاری رہا۔

> کشمیری مسلمانوں کے مصائب کی فہرست بہت لمبی ہے---تمام زرعی زمین پر ریاستی قبضہ' جنگلات کا انتظام' پولیس تشدد' ریشم کے کیڑوں کی فروخت پر سرکاری کنٹرول' غیر مساوی ٹیکس اور اجناس نہ کہ رقم کی شکل میں زمینی لگان کی جزوی ادائیگی--- یہ تمام متنازع معاملات ہیں۔ جوتا پہننے کی تکلیف اسے روزانہ استعمال کرنے سے ہوتی ہے۔ پھر دیہات کے سکول ٹیچر' سول اور فوجداری جج' ریونیو اور ٹیکس کے افسر--- درحقیقت مقامی سطح پر ہر شعبے میں مسلمانوں کی آبادی میں ہندوؤں کی غالب نمائندگی ہے۔ دونوں کے درمیان تفاوت ناگزیر ہے اور کسی بھی شخص کی تلخ کلامی اور بے اعتنائی سے اس نفرت کو تقویت ملتی ہے۔(26)

25 جون 1931ء کو ایک عوامی جلسے میں ایک پٹھان باورچی قدیر خان نے ایک فی البدیہہ اور انتہائی 'شعلہ بیان' تقریر کی جس میں اس نے عمومی طور پر ہندوؤں کو اور خاص کر ہری سنگھ کو ہدف بنایا۔ اسے فوراً ہی سرکشی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ قدیر خان کی کہانی نے مسلمانوں کے غیض وغضب کو ایک نیا نقطہ ارتکاز فراہم

کیا۔ جب 6 جولائی کو سری نگر کی سیشن کورٹ میں مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو 7000 لوگوں کا ایک ہجوم باہر جمع ہو گیا اور جیل کے اندر جانے کا مطالبہ کرنے لگا۔عوام اور پولیس کے درمیان جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ پولیس نے بالآخر ہجوم پر فائر کھول دیا اور 21 افراد مار ڈالے۔ جب نعشوں کو ایک جلوس کی شکل میں جامع مسجد لے جایا جا رہا تھا تو سری نگر کے دوسرے علاقوں میں ہندو دشمن فسادات شروع ہو گئے۔سب سے زیادہ فساد مہاراج گنج میں ہوا جہاں ہندوؤں کی دکانیں لوٹی گئیں اور تین ہندوؤں کو مار دیا گیا۔اس پورے واقعہ میں 163 افراد زخمی ہوئے۔

اگرچہ جولائی 1931ء کے واقعات کا ظاہری سبب مذہبی معاملات نظر آتے ہیں لیکن اصل سبب معاشی وسماجی حالات تھے۔

یہ ناگزیر تھا کہ کسی بھی لمحے کوئی اور چیز اس بے چینی کو زیادہ ٹھوس شکل میں سامنے لے آئے۔ یہ کہنا درست ہو گا کہ اشتعال دلانے والی یہ چیز کسی مذہبی معاملے کی طرح کوئی ''سیکولر'' چیز بھی ہو سکتی تھی۔

کشمیر کمیٹی نے مطالبہ کیا کہ تحقیقات کیلئے ایک خودمختار کمیشن مقرر کیا جائے اور اس نے قیدی ''شہیدوں'' کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنے کیلئے 14 اگست کو ''یوم کشمیر'' منانے کا فیصلہ کیا۔

جولائی میں مارے جانے والوں کی یاد میں یوم کشمیر (14 اگست) پر کمیٹی کی طرف سے دی جانے والی کال پر بہت بڑا ردعمل سامنے آیا۔ایک ایسا ردعمل جو خود ریاست کی سرحدوں سے باہر نکل گیا تھا۔ برطانوی ہندوستان میں ممبئی' کلکتہ اور دہلی جیسے بڑے شہروں میں جلسے منعقد کیے گئے جب کہ جموں وکشمیر میں مہاراجہ کی طرف سے پابندی عائد کیے جانے کے باوجود جامعہ مسجد سری نگر کی ریلی میں تقریباً 50,000 لوگوں نے شرکت کی۔

تاہم مہاراجہ کے خلاف چلنے والی تحریک محض مذہبی نہیں تھی۔ یہ درست ہے کہ

کشمیر میں بعض اوقات طبقاتی اور مذہبی مسائل ہم آہنگ ہوتے رہے۔ ہندوؤں پر حملے کے باوجود مسلمان محنت کشوں کا اصل ہدف ہندو مذہب کے ماننے والے نہیں بلکہ ریاست تھی۔

28 دسمبر 1931ء کو کشمیر میں ہونے والے فسادات پر وہاں رہنے والے انگریزوں نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا:

''مسلمانوں کے جذبات ہندو دشمن نہیں ہیں بلکہ دربار مخالف ہیں۔''

1941ء میں لکھی جانے والی کتاب ''ان سائیڈ کشمیر'' میں پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے:

جولائی تک عوامی احتجاج کے پیچھے کارفرما قوت محرکہ عام مسلمانوں میں پائی جانے والی بے چینی تھی۔ جیل پر ہونے والے حملے کا رخ کسی بھی طرح ہندوؤں کے خلاف نہیں تھا اور جن لوگوں نے جیل کے دروازے پر لڑتے ہوئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا انہوں نے ایسا ایک ایسی حکومت کے خلاف لڑتے ہوئے کیا تھا جس کو ان سے کوئی ہمدردی نہیں تھی... یہ لڑائی مظلوموں کی ظالم کے خلاف تھی، یہ محکوموں کی حاکموں سے لڑائی تھی۔ (27)

1931ء کی تحریک ایک خودرو عوامی اٹھان تھی۔ اس کے پیچھے سیاسی اور معاشی وجوہات تھیں۔ مسلمان اشرافیہ نے اس تحریک کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی اور مسلمان عوام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ ان کے مصائب کا سبب یہ تھا کہ ''کفار'' ان کی ریاست پر حاکم تھے اور زندگی کے ہر شعبے میں غالب تھے۔

حالیہ سالوں میں بھی سری نگر میں غالباً برصغیر کے کسی بھی دوسرے شہر کی نسبت زیادہ ہڑتالیں اور تصادم ہوئے ہیں۔ جبر و استبداد کے مختلف ادوار سے گزر کر مزدور جدوجہد اور عوامی بغاوت کی ایک مضبوط روایت پنپ گئی ہے۔

برصغیر کی تقسیم سے قبل کا کشمیر درحقیقت عوام کیلئے ایک جہنم تھا جہاں ڈوگروں کی ظالمانہ حکومت کے ساتھ ساتھ انتہائی غربت' بدحالی اور بیماری تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ جدوجہد کا ایک مینار بھی تھا۔ یہ وہ پس منظر ہے جس میں برصغیر کی تقسیم کی مجرمانہ حرکت کی گئی۔ اس مجرمانہ حرکت سے کشمیر کی آئندہ نسلوں کے مصائب میں مزید اضافہ ہوگیا۔ برصغیر کو تقسیم ہوئے 58 سال گزر گئے ہیں لیکن اس کرب میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔

باب نمبر 4

کشمیر اور بٹوارے کا زخم

گزشتہ صدی کے اختتام اور موجودہ صدی کے آغاز میں صنعت یورپ کی آبادی میں ڈسپلن پیدا کر رہی تھی۔ سماجی تعلیم کے تمام مرحلوں میں محنت کی پیداواریت کا اصول غالب تھا۔ اس سے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے اور یوں لگتا تھا کہ لوگوں کیلئے نئے نئے مواقع جنم لیں گے۔ لیکن درحقیقت اس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں برآمد ہوا۔ یہ درست ہے کہ کمزور فلسفوں کی چیخ و پکار کے باوجود انسانیت اپنے آپ کو اس بات کا قائل کرنے میں کامیاب ہوگئی کہ جنگ بہرحال مایوسی کی بجائے زندگی، طاقت، جرات اور ولولے سے بھرپور ہے۔ اس جنگ کے ذریعے ہی انسان نے اپنی بے مثال طاقت اور تکنیکی قوت کا اظہار کیا۔ یہ ایسے ہی تھا جس طرح کوئی آدمی یہ ثابت کرنے کیلئے کہ اس کی سانس اور خوراک کی نالیاں ٹھیک ہیں کسی آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر استرے کے ساتھ اپنا ہی گلا کاٹنے لگے۔

لیون ٹراٹسکی (1)

تقسیم کرو اور حکمرانی کرو

تقسیم ہند برطانوی سامراج کے انتہائی گھناؤنے جرائم میں سے ایک تھا۔ اس اقدام کا مقصد نہ تو مسلمانوں اور نہ ہی ہندوؤں کے مفادات کا تحفظ کرنا تھا بلکہ اس کا مقصد قومی آزادی کی اس تحریک میں دراڑیں ڈالنا اور اسے تباہ و برباد کرنا تھا جسے وہ اسلحے کی طاقت سے زیر کرنے میں ناکام رہے تھے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا نے نوآبادیاتی انقلاب کی ایک دیوہیکل اٹھان دیکھی۔ غالباً انسانی تاریخ میں مظلوم عوام کی یہ سب سے بڑی تحریک تھی۔ یہ چین، افریقہ، لاطینی امریکہ، مشرق وسطیٰ، انڈونیشیا اور ہندوستان کے نوآبادیاتی عوام کی بہت بڑی بیداری تھی۔ یہ ایک ولولہ انگیز تحریک تھی جس میں سابقہ نوآبادیاتی غلام کروڑوں کی تعداد میں قومی آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے اپنے آقاؤں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ مارکسسٹوں نے جن وجوہات کی بنا پر نوآبادیاتی انقلاب کی حمایت کی تھی وہ بالکل واضح ہیں۔ یہ ایک انقلابی تحریک اور سامراج پر کاری ضرب تھی۔ اس نے عوام کو بیدار کیا اور طبقاتی جدوجہد کو مزید آگے بڑھایا۔

برصغیر کی بھارت اور پاکستان کی شکل میں تقسیم نہ صرف ایک رجعتی سیاسی قدم تھا بلکہ اس تقسیم کے باعث انسانی تاریخ میں معصوم انسانوں کے خون سے سب سے بڑی ہولی کھیلی گئی اور کروڑوں لوگ اس بربریت کا شکار ہوئے۔ پورا معاشرہ اس بربادی کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس تکلیف دہ تقسیم کی یاد سے آج بھی لوگوں کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔

> 1947ء کے اختتام تک تقریباً 5 لاکھ لوگ مارے گئے۔ اس سے کہیں زیادہ لوگوں کے گھر اجڑ گئے: 45 لاکھ ہندوؤں اور سکھوں نے مغربی پاکستان سے بھارت ہجرت کی، جبکہ 60 لاکھ مسلمانوں نے اس کی

مخالف سمت میں ہجرت کی۔ بنگال جہاں ہلاک ہونے والے لوگوں کی تعداد نسبتاً کم تھی، وہاں بھی 10 لاکھ لوگ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔(2)

1700ء میں تقریباً اس وقت جب انگریزوں نے ہندوستان میں قدم رکھا، عالمی آمدن میں ہندوستان کا حصہ تقریباً 22.6 فیصد تھا۔ براہ راست انگریز حکمرانی کے خاتمے اور آزادی کے فوراً بعد یہ حصہ کم ہو کر 3.8 فیصد رہ گیا تھا۔

برطانیہ کو اپنی ہندوستانی سلطنت تعمیر کرنے میں 300 سال سے زائد عرصہ لگا۔ 1947ء میں انہوں نے محض 70 دنوں میں اس کے بخیے ادھیڑ کے رکھ دیے۔ برطانیہ کی اصل کمزوری کا وسیع پیمانے پر تجزیہ نہیں کیا گیا۔ درحقیقت 47-1946ء کے خوفناک موسم سرما کے بعد برطانیہ مالیاتی دیوالیہ پن کے دہانے پر پہنچ چکا تھا۔ فروری 1947ء میں ایٹلی کی کابینہ نے بیرون ملک ذمہ داریوں میں زبردست کمی کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ برطانوی فوج کے سپاہیوں کی بغاوتوں کی وجہ سے بھی برطانیہ کی اپنی نوآبادیوں پر براہ راست فوجی تسلط قائم رکھنے کی صلاحیت ماند پڑ گئی۔

یہ وہ پس منظر تھا جب ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے (22 مارچ تا 15 اگست 1947ء) بنایا گیا جس عرصے کیلئے ماؤنٹ بیٹن وائسرائے رہا اس میں نہ صرف اس نے برطانیہ کی ہندوستانی سلطنت کو اس کے انجام تک پہنچایا بلکہ اس دوران کشمیر کے تنازعے پر بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کے ابتدائی مراحل بھی دیکھے۔

برطانوی ہند کی تقسیم کا بنیادی منصوبہ وی پی مینن نے چار گھنٹے میں تیار کیا تھا جسے برطانوی کابینہ نے محض پانچ منٹ کی بحث کے بعد منظور کر لیا۔

جس جلد بازی میں تقسیم کی گئی تھی اس سے یہ نظر آ رہا تھا کہ برطانوی راج کے جانشینوں کو سنجیدہ مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اتنے تکلیف دہ آپریشن کے بعد صحت

یاب ہونے کے لئے تکالیف تو اٹھانی پڑتی ہیں۔ اس کا ایک بالواسطہ نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے برصغیر میں فرقہ وارانہ تناؤ بڑھ گیا جس سے بڑے پیمانے پر قتل عام اور ہجرت ہوئی۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے حالات پیدا ہوئے جن کے باعث کشمیر پر بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔

یہ ایک غیر معمولی تاریخی حقیقت ہے کہ تقسیم ہند کے وقت جب برصغیر کے زیادہ تر علاقے (خاص کر بنگال اور پنجاب-- دو قومیتیں جن کے زندہ جسم کو چیر دیا گیا تھا) فرقہ وارانہ قتل عام اور مذہبی جنون کے کرب میں مبتلا تھے کشمیر نسبتاً اس پاگل پن سے محفوظ رہا۔ لیکن جغرافیائی قربت کے باعث پنجاب میں ہونے والی قتل و غارت کے سبب بالآخر تشدد جموں تک جا پہنچا۔

تقسیم سے پہلے پہل فرقہ وارانہ قتل و غارت کا ایک 'طوفان' برپا ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوؤں اور سکھوں کی مشرق کی طرف اور مسلمانوں کی مغرب کی طرف ہجرت ہوئی۔ کچھ پنجابی پناہ گزین جموں اور کشمیر میں جا پہنچے جہاں انہوں نے قتل و غارت اور عصمت دری وغیرہ کی خوفناک داستانیں بیان کیں۔ ان پناہ گزینوں کی موجودگی سے فرقہ وارانہ تشدد کو ہوا ملی اور اس میں شدت آ گئی۔ صوبہ جموں میں، جہاں ہندوؤں کی اکثریت فرار ہو کر پہنچی تھی، وہاں ان کے ہم مذہبوں نے مسلمان آبادی کے خلاف ایک جوابی حملہ شروع کیا۔ لیمب لکھتی ہے کہ اگست 1947ء تک:

> جموں میں ریاست کا وہ حصہ جہاں غیر مسلموں کی اکثریت تھی، وہاں فرقہ وارانہ صورتحال بہت تیزی سے بگڑ گئی جہاں ہندوؤں، سکھوں (آر ایس ایس کے ارکان، ہندو انتہا پسندوں، اکالی سکھوں اور دیگر) کے مسلح جتھے مسلمانوں کے دیہات پر حملے کر رہے تھے- ان حملوں کے نتیجے میں ایک بڑی آبادی نے ہجرت کی۔ ایک

اندازے کے مطابق اگست، ستمبر اور اکتوبر 1947ء کے دوران کم از کم 5 لاکھ مسلمان جموں سے اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور ان میں سے کم وبیش 2 لاکھ لاپتہ ہو گئے۔ (3)

ان میں سے کئی ایک فرار ہو کر کشمیر اور پونچھ جا پہنچے اور انہوں نے اپنے سے پہلے وہاں پہنچنے والے پنجابی مسلمانوں کی المیہ داستانوں میں مزید اضافہ کیا۔ اس کا فطری نتیجہ ایک اور فرقہ وارانہ جوابی حملے کی صورت میں نکلا۔ اب کی بار یہ مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف تھا۔

پونچھ کی بغاوت

پنجاب اور جموں میں ہونے والی ہلاکتوں کے نتیجے میں پونچھ میں ڈوگرہ حکومت کے خلاف بغاوت جو بنیادی طور پر معاشی زیادتیوں (اشیائے خوردونوش کی قیمتوں اور ٹیکسوں) کے خلاف تھی، اسے 'ہندو مسلم' تصادم بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس امر کو شمال مغربی سرحدی صوبے (پختونخواہ) کی جانب سے مزید تقویت ملی۔ مسلمانوں کی ہلاکتوں کی خبریں سن کر پٹھان غضب ناک ہو گئے اور وہ ہندوؤں اور سکھوں سے بدلہ لینے کیلئے پونچھ روانہ ہو گئے۔

پونچھ 36-1935ء میں براہ راست ڈوگرہ حکومت کی عملداری میں آیا تھا۔ لیکن اس سابقہ جاگیر کے لوگ کبھی بھی ڈوگرہ حکمرانی کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ نسلی اعتبار سے ان کے جموں کے ساتھ تعلقات بہت کم تھے۔ اس اعتبار سے وہ پنجاب کے زیادہ قریب تھے۔ پونچھ کے مسلمانوں خاص کر سدھن قبیلے کے لوگوں نے بڑے پیمانے پر انگریز فوج اور جموں و کشمیر کی فوج میں خدمات سرانجام دی تھیں۔ 1947ء میں دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر کوئی 60,000 کے لگ بھگ سابقہ فوجی ملازم واپس پونچھ لوٹے تھے۔ ان لوگوں کے پاس فوجی تجربے کے

ساتھ ساتھ اسلحہ بھی تھا۔

جون 1947ء میں حکومت کی طرف سے عائد کردہ بے تحاشا ٹیکسوں کی وجہ سے ایک بغاوت پھوٹ پڑی۔ 10,000 کے لگ بھگ پونچھیوں نے غذائی اجناس کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے خلاف پونچھ شہر میں مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ شہر تک پہنچنے سے قبل باغ میں ان کی ریاستی فوجیوں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ حکومت نے شہریوں سے مطالبہ کیا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔ لیکن اس حکم کی کوئی پرواہ نہ کی گئی۔ 14 اگست کے دن صورتحال اس وقت مزید خراب ہوگئی جب حکومتی پابندی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مسلمانوں نے یوم پاکستان (جو یوم کشمیر بھی تھا) کی تقریبات منعقد کرنے کی کوشش کی۔ مزید برآں، تقسیم ہند کے بعد پنجاب میں ہونے والی ہلاکتوں اور پونچھ میں بہت سارے مسلم پناہ گزینوں کے آنے سے تصادم فرقہ وارانہ شکل اختیار کر گیا۔ ستمبر تک یہ بغاوت محمد ابراہیم خان (پرجا سبھا میں پونچھ سے مسلم نمائندے اور مسلم کانفرنس کے رکن) کی زیر قیادت ایک حد تک منظّم ہو چکی تھی اور اس نے علیحدگی کی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اکتوبر 1947ء میں ڈوگرہ حکمرانی سے آزاد علاقوں میں 'حکومت آزاد کشمیر' کے قیام کا اعلان کیا گیا اور اس کا دارلحکومت مظفرآباد میں قائم کیا گیا۔

جب ایک بار پونچھ کی بغاوت چل نکلی تو اسے کئی ایک ذرائع، جموں کشمیر کی فوج کے بھگوڑوں، انڈین نیشنل آرمی کے سابقہ سپاہیوں اور جہلم کے پنجابی مسلمانوں سے حمایت ملی، ابتداء میں زیادہ تر امداد شمال مغربی سرحدی صوبے کے پٹھانوں کی جانب سے آئی۔ ابتداء میں حکومت پاکستان اس تحریک میں ملوث ہونے پر قطعاً تیار نہ تھی۔ درحقیقت اس نے آزاد کشمیر کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم ستمبر تک یہ باغیوں کو غیر سرکاری امداد فراہم کر رہی تھی۔

وسیع تر تناظر میں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ پنجاب اور بعد میں جموں اور کشمیر میں ہونے والے مذہبی فسادات نے عمومی طور پر اس وقت کے تین بڑے گروپوں کی

پہلے سے موجود آراء میں زیادہ شدت پیدا کردی۔ ریاست کی ہندو آبادی کو پہلے سے زیادہ یقین ہوگیا کہ مسلمانوں کی حکمرانی میں ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اگر مہاراجہ اپنا اقتدار برقرار نہیں رکھ سکتا تو وہ بھارت کے ساتھ الحاق کرنا چاہیں گے۔ مسلم کانفرنس کے حامی پاکستان کے ساتھ الحاق کو زیادہ ترجیح دینے لگے اس کے علاوہ کچھ اب تک آزاد مسلم ریاست کے حق میں تھے۔

سی پی آئی (CPI) کی قیادت کی زوال پذیری

کشمیر میں تحریک کا زیادہ تر زور ڈوگرہ مہاراجاؤں کی آمرانہ اور وحشیانہ حکمرانی کے خلاف تھا۔ باالفاظ دیگر تحریک میں مذہبی اور قوم پرستانہ جذبات کی نسبت طبقاتی جدوجہد زیادہ نمایاں تھی۔ اگر ایک حقیقی مارکسی انقلابی پارٹی اور قیادت موجود ہوتی تو کشمیر میں قومی آزادی کی اس تحریک کی قیادت کرتی جس سے دوسری عالمی جنگ کے آخری مہینوں میں سارا برصغیر لرز رہا تھا۔ کشمیر کے اندر کمیونسٹ پارٹی کی قوتیں بہت کم تعداد میں تھیں۔ بدقسمتی یہ تھی کہ جنگ کے آخری سالوں میں سی پی آئی (کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا) کی مرکزی قیادت نے برطانوی سامراج کے ساتھ مصالحت اختیار کرلی۔ یہ سب کچھ ماسکو کی بیوروکریسی کی ایما پر کیا گیا تھا جو سوویت یونین کے ''قومی مفاد'' کو آگے بڑھانے کیلئے سامراج کے ساتھ سمجھوتے کے اپنے ایجنڈے پر عمل پیرا تھی۔ سی پی آئی کی قیادت کی ان پالیسیوں کے کشمیر سمیت ہندوستان بھر میں موجود کمیونزم کی غیر معمولی طاقتوں پر انتہائی مضر اثرات مرتب ہوئے۔

دوسری عالمی جنگ کے آغاز میں خاص کر سٹالن اور ہٹلر کے درمیان ہونے والے معاہدے کے بعد سی پی آئی نے ایک بھرپور جنگ مخالف تحریک شروع کی۔ اس نے جنگ کو سامراجی جنگ قرار دیا اور برطانیہ مخالف احتجاج میں سی پی آئی سب سے آگے تھی۔ سی پی آئی کے لئے اپنے آپ کو عوام کے سامنے انقلابی متبادل کے طور

پر پیش کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ جنگ مخالف تحریک کے آغاز میں سی پی آئی نے جنگ کے خلاف عوامی ہڑتالیں منظّم کرنے کا دلیرانہ قدم اٹھایا۔ اس جنگ کے خلاف مزدوروں کا دنیا بھر میں جو پہلا مظاہرہ ہوا تھا وہ 22 اکتوبر 1939ء کو ہندوستان میں ہوا تھا جس میں ایک دن کیلئے احتجاج کیا گیا اور ایک عام ہڑتال کی گئی جس میں 90,000 افراد نے حصہ لیا۔ اس جنگ مخالف احتجاج میں لگائے جانے والے اہم نعرے یہ تھے: ''انسانیت کے خلاف ہونے والے اس ظلم کو شکست دو۔'' ''سامراجی جنگ مردہ باد'' ''آزادی ہند۔ زندہ باد''۔ برطانوی سامراجیوں نے ریاستی تشدد میں اضافہ کر دیا۔ اس جنگ مخالف احتجاج کے دوران سی پی آئی کے ہزاروں کارکنوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ کانگریس کے اندر دائیں اور بائیں دھڑوں کی تقسیم واضح ہونے لگی اور بائیں بازو کے کئی ایک گروپ جن میں ڈاکٹر سبھاش چندرا بوس کے گرد موجود گروپ بھی شامل تھے' اپنے آپ کو سی پی آئی کا حصہ کہنے لگے۔

جب سی پی آئی کی جنگ اور انگریز سامراج کی مخالفت کی بنیاد پر بائیں بازو کے اندر یکجہتی پروان چڑھ رہی تھی تو ماسکو کی پالیسی میں ہونے والی تبدیلیوں نے ایک تباہ کن ضرب کا کام کیا۔ 22 جون 1941ء کو ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔ سٹالنسٹ بیوروکریسی نے اپنی پالیسیوں اور بین الاقوامی اکھاڑے میں موجود طاقتوں کے توازن کے اپنے تجزیے اور پالیسیوں میں یوٹرن لیا۔ عالمی انقلاب کے تناظر سے مکمل لاتعلقی کے بعد کریملن کے آقا اس امر سے مکمل طور پر بے خبر تھے کہ ہٹلر ان کے خلاف ایک تباہ کن حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ وہ چیز تھی جس نے سوویت یونین کو ایک خوفناک دشمن کے سامنے غیر مسلح کر دیا۔ دوسری عالمی جنگ کے آغاز سے لے کر ٹھیک جون 1941ء تک جب ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کیا' نازی جرمنی میں یو ایس ایس آر کی طرف سے ہونیوالی برآمدات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔

1944ء اور 1945ء کے درمیان تہران' یالٹا اور پوسٹ ڈیم میں منعقدہ

تین بڑوں کی کانفرنسوں میں سٹالن نے سامراجی طاقتوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے جس ذلت آمیز طریقے سے سامراجی سفارتکاری کے قدموں میں گھٹنے ٹیکے اس سے کئی ایک کمیونسٹ پارٹیوں اور کئی ایک ملکوں کے انقلابات کے مقدر پر ناکامی کی مہر ثبت ہوگئی۔

سی پی آئی نے موقع پرستانہ موقف کی بھاری قیمت ادا کی۔ انگریزوں کی طرف نرم رویہ اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے قومی بورژوا قیادت کے ساتھ مصالحانہ رویہ بھی اپنانا شروع کر دیا۔ درحقیقت سی پی آئی کے بہت بڑے حصے کانگریس میں ضم ہوگئے۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ سی پی آئی کے کیڈر محنت کش عوام کے سامنے نہرو' گاندھی اور جناح کے طبقاتی مفادات کو بے نقاب کرتے۔ ان کیڈروں کو کوشش کرنی چاہیے تھی کہ وہ لوگ جو برطانوی راج کا تختہ الٹنے کیلئے کوشاں تھے ان پر بورژوا لیڈروں کے اصل ارادے عیاں کرتے۔ ان کیڈروں کا بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ کانگریس میں موجود سوشلسٹ نوجوانوں اور جنگجوؤں کو سی پی آئی میں ریکروٹ کرتے اور سامراجی حکمرانی کا خاتمہ کرنے کیلئے مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ایک عوامی تحریک تخلیق کرتے۔

> سی پی آئی کے موقف میں تبدیلی سے عوام کے اندر تذبذب اور پارٹی کے عام کارکنوں کے اندر ابہام اور بے حسی نے جنم لیا۔ بھارت کے انتہائی نمایاں کمیونسٹ لیڈروں میں سے ایک ای ایم ایس نمبو دری پاد نے جنگ کے حوالے سے کمیونسٹ پارٹی کے رویے میں یوٹرن لینے سے پہنچنے والے نقصان کا اعتراف کیا تھا۔ اپنی کتاب بی جے پی / آر ایس ایس: ''ان دی سروس آف رائٹ ری ایکشن'' میں اس نے لکھا تھا:
>
> جنگ کے پہلے مرحلے میں کمیونسٹوں نے ایک ملک گیر تحریک شروع

کی جس میں مکمل آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔ دوسرے مرحلے میں انہوں نے جنگ کے کردار میں ایک تبدیلی محسوس کی‘ یہ نازی جرمنی کے سوویت یونین پر حملے کا نتیجہ تھا۔ اب یہ ’اقوام‘ کی جنگ بن گئی تھی۔ سی پی آئی نے ’’انڈیا چھوڑ دو‘‘ کا مطالبہ ترک کر دیا اور اپنے آپ کو تحریک سے علیحدہ کر لیا۔(4)

مقامی سطح پر بھی سی پی کی قیادت کی متزلزل پالیسیوں‘ غیر مستقل مزاجی اور سیاسی اہلیت کے فقدان سے ایک خلا پیدا ہوا جسے برصغیر میں حادثاتی اور مقبول عام شخصیات نے پر کیا۔ اس لیے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس عرصے میں بے شمار پارٹیاں اور لیڈر آئے اور چلے گئے۔ اور بالآخر انہوں نے سیاسی اکھاڑا کانگریس اور مسلم لیگ کیلئے خالی کر دیا۔

تاہم کشمیر میں ایک شعوری انقلابی قیادت کی عدم موجودگی سے جو خلا پیدا ہوا اس کو نیشنل کانفرنس اور عبداللہ خاندان نے پر کیا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ جبر اور طبقاتی کشمکش ایک دھماکہ خیز سطح تک پہنچ چکی تھی اور تاریخ میں بارہا دیکھنے کو ملتا ہے کہ جب کسی معاشرے میں تضادات ایک فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ جائیں تو کوئی بھی واقعہ ایک دھماکے کو جنم دے سکتا ہے۔

جولائی 1931ء کو عوامی غیض وغضب اس وقت بھڑک اٹھا جب یہ خبر پھیلی کہ جموں جیل کے ایک سپاہی نے قرآن پاک کی بے حرمتی کی ہے۔ مہاراجے کے خلاف وہ غصہ جو زیر زمین کھول رہا تھا اور رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا اس شگاف سے ایک دھماکے کے ساتھ باہر نکل پڑا۔ سیاسی خلا کے باعث شیخ محمد عبداللہ نے مظلوم کشمیریوں کیلئے ایک اصلاح پسندانہ پروگرام کے ساتھ کامیابی سے مداخلت کی۔ اس مداخلت کے دوران اس نے بڑی ہوشیاری سے ان مصائب کا ذکر کیا جو کسانوں‘ مزدوروں اور دستکاروں کو درپیش تھے۔ اس نے سول نافرمانی کی ایک تحریک چلائی۔ کئی ایک سرگرم لوگوں کو گرفتار کر کے ہری پربت کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ کشمیر میں جو پہلی

اصلاحات ہوئی تھیں وہ اس تحریک کا براہ راست نتیجہ تھیں۔ابتداء میں شیخ عبداللہ نے جو پارٹی بنائی تھی وہ مسلم کانفرنس تھی جو 1932ء میں بنائی گئی تھی (جو آج بھی زیادہ تر پاکستان کے زیر قبضہ کشمیر میں وجود رکھتی ہے) لیکن تحریک کے طبقاتی کردار نے اپنا اثر دکھایا اور 1939ء میں پارٹی نے اپنا نام بدل کر نیشنل کانفرنس رکھ لیا۔اس کا جھنڈا سرخ تھا جس کے درمیان میں سفید رنگ کے ہل کا نشان تھا۔کسانوں کو جو نعرہ دیا گیا تھا وہ یہ تھا:''جب ہل چلتا ہے تو یہ دشمن کو چیر کر رکھ دیتا ہے۔''

پاپولزم کے مسائل

اپنی ابتداء ہی سے نیشنل کانفرنس ایک پیٹی بورژوا پاپولسٹ پارٹی تھی جو سوشلسٹ لفاظی کر رہی تھی۔تاہم اپنی عوامی بنیادوں کو سہارا دینے اور انہیں وسیع کرنے کیلئے انہیں تسلسل کے ساتھ ڈوگروں کی آمرانہ حکمرانی کے خلاف جدوجہد کرنا پڑی۔

1944ء میں شیخ عبداللہ نے کشمیر کے مستقبل کے حوالے سے اپنا خاکہ پیش کیا۔خود نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کے بیان سے ہی کشمیری عوام کا طبقاتی کردار اور تحریک کا دباؤ عیاں ہوتا ہے۔خود شیخ عبداللہ نے اعلان کیا تھا'

> میں نے جدھر بھی دیکھا مجھے ظالموں اور مظلوموں کے درمیان ایک بے رحم جنگ نظر آئی۔میری شدید خواہش ہے کہ میں ان کا نجات دہندہ بنوں اور اپنی زندگی ان کے کاز کیلئے قربان کردوں۔(5)

عبداللہ نے نئی پارٹی کی طبقاتی بنیادوں کا اظہار اپنی خودنوشت سوانح عمری میں کیا:

> ہماری تحریک تمام مذہبی گروہوں کیلئے کھلی تھی۔یہ ضروری ہو گیا تھا کہ نئے سیاسی اور معاشی نقاط اٹھائے جائیں جن کے گرد لوگ جمع ہو سکیں۔ہم نے تجربے سے یہ بات سیکھی تھی کہ لڑائی کا اصل سبب مذہب نہیں بلکہ طبقاتی اور گروہی مفادات کا تصادم تھا۔ہماری تحریک کا بنیادی مقصد ظالم کی مخالفت اور مظلوم کی حمایت کرنا تھا۔(6)

''نیو کشمیر'' نامی کتابچے میں سوشلسٹ نظریات کے مقاصد کی وضاحت کی گئی تھی:

اپنی یونین کو بھرپور مساوات اور حق خودارادیت کے ذریعے مثالی بنانا' اپنے آپ اور اپنے بچوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ظلم اور غربت' ذلت اور توہم پرستی' قرون وسطیٰ کی تاریکی اور جہالت کی کھائی سے باہر نکالنا اور انہیں آزادی کی چکا چوند وادیوں تک لے جانا جہاں فروانی ہو اور جہاں سائنس' اور دیانت داری پر مبنی محنت کا راج ہو۔ (7)

پیارے لال ہانڈو جو فاروق عبداللہ کی حکومت میں وزیر قانون تھا 1944ء کی صورتحال کو یوں بیان کرتا ہے:

سیاسی آزادی کی جنگ کا مطلب معاشی آزادی کی جنگ (تھا)... جب ایک بار اس (شیخ عبداللہ) نے اس پروگرام کو ہماری ریاست کے سیاسی اور معاشی آزادی کے کردار کے حوالے سے اختیار کرلیا تو دیہات میں تیزی سے ایک تبدیلی رونما ہوئی جو 1946ء میں کشمیر چھوڑ دو کے تاریخی نعرے کی شکل میں اپنے بام عروج کو جا پہنچی...(8)

اس مقبول عام پروگرام کے باوجود انہوں نے برطانوی راج کے حکمرانوں سے کئی ایک مصالحتیں اور سمجھوتے کیے۔ اور بعد میں یہ بات ثابت ہوئی کہ اس نظام کی اصلاحات بھی عوام کو مفلوک الحالی سے نجات نہیں دلاسکتیں اور سماجی استحکام پیدا نہیں کرسکتی ہیں۔

سر گوپال سوامی آئینگر 1935ء سے 1943ء تک جموں و کشمیر کا وزیراعظم رہا۔

انگریز اسے ''ایک کٹر ہندو اور کٹر قوم پرست'' گردانتے تھے ''جو کانگریس کی طرف بھی ہمدردانہ جھکاؤ رکھتا تھا۔'' (9)

عفت ملک وضاحت کرتی ہے:

اگست 1942ء میں شیخ عبداللہ نے ہندوستان میں کانگریس کی تحریک کے حق میں ہڑتالیں' مظاہرے وغیرہ منظم کرنے شروع کردیے۔

اپنے ماتحتوں کے ذریعے آئینگر نے اسے مشورہ دیا کہ وہ مہاراجہ یا انگریزوں کو ہدف نہ بنائے۔ اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے عبداللہ نے اپنے پیروکاروں کی سرگرمیوں کو کانگریس کی حمایت تک محدود رکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی ہندوستان کے برعکس جموں اور کشمیر میں کوئی خاص گرفتاریاں نہ ہوئیں۔ نومبر 1942ء میں آئینگر نے عبداللہ کے ساتھ میٹنگ کی: یہ کئی سالوں بعد منعقد ہونے والی پہلی میٹنگ تھی: 'جس کے بعد موخرالذکر نے ہزہائی نیس کے ساتھ اپنی وفاداری کے مزید عہدوپیمان کیے اور کشمیر میں آئینی اصلاحات کی افواہیں گردش کرنے لگیں... اس کے کچھ ہی عرصے بعد کشمیر کی حکومت نے سری نگر میں چاول کے راشن ٹکٹ اور ایندھن کے پرمٹ جاری کرنے کا کام ایسی کمیٹیوں کو سونپا جو تقریباً مکمل طور پر غیر سرکاری اہلکاروں پر مشتمل تھیں۔ ان کمیٹیوں میں حکومتی ایما پر نیشنل کانفرنس کی نمائندگی موجود تھی لیکن مسلم کانفرنس کا کوئی نمائندہ شامل نہیں تھا۔(10)

اگرچہ وہ مذہبی بنیادوں پر برصغیر کی تقسیم اور ایک مذہبی مملکت کے قیام کی مخالفت کر رہے تھے لیکن یہ کافی نہیں تھا۔ انہیں اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ برطانوی راج کے خاتمے کے بعد کے ہندوستان میں سرمایہ داری کے تحت حقیقی جمہوریت' سیکولرازم یا''سوشلزم'' کا حصول ممکن نہیں تھا۔ برصغیر میں سماجی و معاشی تبدیلی کی روز روشن کی طرح عیاں ضرورت کے باوجود نیشنل کانفرنس اور اس کی قیادت کے پاس ایک واضح انقلابی تناظر اور بنیاد کا فقدان تھا جس کے ذریعے وہ ایسا کر سکتے تھے۔ بنیادی طور پر وہ ریڈیکل بورژوا لبرل تھے اور ان کا پروگرام قومی جمہوری انقلاب کے مطالبات تک محدود تھا۔

نظریاتی اعتبار سے نیشنل کانفرنس کی قیادت گاندھی اور نہرو کی قیادت کے قریب تھی اس لیے وہ انہی کا ساتھ دیتے تھے۔ وہ پاکستان کی''مذہبی ریاست'' میں شمولیت

کی مخالفت کر رہے تھے۔ دوسری طرف وہ ڈوگرہ شاہی کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے۔

آزادی کے ایکٹ کے مطابق شخصی ریاستوں کے مہاراجاؤں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ یا تو وہ دونوں میں سے کسی ایک ملک میں شامل ہو جائیں یا پھر خودمختار رہیں۔ ڈوگرہ حکمران ہری سنگھ تذبذب کا شکار تھا۔

سازشیں اور غداری

ستمبر کے وسط میں جناح نے اپنے سیکرٹری کرنل ولیم برنی کو ہدایت کی کہ وہ کشمیر جا کر اس کے لئے دو ہفتوں کے قیام کا بندوبست کرے تاکہ وہ وہاں جا کر آرام کر سکے۔ چھٹیاں گزارنے کے لئے کشمیر کا انتخاب کرنا عام سی بات تھی۔ دوسرے ہم وطنوں کی طرح جناح یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کشمیر، جس کی دو تہائی سے زیادہ آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی تقسیم کے بعد پاکستان کا حصہ نہیں بن سکے گا۔

تاہم جب پانچ دن بعد مذکورہ بالا برطانوی افسر واپس آیا تو اس نے جناح کو ایک حیران کن خبر سنائی۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے جناح کو کشمیر کی سرزمین پر قدم رکھنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا خواہ وہ سیاح کی حیثیت سے ہی کیوں نہ آنا چاہے۔ اس سے پاکستان کے قائدین کو یہ عندیہ ملا کہ کشمیر کی صورتحال ان کی امیدوں کے برخلاف تبدیل ہو رہی ہے۔ 48 گھنٹے بعد جناح کی حکومت نے کشمیر میں ایک خفیہ ایجنٹ بھیجا تاکہ اصل صورتحال کا تجزیہ کیا جا سکے اور مہاراجہ کے اصل عزائم کا پتہ چل سکے۔ اس ایجنٹ نے واپس آ کر یہ رپورٹ دی کہ مہاراجہ پاکستان سے الحاق کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اسی سال ستمبر کے وسط میں اس وقت کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے اپنے قریبی رفقاء کے مخصوص گروپ کی ایک خفیہ میٹنگ کی تاکہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ مہاراجہ کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے پر کس طرح مجبور کیا جا سکتا ہے۔ ان

رفقاء کار نے براہِ راست حملے کے خیال کو فوری طور پر رد کر دیا۔ پاکستانی فوج کسی صورت بھی کشمیر میں ایسی جنگ شروع کرنے پر تیار نہ تھی جس سے بھارت کے ساتھ جنگ بھڑک اٹھنے کا امکان موجود ہو۔ حملے کے علاوہ مزید دو آپشنز پر غور کیا گیا۔ پہلا منصوبہ سینڈ ہرسٹ (Sandhurst) کے گریجویٹ کرنل اکبر خان جو سازشی ذہن رکھتا تھا، نے پیش کیا۔ اس نے تجویز رکھی کہ کشمیر کی ناراض مسلم آبادی کو بغاوت پر اکسانے کے لئے پاکستان ان لوگوں کو اسلحہ فراہم کرے اور ساتھ مالی مدد بھی دے۔ اس منصوبے کی تیاری کے لئے کئی ماہ درکار تھے لیکن اس کے بعد چالیس سے پچاس ہزار کشمیریوں نے سری نگر میں اترنا تھا تاکہ مہاراجہ کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے پر مجبور کیا جاسکے۔

دوسرا منصوبہ زیادہ پر فریب تھا۔ اس کو شمال مغربی سرحدی صوبے (پختونخواہ) کے وزیر اعلیٰ کی معاونت سے شروع کیا جانا تھا اور اس میں پاکستان کے قبائلیوں کو شریک کیا جانا تھا۔ اس میٹنگ کا اختتام وزیر اعظم کی سخت تنبیہہ سے ہوا کہ اس منصوبے کو مکمل طور پر خفیہ رکھا جائے اور منصوبے کے لئے درکار رقم وزیر اعظم کے خفیہ فنڈ سے دی جائے۔ اس میٹنگ کے مطابق اس خفیہ منصوبے کا علم نہ تو پاکستانی فوج کے افسروں اور سرکاری اہلکاروں کو ہونا تھا اور نہ ہی نومولود ریاست میں خدمات سر انجام دینے والے برطانوی افسروں اور منتظمین کو اس راز تک رسائی فراہم کی جانی تھی۔ میجر جنرل ڈگلس گریسی جو جنرل میسروی کی جگہ پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف بنا تھا، کو 24 اکتوبر 1947ء کو سہ پہر 5 بجے خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹ ملی کہ کشمیر میں کیا ہو چکا ہے۔ رپورٹ میں حملہ آوروں کی تعداد، اسلحے اور ان کے ٹھکانوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ وہ خبر ملتے ہی فوراً اس شخص کے پاس اس کے نجی کمرے میں پہنچ گیا جو اس واحد طاقت کی کمان کر رہا تھا جو کشمیر پر حملہ آوروں کو قبضہ کرنے سے روک سکتی تھی۔ وہ شخص بھارتی فوج کا کمانڈر انچیف جنرل سر راب لاک ہارٹ تھا جو سکاٹ لینڈ کا

باشندہ اور سینڈ ہرسٹ میں گریسی کا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ اپنے اس پرانے دوست کی رپورٹ دیکھ کر لاک ہارٹ ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے اس رپورٹ کو مزید دو برطانوی باشندوں کے پاس پہنچا دیا۔ یہ دو لوگ گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن اور فیلڈ مارشل آچین لیک (Auchinleck) تھے۔

ماؤنٹ بیٹن کو یہ خبر اس وقت ملی جب وہ تھائی لینڈ کے وزیر خارجہ کے اعزاز میں دی جانے والی ایک ضیافت میں شرکت کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ جب سب مہمان چلے گئے تو اس نے نہرو سے رکنے کے لئے کہا۔ جب نہرو نے یہ خبر سنی تو اسے شدید صدمہ پہنچا۔

یہ خبر سننے کے بعد نہرو کا ایک نیا روپ ماؤنٹ بیٹن کے سامنے آیا۔ اس کی بردباد ذہانت جس کی ماؤنٹ بیٹن بہت زیادہ تعریف کیا کرتا تھا کی جگہ ایک جذباتی ردعمل سامنے آیا۔ اس پر اتنی شدید جذباتی کیفیت طاری تھی جسے کشمیری برہمن کنٹرول نہیں کر پا رہا تھا۔

> 'ایک دن نہرو نے اپنے رویے کی وضاحت کرنے کے لئے گلا پھاڑ کر کہا' ''جس طرح کائلے کوئین میری کے دل پر لکھا ہوا تھا اسی طرح کشمیر میرے دل پر لکھا ہے۔'' (11)

اگلے دن رائل انڈین ائرفورس کا ایک ڈی سی 3 طیارہ سری نگر ائیر پورٹ کے ایک متروک گرد آلود رن وے پر اترا۔ اس جہاز میں سرکاری اہلکار وی پی مینن بیٹھا تھا جو اس سے پہلے کئی ریاستوں کا ہندوستان سے الحاق کروا چکا تھا۔ اس کے علاوہ بھارتی فوج کا کرنل سام مانیک شا اور ائیر فورس کا ایک افسر بھی اس جہاز میں بیٹھے تھے۔

جیسے ہی یہ لوگ دہلی واپس پہنچے ان تینوں نے کابینہ کی ڈیفنس کمیٹی کی میٹنگ میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ ان کے لہجے میں افسردگی تھی۔ مہاراجہ ہندوستان کے ساتھ

الحاق کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا لیکن پٹھان حملہ آور سرینگر سے صرف 35 میل دور تھے اور کسی بھی لمحے کشمیر کے واحد ائر پورٹ پر قبضہ کر سکتے تھے جبکہ بھارت کشمیر میں اپنی فوجیں صرف اسی ائر پورٹ کے ذریعے اتار سکتا تھا۔ جب کشمیر پر حملے کی تیاریاں جاری تھیں اس وقت لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وی پی مینن کو جموں کی طرف پرواز کرنے کا حکم دیا۔ مینن اپنے ساتھ الحاق کی دستاویز بھی لے گیا جس پر محض ہری سنگھ کے دستخطوں کی ضرورت تھی جس سے بھارت کو کشمیر پر جارحیت کا قانونی جواز مل جانا تھا۔

> 26 اکتوبر کو اسی اتوار کی شام مینن اپنے دہلی والے گھر میں واپس پہنچ چکا تھا۔ اس کی واپسی کے کچھ منٹ بعد برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر الیگزنڈر سائمن بھی اس کے گھر پہنچ گیا۔ مینن بہت خوش تھا۔ اس نے دو جام شراب سے بھرے۔ اس کی باچھیں کھلی ہوئیں تھیں۔ دونوں نے اپنے جام ایک دوسرے سے ٹکرائے اور محفل کا آغاز کیا۔ مینن نے اپنے کوٹ کی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اور اسے لہراتے ہوئے بولا ''یہ رہا وہ کاغذ، کشمیر ہمیں مل چکا ہے۔ اس حرامی نے الحاق کی دستاویز پر دستخط کر دئے ہیں۔ اب یہ ہمیں مل چکا ہے اور اب ہم کسی قیمت پر اسے اپنے ہاتھوں سے نہیں جانے دیں گے۔ (12)

مہر چند مہاجن پنجاب میں ریڈ کلف باؤنڈری کمیشن کا ممبر رہ چکا تھا۔ ہری سنگھ نے سردار پٹیل کی سفارش پر اسے جموں و کشمیر کا وزیر اعظم مقرر کیا۔ السٹر لیمب (Alistair Lamb) کے خیال میں مہاجن کو اس لئے وزیر اعظم بنایا گیا تھا تا کہ وہ کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کو یقینی بنائے۔ اس تاثر کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ باضابطہ طور پر وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے سے کچھ دیر پہلے مہاجن نے 11 اکتوبر 1947ء کو نئی دہلی کا دورہ کیا جہاں اس نے سردار والا بھائی پٹیل، جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی سے ملاقات کی تھی۔

> ''وی پی مینن (جو ریاستوں کے الحاق کے ضمن میں سردار والا

بھائی پٹیل کا دایاں ہاتھ تھا) نے اس بات کو یقینی بنایا کہ اپنا عہدہ سنبھالنے سے قبل مہاجن کسی اہم پاکستانی سیاستدان یا اہل کار سے ملاقات نہ کر سکے۔''(13)

لیمب لکھتی ہے کہ الحاق کی دستاویز پر دستخط ہونے سے بہت پہلے ہی بھارتی حکومت فوجی مداخلت کی تیاری کر رہی تھی:

سردار والا بھائی پٹیل کے خطوط کی پہلی جلد جو 1971ء میں شائع ہوئی اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سردار والا بھائی پٹیل اور بلدیو سنگھ دونوں ہی جموں اور کشمیر میں کم از کم ستمبر 1947ء تک کسی نہ کسی طرز کی فوجی مداخلت کی منصوبہ بندی کرنے میں مصروف تھے خواہ یہ مداخلت ہنگامی بنیادوں پر ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ اکتوبر کے تیسرے ہفتے تک اس طرح کے آپریشن کے لئے اچھی خاصی بنیادیں تیار کر لی گئیں تھیں۔ مارچ 1951ء میں نہرو نے پارلیمنٹ کے اندر ایک بیان میں تسلیم کیا تھا کہ اگر ہری سنگھ الحاق کی دستاویز پر دستخط نہ بھی کرتا تو بھی بھارت جموں اور کشمیر میں اپنی فوجیں بھیج دیتا، 'الحاق سے قطع نظر ہمارا یہ فریضہ تھا کہ ہم جارحیت کے خلاف کشمیری عوام کا دفاع کرتے۔(14)

26 مارچ 1935ء کو مہاراجہ نے دریائے سندھ کے شمال میں واقع گلگت کی وزارت اور اس پر انحصار کرنے والے علاقے 60 سال کی مدت کے لئے انگریزوں کو ٹھیکے پر دے دیے۔ تاہم اپریل 1947ء میں محض 12 سالوں بعد ماؤنٹ بیٹن نے یہ علاقہ برصغیر کی آزادی سے کچھ ہی دیر پہلے دوبارہ جموں وکشمیر کے براہِ راست کنٹرول میں دے دیا۔ ان علاقوں کی واپسی یکم اگست 1947ء سے موثر ہوئی۔ ہری سنگھ کا گورنر بریگیڈئیر گنشارہ سنگھ اس تبدیلی اقتدار سے صرف ایک دن قبل گلگت پہنچا۔ مقامی آبادی، جس سے اس تبدیلی کے بارے میں کوئی مشورہ نہیں کیا گیا تھا، دوبارہ ڈوگرہ حکومت کے زیر اثر جانے کی کوئی خواہش نہیں رکھتی تھی۔ مقامی

فوج اور گلگت سکاؤٹس بھی اسی قسم کے جذبات رکھتی تھیں۔ ممکنہ بغاوت اور پٹھان قبائل کی در اندازی کے خطرے کے پیش نظر گلگت سکاؤٹس کے برطانوی افسر میجر براؤن نے یہ سارا علاقہ پاکستان کے کنٹرول میں دے دیا۔ گنشارہ سنگھ کو اس کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا اور 3 نومبر 1947ء کو براؤن نے گلگت کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔

بغاوت اور پہلی پاک بھارت جنگ

23,24 اکتوبر 1947ء کی رات کو قبائلی پٹھان دریائے جہلم پار کر کے کشمیر میں داخل ہوئے۔ سرینگر کی طرف پیش قدمی کرنے کی بجائے وہ مظفر آباد اور گرد و نواح کے علاقوں میں لوٹ مار کرنے لگے۔ منصوبے کے مطابق انہیں 26 اکتوبر تک سرینگر پر قبضہ کرنا تھا تاکہ عید کی تقریبات کو رونق بخشی جا سکے۔ تاہم مقررہ وقت تک یہ فوج صرف بارہ مولا تک پہنچ پائی (اگر چہ وہ کشمیر کے دارلحکومت کو بجلی کی سپلائی منقطع کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے)۔ لیکن اس سے بھارتی فوج کو وہ قیمتی وقت ہاتھ لگ گیا جس میں انہوں نے اپنے فوجی دستے جمع کر لئے اور حملہ آوروں کو سرینگر پہنچنے اور آگے بڑھنے سے روک لیا۔ یوں برصغیر کے مقدر نے ایک حیران کن کروٹ لی۔ کشمیر کے دو تہائی سے زیادہ علاقے پر بھارت نے قبضہ کر لیا اور باقی ماندہ ایک تہائی جو زیادہ تر سنگلاخ بنجر علاقہ تھا پاکستان کے کنٹرول میں آ گیا۔

بھارتی فوجی دستوں نے، جنہوں نے کشمیر کا دفاع کرنے والے نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کی جگہ لی تھی، سرینگر پر قبضے سے پہلے ہی قبائلیوں یا پاکستان کی پیش قدمی روک ڈالی۔ انہوں نے جوابی حملہ کر کے بارہ مولا پر بھی قبضہ کر لیا۔ جب بھارت نے جموں کشمیر میں اپنی فوج بھیجی تو پاکستان کے گورنر جنرل ایم۔ اے۔ جناح نے بھی اپنے ملک کی باقاعدہ فوج کو کشمیر بھیجنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن اس خواہش کو

پاکستان کے قائمقام کمانڈر انچیف جنرل ڈگلس گریسی نے پورا ہونے سے روک دیا کیونکہ اسے یہ خوف تھا کہ اس سے ان دونوز ائیدہ ریاستوں میں جنگ چھڑ جائے گی (دونوں فوجوں کی سپریم کمان ابھی ایک ہی تھی)۔ جناح نے اب بھی ''آزاد کشمیر'' میں موجود پاکستان کی حامی طاقتوں کو مدد فراہم کرنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر اس نے پاکستان کی باقاعدہ فوج کے ''رخصت پر گئے ہوئے'' ملازمین سے گزارش کی کہ وہ واپس آجائیں۔ مئی 1948ء میں گریسی اپنے سابقہ موقف سے منحرف ہو گیا اور پاکستان نے ''سرکاری طور پر'' اپنی افواج جموں و کشمیر میں بھیج دیں۔

حملوں اور جوابی حملوں کے ایک سلسلے کے بعد پاکستان نے گلگت (جس نے 3 نومبر 1947ء کو اس ملک سے ''الحاق'' کرلیا تھا) بلتستان، وادی کا کچھ حصہ، پونچھ کے زیادہ تر علاقے اور جموں کے میر پور کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ بھارتی فوج نے لداخ، جموں اور کشمیر کے صوبوں کے زیادہ تر علاقے اور پونچھ کے تھوڑے سے علاقے پر اپنا تسلط جما لیا۔ اس بات کا خدشہ پیدا ہو گیا کہ 1948ء کے اختتام تک وہ جنگ جو اب تک محض جموں اور کشمیر تک محدود تھی وہ ''باقاعدہ'' بھارت اور پاکستان تک پھیل سکتی ہے۔ اس قسم کی وسیع جنگ سے بچنے کے لئے جنگ بندی کا اعلان کیا گیا جس میں کسی حد تک اقوام متحدہ کی مداخلت بھی شامل تھی۔ اس جنگ بندی کا اطلاق یکم جنوری 1949ء کو ہوا۔ 27 جولائی 1949ء کو پاکستان اور بھارت کے فوجی نمائندوں کے درمیان ہونے والے معاہدے میں جنگ بندی لائن کی وضاحت کی گئی اور 1965ء کی پاک بھارت جنگ تک اس میں کوئی تبدیلی رو نما نہ ہوئی۔

جنگ کے اختتام پر جموں کشمیر کی ریاست تین مختلف انتظامی علاقوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ پہلا علاقہ جو گلگت اور بلتستان (شمالی علاقہ جات) پر مشتمل تھا براہ راست پاکستان کے کنٹرول میں تھا۔ ان علاقوں کو خاص مقاصد کے تحت پاکستان کے ساتھ

شامل کیا گیا تھا۔ دوسرا علاقہ جو آزاد کشمیر کے نام سے مشہور ہے اس میں صوبہ کشمیر کا ایک حصہ، پونچھ کا زیادہ تر علاقہ اور جموں کا ضلع میر پور شامل تھا۔ اس علاقے کو ایک غیر متحد گروہ کنٹرول کرر ہا تھا۔ اس گروپ میں پونچھ کے مسلمان (زیادہ تر سدھن) اور مسلم کانفرنس کے میر واعظ یوسف شاہ اور غلام عباس جیسے سابقہ دور کے جلاوطن شامل تھے۔ کاغذوں میں آزاد کشمیر خود مختار تھا یعنی کہ یہ پاکستانی ریاست کا حصہ نہیں تھا۔ لیکن عملی طور پر اس کے پاکستان کے ساتھ گہرے روابط تھے اور معاشی اور دفاعی اعتبار سے یہ کراچی (اس وقت کے پاکستان کا دارلحکومت) پر انحصار کرتا تھا۔ اس قسم کے تعلقات کے باعث اس میں ایک علیحدہ ریاست کی حیثیت سے کام کرنے کی صلاحیت انتہائی محدود تھی۔

ریاست کشمیر کا تیسرا حصہ وہ تھا جس پر بھارتی فوج کا قبضہ تھا۔ شیخ عبداللہ جو کہ نیشنل کانفرنس کا راہنما تھا اس کو نہرو حکومت نے ستمبر میں ہری سنگھ کی جیل سے رہائی دلائی تھی اور اب وہ نہرو کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ اس نے بھی یہ رائے دی تھی کہ کشمیر کو ''محفوظ'' بنانے کے لئے بھارتی افواج کو بھیجا جائے۔

اکتوبر 1947ء میں ہندوستان کے ساتھ الحاق کی دستاویز کی شرائط کے مطابق مہاراجہ ہری سنگھ نے شیخ عبداللہ کو ہنگامی حکومت کا سربراہ مقرر کیا۔ اگر چہ ہرچند مہاجن وزیراعظم کی حیثیت سے کام کرتا رہا تاہم اصل طاقت عبداللہ کے ہاتھ میں تھی۔ جون 1949ء میں مہاراجہ کو اس بات پر'' آمادہ'' کیا گیا کہ وہ اپنے بیٹے کرن سنگھ کو اپنا نائب مقرر کرے اور خود کشمیر سے نکل جائے۔ اس طرح مہاراجہ ہمیشہ کے لئے بھارت میں جلاوطن ہو گیا۔

قانونی جواز کا دکھلاوا

31 اکتوبر 1947ء کو شیخ عبداللہ کو کشمیر کی نئی حکومت کا سربراہ بنایا گیا۔ اس

حکومت میں اس کے قریبی ساتھی مرزا افضل بیگ، بخشی غلام محمد، شام لال صراف اور جی ایم صادق شامل تھے۔ عبداللہ بھارت کا اتنا مطیع تھا کہ 5 نومبر کو ''ہندوستان ٹائمز'' میں چھپنے والے ایک انٹرویو میں اس نے کہا:

''پاکستان کی قبر وادی کشمیر میں کھودی جائے گی۔''(15)

نہرو کشمیر پر بھارتی موقف کے قانونی جواز پر پُر اعتماد تھا اور اسی بنا پر وہ 31 دسمبر 1947ء کو اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں لے گیا۔ بعد میں اسے اس فیصلے پر افسوس کرنا پڑا۔ بھارتی آئین کے آرٹیکل 370 کے تحت کشمیر کو مخصوص حیثیت دے دی گئی۔ نیشنل کانفرنس کی مقبولیت کے پیش نظر ،جس نے 1951ء کے انتخابات میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی تھی، نہرو اور عبداللہ کو یقین تھا کہ اگر کشمیر میں ریفرنڈم کروایا گیا تو یہ بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرے گا۔ یہی وہ وجہ تھی کہ نہرو نے اقوامِ متحدہ کی کشمیر میں استصوابِ رائے کی قرارداد تسلیم کر لی تھی۔

جب دسمبر 1947ء کے آخر میں نہرو اور پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی دہلی میں ملاقات ہوئی تو نہرو نے لیاقت علی خان کو بتایا کہ وہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل 35 کے تحت یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں لے جائے گا۔ اس شق کے مطابق کوئی بھی رکن ملک ''کسی بھی ایسی صورتحال کو سلامتی کونسل میں پیش کر سکتا ہے جس کے جاری رہنے سے عالمی امن کو خطرہ لاحق ہو''۔ لیاقت علی خان پاکستان کی جانب ملزمانہ لہجے سے ناخوش تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے یہ قبول کرنا ہی پڑے گا اور یہ کہ جتنی جلد یہ معاملہ اقوام متحدہ میں جائے گا اتنا ہی بہتر ہے۔

31 دسمبر 1947ء کو نہرو نے اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کو باضابطہ مراسلہ ارسال کیا۔ جنوری 1948ء میں نیو یارک کے مقام لیک سکسیس (Lake Success) میں کشمیر کے مسئلے پر اقوام متحدہ میں بحث ہوئی جس میں بھارت اور پاکستان دونوں کے نمائندے موجود تھے۔ 16 جنوری 1949ء کو پاکستانی وزیر

خارجہ سر ظفر اللہ خان کی پاکستان کے موقف کی حمایت اور کشمیر پر ڈوگرہ حکمرانی کے تسلسل کے خلاف پانچ گھنٹے کی تقریر کے باعث بھارت کو شدید خفت کا سامنا کرنا پڑا۔

> جس بات کا مکمل طور پر ادراک نہیں کیا جا سکا وہ یہ ہے کہ ایک صدی پر محیط ڈوگرہ حکمرانی کے ظلم اور جبر کے راج کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا ہے کہ ایک کشمیری کے لئے زیادہ بڑا المیہ کیا ہے، اس کی زندگی یا اس کی موت۔(16)

20 جنوری 1948ء کو سلامتی کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جس کے تحت ایک کمیشن تشکیل دیا گیا جو اقوام متحدہ کا کمیشن برائے پاک و ہند (یو این سی آئی پی) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کمیشن کی ذمہ داری لگائی گئی کہ

> وہ اس تنازعے کے بارے میں حقائق معلوم کرے اور ''کسی طرح کا مصالحتی کردار'' ادا کرے جس سے مسائل کو حل کرنے کا امکان پیدا ہو سکے۔(17)

21 اپریل 1948ء کو ایک اور قرارداد منظور کی گئی جس میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ:

> ''ریاست جموں و کشمیر سے قبائیلیوں اور ایسے پاکستانی شہریوں کی واپسی یقینی بنائے جو وہاں کے شہری نہیں ہیں اور جو وہاں لڑائی کی غرض سے داخل ہوئے ہیں۔''(18)

> بھارتی حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ:

> ''وہ اپنی فوجوں کی تعداد کم کر دے تاکہ پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کے مسئلے پر استصواب رائے کرایا جا سکے۔''(19)

13 اگست 1948ء کو یو این سی آئی پی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں ایک بار پھر اس بات کا اعادہ کیا گیا تھا کہ جموں و کشمیر کی مستقبل میں حیثیت کے حوالے سے حتمی فیصلہ:

''عوام کی مرضی کے مطابق کیا جائے گا۔'' (20)

نہرو پہلے ہی ان خطوط پر تقسیم کی باتیں کر رہا تھا جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے یعنی کہ مغربی پونچھ، گلگت، چترال اور بلتستان کا زیادہ تر علاقہ پاکستان کو دے دیا جائے۔ تاہم جناح کی وفات کے بعد پاکستان کے نمائندے لیاقت علی خان کے لئے یہ تجویز ناقابل قبول تھی۔

آخر کار یکم جنوری 1949ء کو جنگ بندی کی دستاویز پر دستخط کئے گئے۔ اس دستاویز پر پاکستان کی طرف سے جنرل گریسی اور بھارت کی طرف سے جنرل رائے بچر (Roy Bucher) نے دستخط کئے۔ یعنی دو برطانوی افسروں نے ان دو ممالک کی طرف سے دستخط کئے جنہیں 16 مہینے پہلے انگریزوں سے آزادی مل چکی تھی۔

بھارت آرٹیکل 35 کے تحت یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں لے کر گیا تھا۔ اس قانون کے تحت اقوام متحدہ محض تجاویز دے سکتی تھی، اس کے پاس حل مسلط کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

آج کی طرح اس وقت بھی بھارت کی حکومت اکتوبر 1947ء کی الحاق کی دستاویز کی بنیاد پر کشمیر پر اپنے قبضے کو قانونی سمجھ رہی تھی۔ یہ وہی دستاویز تھی جس پر مہاراجہ ہری سنگھ اور اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے دستخط کئے تھے۔

> ''ریاست کا حکمران ۔۔۔ اگر چاہے تو الحاق کی ایسی دستاویز پر دستخط کر سکتا تھا جس کے ذریعے وہ متعلقہ ریاست کو تین کلیدی شعبے منتقل کرے گا جن میں دفاع، خارجی امور اور مواصلات شامل ہیں۔'' (20)

دوسری طرف ریاست جموں و کشمیر نے 15 اگست 1947ء کو پاکستان کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کئے تھے جس کے تحت وہ کسی دوسرے ملک کے ساتھ کسی

قسم کے مذاکرات یا معاہدہ نہیں کر سکتی تھی۔

1947ء کے معاہدوں کی شقوں کے مطابق کسی بھی ایسی ریاست کے لئے یہ ممکن تھا کہ جب وہ الحاق پر غور کر رہی ہو یا وہ الحاق کے عمل سے گزر رہی ہو اور بعض مخصوص مسائل ابھی حل طلب ہوں تو وہ ایک یا دونوں مملکتوں کے ساتھ معاہدہ قائمہ (Stand still) کر سکتی تھی۔ اس سے بنیادی سہولیات کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا اگرچہ اس وقت اس کی آئینی بنیادیں غیر یقینی کا شکار ہوں گی۔

اکتوبر 1963ء میں پاکستان مسئلہ کشمیر کو دوبارہ اقوام متحدہ میں لے گیا اور 1964ء کی بہار میں مسئلہ کشمیر پر 15 سالوں میں 110 ویں بار بحث ہوئی۔

یہ حقیقت ہے کہ کشمیر کے حوالے سے اقوام متحدہ کی بے شمار قراردادوں میں سے کسی ایک میں بھی ''تیسرے آپشن'' یعنی کشمیریوں کی آزادی کا ذکر نہیں ہے۔ 1950ء اور 60 کی دہائی میں ابتدائی نوعیت کی سفارتی کوششیں کرنے کے بعد اقوام متحدہ کشمیر کا مسئلہ حل کرنے سے دور رہی ہے۔

اقوام متحدہ پر اعتماد کرنا کہ یہ کشمیر کا مسئلہ حل کر سکتی ہے اور کشمیریوں کو آزادی دلا سکتی ہے آزادی کی اس عظیم جدوجہد سے غداری ہے جو کشمیر کے عوام کئی نسلوں سے لڑتے آرہے ہیں۔ یہ پالیسی شکست خوردگی پر مبنی ہے جو آزادی کی تحریک کو پرامن رکھنے کے لئے اور موجود صورتحال کو برقرار رکھنے کے لئے اپنائی جاتی ہے۔

عظیم یونانی فلسفی سولان نے ایک بار کہا تھا:

> ''قانون مکڑی کے جالے کی طرح ہوتا ہے، کمزور اور نحیف چیزیں اس میں پھنس جاتی ہیں جبکہ بڑی طاقتور چیزیں اسے پھاڑ کر گزر جاتی ہیں۔'' (22)

بین الاقوامی سرمایہ دارانہ قانون اور نام نہاد اقوام متحدہ کے کردار پر یہ بات اور بھی زیادہ صادق آتی ہے۔ یہ قانونی اور سفارتی منافقت کی علامت ہے۔ لینن

نے لیگ آف نیشنز کو ''چوروں کا باورچی خانہ'' کہا تھا۔اقوام متحدہ کی اگر کوئی حیثیت ہے تو وہ سب سے بڑے دھوکہ باز کی ہے۔

اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر سب سے پرانا حل طلب مسئلہ کشمیر کا ہے۔ یہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا۔اسرائیل کی طرف سے فلسطینیوں کی زمین پر قبضے اور ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف 218 قراردادیں منظور کی جا چکی ہیں۔ان میں سے کسی ایک قرارداد پر بھی عملدرآمد نہیں کیا جا سکا۔

عراق پر حالیہ سامراجی یلغار اقوام متحدہ کے خصی پن کی ایک واضح مثال ہے۔اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کرہ ارض پر موجود زیادہ تر تنازعات کا سرمایہ دارانہ بنیادوں پر کوئی حل موجود نہیں ہے۔اس لئے دھوکہ دہی یا تاخیری حربے کے طور پر لاغر قیادتیں انہیں اقوام متحدہ میں لے جاتی ہیں۔کشمیر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔سامراجی اور رجعتی سرمایہ دارانہ ریاستیں اقوام متحدہ کو مالی امداد مہیا کرتی ہیں۔ یہ ادارہ ان سامراجی ریاستوں کے مفادات سے کیسے ٹکرا سکتا ہے یا ان کے مذموم مقاصد کے خلاف کوئی فیصلہ کیسے کر سکتا ہے؟ یہ ادارہ تو محض ایک کلب ہے جہاں وہ جابر حکومتیں آپس میں گپ شپ کرتی ہیں جو استحصالی نظام کے ذریعے حکمرانی کر رہی ہیں۔ماضی میں اقوام متحدہ سامراج اور سٹالنزم کے درمیان ایک فرسودہ سمجھوتہ تھا اور اب یہ سامراج خاص کر امریکی سامراج کی معاشی اور فوجی جارحیت کو درست قرار دینے اور قانونی جواز فراہم کرنے کا آلہ ہے۔

کشمیر کی آزادی اقوام متحدہ کی قراردادوں یا سامراجی آقاؤں کی خیرات کی صورت میں حاصل نہیں ہو گی۔یہ کشمیری عوام کی اس انقلابی جدوجہد کے نتیجے میں حاصل ہو گی جو وہ اتنے طویل عرصے سے عزم اور حوصلے سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ان تمام قربانیوں کے ساتھ ان کے پاس جدوجہد کا ایک وسیع تجربہ ہے۔اسی سے وہ آزادی حاصل کرنے کی اصل راہ ڈھونڈ نکالیں گے۔

باب نمبر 5

سنگینوں سے ٹپکتا لہو

سپاہیوں کا رویہ چاہے جس قدر بھی بدنام ہو یہ ایک مجتمع شدہ شکل میں برطانیہ کے بھارت میں اپنے رویے کا آئینہ دار ہے، نہ صرف اس عہد میں جب وہ اپنی مشرقی سلطنت کی بنیاد رکھ رہا تھا بلکہ اپنی طویل اقامتی حکمرانی کے گزشتہ دس سالوں کے دوران بھی۔ اس حکمرانی کے کردار کو بیان کرنے کیلئے یہی کہنا کافی ہے کہ اذیت اس کی مالیاتی پالیسی کا ایک عضویاتی ادارہ تھا۔ انسانی تاریخ میں ایک چیز ہے جسے مکافات عمل کہا جاتا ہے اور تاریخی مکافات عمل کا یہ قانون ہے کہ اس کا اوزار مظلوم نہیں بلکہ خود ظالم تیار کرتا ہے۔

کارل مارکس (1)

جمہوری آمریت

شیخ عبداللہ کی بھارتی حکمرانوں کے ساتھ مصالحت کے باوجود بھارت کے سیکولرازم اور جمہوریت کا پردہ جلد ہی چاک ہوگیا۔ شیخ عبداللہ تو ڈوگرہ شاہی کے حوالے سے اپنے موقف سے بھی منحرف ہوگیا تھا۔ وہ ایک ایسی حکومت میں کام کررہا

تھا جس کا سربراہ چاہے برائے نام ہی سہی، ہری سنگھ کا بیٹا ڈاکٹر کرن سنگھ تھا۔ جن کے خلاف کشمیری عوام ایک طویل عرصے سے جدوجہد کر رہے تھے۔ بھارت کی سرمایہ دارانہ ریاست کا سیکولرازم، جمہوریت اور انسانی مساوات کا نقاب تیزی سے اتر رہا تھا۔ بھارت کے حکمران طبقے میں قومی شاونزم اور ہندوانہ تعصب عیاں ہوتا جا رہا تھا۔ نہرو کا ذاتی دوست اور گاندھی کے سیکولرازم کا مداح ہونے کے باوجود اب عبداللہ کو بھارتی بورژوازی کا اصل کردار نظر آنے لگا۔ ان کے جارحانہ سامراجی عزائم اس کیلئے صدمے کا باعث بنے۔

جلد ہی اس کے ذہن میں شکوک وشبہات جنم لینے لگے۔ شیخ عبداللہ اس بات پر غور کرنے لگا کہ کیا کشمیر کو ایک حد تک آزادی کا مطالبہ کرنا چاہیے، چاہے یہ محدود پیمانے کی آزادی ہی ہو، جس سے یہ بات یقینی ہو جائے گی کہ کشمیر بھارت کا 'غلام' نہیں بنے گا۔ (2)

حقیقت یہ ہے کہ دہلی کی حکومت میں ہندو جنونیت کے آثار پہلے ہی عیاں تھے۔ اس کا ایک جزوی سبب عبداللہ کی کشمیر کی آزادی کی مدتوں پرانی خواہش اور امریکیوں اور انگریزوں کا کردار تھا جو اس طرح کے خیالات کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ برطانوی اور امریکی سامراجی کشمیر کے جغرافیائی محل وقوع کی سٹریٹیجک اہمیت سے آگاہ تھے جو پانچ طاقتور ملکوں کے درمیان واقع تھا۔

شیخ صاحب نے اب کشمیر سے پاکستانی فوجوں کی واپسی اور بھارت کی طرف سے اسے غیر فوجی علاقہ قرار دینے کی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ رائے شماری کا وعدہ پورا کیا جائے گا جو اقوام متحدہ کی طرف سے منعقد کروائی جائے گی۔ بعد میں جب اس نے یہ محسوس کیا کہ نہ ہی بھارت اور نہ پاکستان کشمیر چھوڑنے پر تیار ہیں تو اس نے مستقبل کے حوالے سے ایک مختلف چیز کی وکالت شروع کر دی: یہ پاکستان، بھارت اور کشمیر کی کنفیڈریشن تھی۔ مستقبل کے حوالے سے یہ وہ

تجویز تھی جو 1946ء میں کیبنٹ مشن نے پیش کی تھی۔ اس کنفیڈریشن میں مرکز کے پاس محدود اختیارات ہونے تھے اور ریاستوں کو بھرپور خودمختاری دی جانی تھی۔ نہرو نے اس خیال کو مسترد کر دیا تھا اور اس کی بجائے ''غیر منقسم'' ہندوستان کا مطالبہ کیا تھا۔

بھارتی حکمران چاہتے تھے کہ شیخ صاحب بہتر رویہ اپنائیں۔ وہ اپنی کٹھ پتلی کو ان متعین حدود سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے جن کے اندر رہ کر اس نے کام کرنا تھا۔

کچھ جاگیردارانہ عناصر کیلئے شیخ صاحب کی شخصیت ان زرعی اصلاحات کی وجہ سے قابل نفرت تھی جو اس نے 1947ء میں اپنے اقتدار کے ابتدائی دنوں میں کی تھیں۔ ان زرعی اصلاحات کا ایک مذہبی پہلو بھی تھا کیونکہ مسلمان مزارعین کو ملنے والی زیادہ تر زمین کشمیر کے ہندو جاگیرداروں کی تھی۔

1952 میں نہرو اور عبداللہ نے وہ سمجھوتہ کیا جو دہلی کے معاہدے کے نام سے مشہور ہوا۔ شیخ صاحب نے ایک بار پھر تعلقات کو جوڑنے کی کوشش کی۔ مذاکرات کے اختتام پر نہرو نے شیخ صاحب سے کہا'' پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہم آپ کو سونے کی زنجیروں کے ساتھ باندھیں گے''۔ بعد میں شیخ عبداللہ نے اس قول کے بارے میں کچھ یوں لکھا:

> کس طرح محض ایک سال بعد سونے کی زنجیروں کی جگہ ان میں سے ایک کی کلائی پر ہتھکڑی نے لے لی؟ شیخ صاحب کی وضاحت یہ تھی کہ 'رجعتی عناصر دہلی تک اچھی خاصی رسائی رکھتے تھے' نہرو کے دربار تک نہیں لیکن یقینی طور پر کسی اور مقام تک۔ سردار پٹیل اور دیگر کئی لوگ میرے اوپر قطعاً بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ پہلے تو نہرو نے میرے خلاف ہرزہ سرائی کی مہم کی مخالفت کی لیکن بالآخر وہ ہار مان گیا۔ (3)

شیخ صاحب حکومت کے دباؤ اور سماجی نظام کے تقاضوں سے لاعلم ہوتے ہوئے

بے وقوفی میں نہرو کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ 1952ء کے آخر میں کئی ایک تنظیمیں جموں میں شیخ مخالف احتجاج شروع کرنے کیلئے متحد ہو گئیں۔نئی بنائی گئی تنظیم جانا سنگھ میں درج ذیل تنظیمیں شامل تھیں: سیاما پرساد مکرجی کی ہندو مہا سبھا، راشٹریہ ساوا یام سیوک سنگھ، جموں پراجا پریشد، یہ تمام ہندو پارٹیاں تھیں اور سکھ اکالی دل جس کی قیادت ماسٹر تارا سنگھ جیسا بدمعاش کر رہا تھا۔نہرو اس رجعتی احتجاج کو کچلنے میں قطعاً غیر موثر ثابت ہوا۔ اس کی عدم صلاحیت اور عدم دلچسپی ہندوستان کی حکمران اشرافیہ کے کردار کی بھی وضاحت کر رہی تھی۔مکرجی کی عنصر کے تقویت حاصل کرنے کے امکانات کے باعث نیشنل کانفرنس کے اندر ہندو جنونیت کے حوالے سے خوف کے شعلے بھڑک اٹھے۔

کشمیر کے مقدر پر حتمی کنٹرول برقرار رکھنے کا خیال تقویت پکڑتا گیا۔ دہلی کے آگے ہتھیار ڈال دینے سے یہ راستہ زیادہ بہتر تھا۔شیخ صاحب نے بھارتی یونین کے اندر رہتے ہوئے ''خوداختیاری'' کی باتیں کرنا شروع کر دیں۔نہرو کو یقین تھا کہ اس طرح کی باتوں کی حوصلہ افزائی امریکہ کر رہا ہے۔

مارچ 1953ء میں شیخ عبداللہ کو ہٹانے کی سازش کا آغاز ہوا۔جس آدمی نے بروٹس (شکسپیئر کے ایک ڈرامے کا ولن) کا کردار ادا کرنا تھا وہ کشمیر کا ڈپٹی وزیراعظم بخشی غلام محمد تھا۔اسی سال جون میں مکرجی نے ضروری اجازت نامہ لیے بغیر جموں میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ بجائے اس کے کہ پنجاب حکومت کے اہل کار مکرجی کو جموں جانے سے روکتے وہ اس کے ساتھ گئے اور سرحد پار کرنے میں اس کی مدد کی۔جس شخص پر نہرو نے غداری کے حق میں احتجاج کرنے والوں کی راہنمائی کرنے کا الزام لگایا تھا اسے خود نہرو کی اپنی انتظامیہ سے مدد مل رہی تھی۔

عبداللہ کی حکومت نے مکرجی کو گرفتار کر لیا اور جیسا کہ قسمت کو منظور تھا وہ جیل میں دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا۔ 10 جولائی کو شیخ صاحب نے ایک تقریر کی جس کو یہ

ثابت کرنے کیلئے استعمال کیا گیا کہ وہ اب بھارت کا ''غدار'' بن گیا تھا۔ نیشنل کانفرنس کے ہیڈکوارٹر مجاہد منزل میں شیخ عبداللہ سے یہ بیان منسوب کیا گیا۔

''وہ فت آ سکتا ہے جب کشمیر کو سیکولر بھارت کو 'خدا حافظ' کہنا پڑے گا''۔(4)

8 اگست 1953ء کو مہاراجہ ہری سنگھ کے بیٹے کیرن سنگھ نے برطرفی کا حکم نامہ ڈرافٹ کیا:

(میں) شیخ محمد عبداللہ کو ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم کے عہدے سے برطرف کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی وزراء کی وہ کونسل جس کی وہ سربراہی کررہا تھا بھی برطرف کی جاتی ہے۔(5)

شیخ عبداللہ کو آدھی رات کے وقت اس وقت گرفتار کرلیا گیا جب وہ گلمرگ کے پرفضا مقام پر سو رہا تھا۔ اخبارات میں خبر چلی کہ۔

''ہندوستان بچالیا گیا: شیخ عبداللہ کو عین اس وقت گرفتار کرلیا گیا جب وہ طوفانی رات کو سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہو رہا تھا۔''(6)

آزادی کے محض پانچ سال بعد کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کے ایک انتہائی کٹر حامی، محرک اور سیاسی کارکن کو جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے عزیز ترین دوست جواہرلال نہرو نے ''قومی مفاد'' کو بہانہ بنا کر یہ سب کچھ ہونے دیا۔

1948ء میں جب عبداللہ وزیر اعظم بنا تو اس نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا

''ہم نے بھارت کے ساتھ کام کرنے اور اس کے ساتھ مرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''(7)

ایم جے اکبر لکھتا ہے:

ہندوستان بھر کے سیاستدانوں حتیٰ کہ حزب مخالف کے سیاستدانوں پر بھی عجیب وغریب خاموشی طاری تھی۔ قوم میں اعتماد کا واضح فقدان تھا'

ایک ایسا گمان تھا کہ غالباً تحفظ اور استحکام کیلئے یہ قیمت ناگزیر تھی۔ حتیٰ کہ سوشلسٹ لیڈر رام منوہر لوہیا جس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ نہرو پر ہر حوالے سے تنقید کرے گا۔ اس نے بھی اس صورتحال کا تعین کرنے سے گریز کیا۔ 1958ء میں حکومت ہندوستان نے اعلان کیا کہ اب رائے شماری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (8)

1978ء میں شیخ عبداللہ نے ایک انٹرویو میں کہا

1953ء میں جیل کے تجربے کے دوران سیکولرازم، جمہوریت اور سوشلزم پر ہمارا ایمان کڑی آزمائش سے دوچار ہوا۔ اس وقت میرے ساتھیوں نے جیل میں مجھ سے کہا: اب کیا باقی بچا ہے؟ اگر نتیجہ یہ ہے تو پھر ہم بھارت کے ساتھ کیوں جائیں؟ ہمیں پاکستان کے ساتھ جانا چاہیے۔ شیخ صاحب نے بار بار یہ کہا کہ ''ان کا مذہب جناح کے ساتھ مشترک تھا لیکن ان کا خواب نہرو کیساتھ مشترک تھا۔'' (9)

یہ خواب پانچ سال کی قلیل مدت میں چکنا چور ہو گیا تھا۔

سفارتکاری، جنگ اور انقلاب

1962ء کی چین، بھارت جنگ کے مسئلہ کشمیر پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ جب ہندوستان کی فوج ہمالیہ میں مار کھا رہی تھی تو امریکی اور برطانوی سامراج نے ایوب خان کو کشمیر کا محاذ کھولنے سے باز رکھا۔ تاہم، جنگ بندی اور غیر متوقع طور پر چین کی طرف سے اپنی افواج کو واپس بلا لینے کے بعد نہرو پر برطانیہ اور امریکہ کی طرف سے دباؤ ڈالا گیا کہ وہ پاکستان کے ساتھ مسئلہ کشمیر حل کرے۔

دسمبر 1962ء میں راولپنڈی، دہلی، کراچی اور کلکتہ میں بھارت اور پاکستان کے درمیان مذاکرات کا ایک طویل دور شروع ہوا جو مارچ 1963ء تک جاری رہا۔ بھارت پاکستان کو 1500 مربع میل کا مزید علاقہ دینے پر رضامند تھا بشرطیکہ

پاکستان نئی سرحدوں کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کر لے۔ لیکن بھارت کے ساتھ مذاکرات شروع ہونے سے محض ایک دن قبل پاکستانی حکومت نے چین کے ساتھ ایک عبوری سرحدی معاہدے کا اعلان کیا جس کے تحت اس نے کشمیر کا ایک بہت بڑا اور بنجر لیکن دفاعی حکمت عملی کے اعتبار سے اہم علاقہ چین کو دے دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جو اس وقت پاکستان کا وزیر خارجہ تھا ایک غیر رسمی گفتگو میں ہندوستانی سفارتکاروں کو بتایا:

> آپ کو نظر نہیں آ رہا ہے کہ آپ ایک شکست خوردہ قوم ہیں؟(10)

''تاریخی امن مذاکرات'' ناکام ہو گئے۔

نہرو نے اس خیال پر دوبارہ غور کرنا شروع کر دیا جو اس نے 1946ء میں مسترد کر دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بھارت' پاکستان' کشمیر اور مشرقی بنگال پر مشتمل ایک چار طرفہ یونین تشکیل دی جائے۔ خیال یہ تھا کہ ایک ایسی کنفیڈریشن تشکیل دی جائے جس میں دفاع' خارجہ اور مواصلات کی پالیسی مشترک ہو۔ نہرو کا خیال تھا کہ اس سے کشمیر کی تحریک ختم ہو جائے گی۔ 1964ء میں شیخ عبداللہ کی رہائی کے بعد نہرو نے اسے مذاکرات کی دعوت دی۔ کنفیڈریشن کے نظریے پر اسے قائل کرنے کے بعد اسے پاکستان بھیجا گیا تا کہ وہ وہاں کی حکومت کے سامنے اس کی بولی لگائے۔ عبداللہ 24 مئی 1964ء کو پاکستان پہنچا۔ ایک بار پھر کوئی سمجھوتہ نہ ہو پایا۔ شیخ صاحب کی کامیابی محض یہ تھی کہ اس نے ایوب خان کو مزید مذاکرات کیلئے بھارت کا دورہ کرنے پر راضی کر لیا۔ یہ دعوت خاموشی کے ساتھ لکھی گئی اور پاکستان میں بھارتی ہائی کمیشن تک پہنچا دی گئی تا کہ 27 مئی 1964ء کو ایوب خان کے حوالے کی جائے۔

تاہم اسی دن جواہر لال نہرو فوت ہو گیا۔ اس سے ایک اور جمود آ گیا اور بھارت اور پاکستان کے داخلی بحران شدت اختیار کر گئے۔ دونوں ممالک میں

انقلاب کھول رہے تھے۔ داخلی اور خارجی محاذوں پر تضادات ایک دھماکہ خیز صورتحال کے دہانے پر کھڑے تھے۔ دونوں ملکوں کے حکمران جنگ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ان کے داخلی اور خارجی مسائل حل ہو جائیں گے۔ ایوب کی حکومت نے، جسے 1962ء میں چین کے ساتھ ہونے والی جنگ میں بھارتی شکست کے سبب ضرورت سے زیادہ اعتماد ہو گیا تھا، بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ''مجاہدین'' داخل کئے۔ یہ جارحیت بے قابو ہوگئی اور 6 ستمبر 1965ء کو بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک بھرپور جنگ چھڑ گئی۔ کشمیر میں ہونے والی جارحیت کے جواب میں بھارتیوں نے لاہور کے نزدیک بین الاقوامی سرحد پر حملہ کر دیا۔ 17 دن تک جاری رہنے والی جنگ کے بعد درحقیقت کوئی بھی جنگ نہیں جیت پایا تھا اور تاشقند کا اعلامیہ محض ایک اور سطحی حل تھا۔ کشمیر کے مسئلے کے حوالے سے کوئی حقیقی معاہدہ یا حل نہیں نکلا تھا اور یہ دونوں طرف کے مظلوم عوام ہی تھے جنہیں اس جنگ کا بوجھ اور تباہ کاریاں برداشت کرنا پڑیں۔

1965ء کی جنگ کی شکست وریخت کے بعد پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصوں میں ایک انقلابی جدوجہد ابھر پڑی۔ 1968-69ء کی تحریک میں پاکستان کے اندر ایک سوشلسٹ انقلاب کا سنجیدہ امکان موجود تھا اور اس کے اثرات سے برصغیر کے تمام حصوں میں انقلابات بھڑک سکتے تھے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ پاکستان میں کوئی حقیقی بالشویک پارٹی موجود نہیں تھی انقلابی ریلے بڑھتے ہی گئے اور مالیاتی سرمائے کی حکمرانی کیلئے ایک خطرہ بن گئے۔ حکمران طبقات اتنے خوفزدہ تھے کہ انہوں نے دوبارہ دسمبر 1971ء میں دونوں ملکوں کو جنگ میں جھونک دیا۔ مشرقی پاکستان میں عوامی اٹھان مغربی پاکستان کی حکمران اشرافیہ سے آزادی کی جنگ میں بدل گئی۔ بھاشانی اور دیگر سوشلسٹ لیڈروں کی ناکامی کے باعث تحریک اصل راستے سے ہٹ گئی اور قوم پرستی نے طبقاتی

جدوجہد کو کاٹ کر رکھ دیا۔ مجیب الرحمٰن مشرقی بنگال کا قومی ہیرو بن کر ابھرا۔ سیاسی اور نظریاتی حوالے سے وہ ایک بورژوا قوم پرست تھا اور بھارتی حکمران طبقے کے خاصا قریب تھا۔ اس کے باوجود جہاں جہاں بنگالی عوام نے پاکستانی فوج کو شکست دی تھی ان دیہاتوں اور شہروں میں سوویٹیں (پنچائتیں) ابھرنے لگیں اور مروجہ ریاستی ڈھانچوں کو توڑ دیا گیا۔ قومی آزادی کی جدوجہد سماجی معاشی آزادی کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ بھارتی بورژوازی کیلئے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ اگر مشرقی بنگال سرخ ہو جاتا تو اس سے مغربی بنگال میں سوشلسٹ انقلاب بھڑک سکتا تھا۔ برصغیر کی تاریخ کے پیش نظر ایک متحدہ سوشلسٹ بنگال سارے خطے میں انقلابات کا نقطہ آغاز بن جاتا۔

بھارتی فوج مشرقی بنگال میں نہ صرف پاکستانی فوج کی شکست اور اس کے ہتھیار ڈالنے کے عمل کو مکمل کرنے کیلئے داخل ہوئی تھی بلکہ اس کا مقصد ان پنچائیتوں کو بے رحمی سے کچل دینا تھا جو مروجہ ریاستی ڈھانچوں کے گرنے کے ساتھ بہت زیادہ تعداد میں ہر جگہ ابھر گئی تھیں۔ جنگ مغرب کی طرف بھی پھیل گئی تھی اور کشمیر میں تصادم شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ مشرقی پاکستان میں مارچ 1971ء میں ہونے والی بغاوت سے قبل ہی بھارتی حکمران کشمیر کی حساسیت کے حوالے سے بہت زیادہ چوکنے تھے۔

مسز گاندھی کیلئے یہ تناظر بڑا تکلیف دہ تھا کہ شیخ عبداللہ ایک دوسرا مجیب الرحمٰن بن جائے۔ 9 جنوری 1971ء کو شیخ صاحب، مرزا افضل بیگ اور جی ایم شاہ کا کشمیر میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا اور محاذ رائے شماری کے کوئی 400 کارکن اور راہنما گرفتار کر لیے گئے۔

جموں و کشمیر حکومت کے چیف سیکریٹری پی۔ کے دیو نے وضاحت کی تھی کہ کسی بڑے پیمانے کی تخریبی کاروائی سے بچنے کیلئے اس طرح کے اقدامات ضروری تھے۔

جلد ہی محاذ رائے شماری پر پابندی عائد کر دی گئی۔ محض 5 جون 1972ء کے بعد جب بھارتی فوج نے بنگال میں اپنی مقبول عام فتح حاصل کر لی تھی نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کو اپنے گھروں کو لوٹنے کی اجازت دے دی گئی۔ تاہم اس وقت تک شیخ عبداللہ ایک بار پھر بھارتی بورژوازی کے ساتھ سمجھوتہ کر چکا تھا۔

کشمیری لیڈروں کو رہا کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ جون کے آخر میں ذوالفقار علی بھٹو شملہ میں امن مذاکرات کرنے کیلئے بھارت آ رہا تھا۔ اب کی بار شکست خوردہ ملک کا لیڈر بھٹو تھا۔

2 جولائی 1972ء کے پہلے پہر ذوالفقار علی بھٹو اور اندرا گاندھی نے ایک معاہدہ کیا جو شملہ معاہدے کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں کہا گیا:

> دونوں فریق کسی بھی فریق کے تسلیم شدہ موقف کو مجروح کیے بغیر 17 دسمبر 1971ء کے سیز فائر کے نتیجے میں جموں و کشمیر میں' وجود میں آنے والی کنٹرول لائن کا احترام کریں گے۔ اپنے باہمی اختلافات اور قانونی توضیحات سے قطع نظر کوئی بھی فریق یک طرفہ طور پر اس میں تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ دونوں فریق یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ اس لائن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے طاقت کے استعمال کی دھمکی دینے سے باز رہیں گے۔ (11)

اگرچہ انہوں نے اعتراف تو نہیں کیا تھا لیکن اس دستاویز کی بنیاد پر بھارت اور پاکستان نے کشمیر کو تقسیم کر دیا تھا۔ اب کی بار فاتح معاملات کنٹرول کر رہا تھا۔

> 1948ء میں اقوام متحدہ میں چوہدری محمد علی کے ساتھ بات چیت کے دوران جو اس وقت حکومت پاکستان کا سیکریٹری جنرل تھا شیخ محمد عبداللہ نے کہا تھا:
>
> کشمیریوں پر تھوڑا سا بھروسہ کرو' وہ پاکستان کے خلاف سازشوں میں شریک نہیں ہوں گے اور وہ بکیں گے نہیں' ' اس نے تنبیہہ کرتے ہوئے

کہا’’ ’’کہ وہ وقت آئے گا جب آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ کشمیر ایک آزاد ملک ہونا چاہیے لیکن اس وقت ایسا ہونا ممکن نہیں ہوگا۔ اگر آپ نے اس مسئلے کو لٹکتا ہوا چھوڑ دیا تو آپ خسارے میں رہیں گے۔(12)

24 فروری 1975ء کو بھارتی پارلیمنٹ میں ایک چھ نکاتی معاہدہ کشمیر کا اعلان کیا گیا۔ جموں و کشمیر جو بھارتی یونین کا آئینی حصہ تھا اس پر آرٹیکل 370 کے تحت حکومت جاری رکھی جاتی تھی۔ ریاست کے پاس معمولی معاملات سے متعلق قانون سازی کے اختیارات رہنے تھے لیکن ملک کی علاقائی سلامتی سے متعلقہ معاملات پر قانون سازی پارلیمنٹ کے پاس تھی۔ بالآخر شیخ صاحب نے ایک خودمختار کشمیر کا خواب ترک کر دیا۔

25 فروری 1975ء کو شیخ عبداللہ نے لیڈر آف دی ہاؤس اور جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ کانگریس نے ایک بار پھر نیشنل کانفرنس سے غداری کی۔ 50 سال سے زائد عرصے پر محیط اپنے سیاسی کیریئر کے دوران شیخ عبداللہ کو 9 دفعہ جیل بھیجا گیا اور اس نے مجموعی طور پر 15 سال 7 ماہ اور 5 دن قید میں گزارے۔

پھر بھی 1982ء میں جب وہ فوت ہوا تو کشمیری عوام اس وقت بھی اضطراب اور مایوسی کا شکار تھے۔ جنت خطرات کی زد میں تھی اور کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ ایک واضح مثال ہے کہ بحران زدہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر قومی آزادی اور کشمیر کی آزادی کس طرح ایک یوٹوپیا ہے۔

سیکولرازم کا سراب

ہندوستانی بورژوازی اور کشمیر کے حوالے سے اس کے پوشیدہ سامراجی عزائم کا خلاصہ ایک انتہائی خفیہ خط میں بیان کیا گیا جو بھارت کے بزرگ سیاستدان جایا

پرکاش نرائن نے 23 جون 1966ء کو مسز گاندھی کو لکھا تھا۔نرائن نے لکھا تھا:

> ہم جمہوریت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن کشمیر میں ہم جبر کے ذریعے حکمرانی کر رہے ہیں، ہم سیکولرازم کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ہندو قوم پرستی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اسے جبر کے ذریعے نافذ کریں۔دنیا میں بھارت کا تاثر کسی چیز نے اتنا خراب نہیں کیا جتنا کہ کشمیر نے... مسئلہ اس لئے نہیں کہ پاکستان کشمیر چھین لینا چاہتا ہے بلکہ اس لیے ہے کہ وہاں عوام کے اندر گہری اور وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی سیاسی بے چینی ہے۔
>
> تاریخی واقعات نے جن میں سے کچھ ہمارے کنٹرول میں تھے اور کچھ نہیں تھے ساز باز کی گنجائش کو انتہائی محدود کر دیا ہے۔مثال کے طور پر اب ریاست کے کسی بھی حصے کا علیحدہ ہو جانا ناممکن ہے چاہے وہ جمہوریت اور سیکولرازم کے اصولوں کے تحت کتنا ہی اصولی اور منصفانہ کیوں نہ ہو۔حل چاہے جو بھی ہو یہ الحاق کی حدود کے اندر ہی تلاش کرنا پڑے گا...(13)

جایا پرکاش نرائن جو''سوشلسٹ''ہونے کا بھی دعویٰ کرتا تھا اس فریب کا بھی شکار تھا کہ ہندوستانی بورژوازی بھارت میں جمہوری اور سیکولر نظام حکومت قائم کر دے گی۔بائیں بازو کی دیگر پارٹیوں اور لیڈروں کا حال بھی یہی تھا۔دو مرحلوں کے منشویک اور سٹالنسٹ نظریے کی تنگ نظری کا شکار ہونے کے سبب وہ اس غلط اور متروک نظریے پر کاربند تھے اور بدقسمتی سے اب بھی ہیں کہ ہندوستانی بورژوازی قومی جمہوری انقلاب کے فرائض پورے کرسکتی ہے۔یہ ایک المیہ تھا کہ بائیں بازو کی تمام پارٹیاں دو مرحلوں کے نظریے کی بیڑیوں میں بندھی ہوئی تھیں۔دو مرحلوں کا یہ فرسودہ نظریہ ہندوستان کی تمام تر انقلابی اٹھانوں اور مزدوروں کی دلیرانہ تحریکوں کیلئے ایک رکاوٹ تھی۔

عملاً اس نظریے کا مطلب یہ ہے کہ غلط طور پر بھارتی بورژوازی سے ایک ترقی

پسندانہ کردار منسوب کیا جائے اور اس کی مدد کی جائے۔ درحقیقت اس کا مطلب ان تمام جرائم اور جبر کا ساتھ دینا ہے جو وہ مالیاتی سرمائے کی حکمرانی کو جاری رکھنے کیلئے کرتے ہیں۔ بھارت میں قومی ریاست کی تکمیل کا فریضہ ابھی قطعاً نامکمل ہے۔ بجائے اس کے کہ بھارتی بورژوازی جمہوری اتفاق رائے سے قومی ریاست کی تشکیل کرتی تمام تر تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس نے بھارت کو جبر' فوجی اقدامات' محلاتی سازشوں' ساز باز' دھاندلی اور بعض اوقات تو قطعی وحشت کے ساتھ متحد کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہت سے حوالوں سے بھارت کی مماثلت زارشاہی کے روس سے پائی جاتی ہے جسے لینن نے ''قومیتوں کا قید خانہ'' قرار دیا تھا۔

بھارتی بورژوازی کی روایتی پارٹی کانگریس کا اپنی سیکولر ساکھ کے حوالے سے ریکارڈ انتہائی خراب ہے۔ میرٹھ کے انسانی قتل عام سے' 1960ء کی دہائی میں گجرات میں ہونے والے مسلم کش فسادات سے' 1984ء میں دہلی میں سکھوں کے قتل عام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس ہندو بنیاد پرستی کی تابع فرمان ہے۔ 1983ء میں جموں کی انتخابی مہم کے دوران اندرا گاندھی نے اس مفروضے (جو درست بھی تھا) کی بنیاد پر کہ اسے وادی کی زیادہ تر مسلم نشستوں پر فتح ملنے کے امکانات بہت کم تھے ایک جارحانہ مہم چلائی جس میں ہندوانہ تعصب غالب تھا۔

سیکولرازم پر ہونے والے اثرات کی دو مثالوں میں سے ایک شاہ بانو کیس ہے اور دوسری ایودھیا میں بابری مسجد کی مسماری۔ پہلے کیس میں راجیو گاندھی کی کانگریس حکومت ملوث تھی۔ ایک بوڑھی مسلمان عورت اپنے خاوند کو عدالت میں لے گئی جہاں اس کے دعوے کو درست قرار دیتے ہوئے اس کے خاوند کو حکم دیا گیا کہ وہ اسے رقم ادا کرے۔ سول لاء (دیوانی ضابطہ قانون) کے تحت کیا جانے والا یہ فیصلہ اسلامی شرعی حکم سے متصادم تھا جس کے تحت طلاق کے بعد ایک مرد پر اپنی سابقہ بیوی کی کفالت کی قطعاً کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ بھارتی مسلم کمیونٹی کے کچھ حصوں نے سپریم

کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف پر زور آواز اٹھائی۔ بجائے اس کے کہ راجیو گاندھی اس موقف پر سختی سے قائم رہتا اور اس سیکولر اصول کی پاسداری کرتا کہ تمام شہریوں پر قانون کا اطلاق مساوی ہوتا ہے اس نے مسلم ویمن (Protection of Rights on Divorce) بل پاس کیا۔ اس بل سے بھارتی آئین میں اسلامی شریعت اچھی خاصی سرائیت کرگئی۔

دوسری مثال میں راجیو گاندھی کا جانشین نرسیما راؤ ملوث تھا۔ اس کی حکومت کی پہلی کمزوری تو یہ تھی کہ وہ ہندو جنگجوؤں سے بابری مسجد کو مسمار ہونے سے نہ بچا سکی۔ جب مسجد مسمار ہوگئی تو حکومت نے ایک سخت موقف اختیار کرنے کی کوشش کی اور نہ صرف اتر پردیش کی بی جے پی کی حکومت کو برطرف کیا بلکہ کل چار ریاستوں میں قائم بی جے پی کی تمام حکومتوں کو برطرف کر دیا اور وعدہ کیا کہ وہ مسجد دوبارہ تعمیر کرے گی۔ تاہم جب اسے ہندوؤں میں بڑے پیمانے پر ہندوتا کے جذبات نظر آئے تو راؤ اپنے وعدے سے پھر گیا۔ نہ ہی راؤ نے اور نہ ہی اس کے بعد آنے والوں نے مسجد کی تعمیر نو کے بارے میں کوئی تحریک کی۔ نظریہ ضرورت اور بزدلی پر مبنی سیاست اصولوں سے زیادہ اہم تھی۔

اچن ونائیک لکھتا ہے:

> 1971ء کی جنگ کے بعد بڑی تعداد میں لوگ مسز گاندھی کو ''درگا'' ہندوؤں 'میں تباہی کی دیوی' کہتے تھے۔ وہ اور اس کی کانگریس پارٹی ہندوتا تاثر دینے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس کامیابی کے بعد مسز گاندھی ہندو علامات اور تہواروں کا استعمال اور مندروں کے دورے کرنے لگی جن کی اچھی خاصی تشہیر کی جاتی تھی اور اس طرح کے دیگر کام۔ (14)

ونائک کے خیال میں جنوری 1980ء میں دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد

کانگریس کی سوشلزم کی مقبول عام لفاظی کی جگہ ہندوازم کی تبدیلی بالکل واضح تھی۔ راجیو گاندھی نے دیگر معاملات کی طرح اس ضمن میں بھی اپنی ماں کی پیروی کی۔ 1984ء کے انتخابات میں کامیابی کے بعد اس نے جو پہلے کام کیے تھے ان میں ایک ایودھیا میں رامائن کی تلاوت تھی۔ چڈا نے دعویٰ کیا ہے کہ ان انتخابات میں'

''آر ایس ایس کے کیڈرز کی ایک بہت بڑی تعداد راجیو کیلئے کام کرتی رہی۔''(15)

ونائیک کی رپورٹ کے مطابق 1989ء کے انتخابات کے دوران اپنی مہم میں اس نے فیض آباد میں وعدہ کیا تھا کہ

''محض کانگریس ہی آپ کو رام راج دے سکتی ہے۔'' ونائیک یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ شرمناک حد تک کانگریس نے ایک ایسے تناظر کی پیروی کی جسے بہت درست الفاظ میں 'زرد زعفران کہا جاتا ہے جہاں زعفران سیاسی ہندوتا کا علامتی رنگ ہے۔(16)

جب ایک بار بی جے پی کی طرز کی ہندو پارٹیاں سیاسی اکھاڑے میں داخل ہوئیں اور انہیں بڑی بڑی انتخابی کامیابیاں حاصل کرتے ہوئے دیکھا گیا تو غیر فرقہ پرور پارٹیوں کو ان کی مثال کی تقلید کرنے کی اور بھی زیادہ تحریک ملی اور محض چند ایک ہی اس راہ پر چلنے سے باز رہیں۔

1980ء کی دہائی کے اواخر تک بھی بھارتی مقبوضہ کشمیر کا انحصار سیاحت پر تھا۔ کوئی ایسی حقیقی صنعت نہیں تھی جس کو کشمیر داؤ پر لگاتا۔ سوویت یونین کی افغانستان سے واپسی' سٹالنسٹ ریاستوں میں ہونے والی ہلچل اور دیوار برلن کے گرنے جیسے بین الاقوامی تاریخی واقعات اور بائیں بازو کی پارٹیوں کی طرف سے قیادت کے فقدان کے باعث کشمیری نوجوان بہت بڑی تعداد میں کمیونزم یا سوشلزم کی طرف نہیں بلکہ

اپنے اپنے مذاہب کی بنیاد پرستی کی طرف راغب ہوئے۔ مسلم، ہندو، سکھ اور بدھ مت کے پیروکار سب کے سب اپنی اپنی ثقافتی اور مذہبی شناخت مسلط کر رہے تھے۔ یہ بات اس سیکولرازم کے قطعاً برعکس تھی جس کا بھارتی حکومت آزادی کے وقت سے پرچار کرتی آئی تھی۔

انتخابی ناکامیاں

1986ء کے کشمیر کے ریاستی انتخابات میں جن لوگوں نے سیاسی خلا پر کرنے کیلئے حصہ لیا ان میں سیاسی پارٹیوں کا وہ گروہ بھی شامل تھا جس نے مل کر مسلم یونائیٹڈ فرنٹ تشکیل دیا تھا۔

چونکہ جگ موہن انتظامیہ کے اندر رہتے ہوئے واضح طور پر ہندوؤں کے حق میں ایک فیصلہ کن تعصب کا مظاہرہ کر رہا تھا اس لیے ایم یو ایف کو اچھی خاصی پذیرائی ملی۔ مولوی فاروق کی ''عوامی نیشنل پارٹی'' نے بھی ایم یو ایف کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا۔ شیخ عبداللہ کے 1975ء میں دہلی انتظامیہ کے ساتھ معاہدے اور سیاست میں واپسی کے بعد نیشنل کانفرنس کا پہلی دفعہ کسی سنجیدہ مدمقابل سے سامنا ہوا تھا۔

انتخابات کے دن یعنی 23 مارچ 1987ء کو ڈالے جانے والے ووٹوں کی شرح 75 فیصد رہی۔ یہ ریاست کی تاریخ میں ڈالے جانے والے ووٹوں کی سب سے بڑی شرح تھی۔ وادی میں ووٹنگ کی شرح تقریباً 80 فیصد رہی۔ نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے اتحاد نے 66 نشستیں جیتنے کا دعویٰ کیا۔ کانگریس نے وادی کی جن چھ نشستوں پر الیکشن لڑا ان میں سے پانچ پر کامیابی حاصل کی۔ ایم یو ایف نے 44 نشستوں پر انتخاب لڑا اور محض چار پر کامیابی حاصل کی۔

نیشنل کانفرنس اور کانگریس کی جیت پر قومی سطح پر جشن منائے جانے کے باوجود بڑے پیمانے پر دھاندلی کے الزامات عائد کئے گئے۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں مسلح

جدوجہد کے دوبارہ ظہور کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ وہ نوجوان جو تعلیم یافتہ تھے لیکن بیروزگار تھے ان کے دکھوں میں وادی کے اندر اور باہر رونما ہونے والے واقعات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ ان کی معاشی محرومی کا سبب یہ تھا کہ وہ نہ تو بیوروکریسی کا حصہ تھے اور نہ ہی حکمران اشرافیہ کا۔ بیگانگی کے شکار ان نوجوانوں کو کسی نہ کسی مذہبی سیاسی تنظیم میں اپنی مایوسی کا اظہار کرنے کا موقع ملا۔ اس دوران ایم یو ایف کا وسیع تر اتحاد ٹوٹ کر بکھر گیا۔ پیپلز کانفرنس اور عوامی کانفرنس نے جماعت اسلامی کے اس موقف کا ساتھ نہ دیا کہ ایک مذہبی ریاست کو پروان چڑھایا جائے۔

1993ء کے آخر میں بھارت کی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کیلئے ایک بار پھر انتخابات کی راہ اپنائی جائے۔ انہوں نے کئی نمایاں سیاسی راہنماؤں کو رہا کر کے اپنے ارادے واضح کئے۔ ان راہنماؤں میں جے کے ایل ایف کے یاسین ملک کو مئی 1994ء میں اور شبیر شاہ، سید علی گیلانی، عبدالغنی لون اور 276 دیگر سیاسی قیدیوں کو اسی سال اکتوبر میں رہا کیا گیا۔ اپنی رہائی کے بعد یاسین ملک اور شبیر شاہ نے عوام کے سامنے سیاسی تشدد کی مخالفت کی۔ مصالحت کی ان ابتدائی کوششوں کے باوجود حقیقی طور پر انتخابات کے انعقاد میں دو سال سے زائد کا عرصہ لگا۔

الیکشن کی راہ میں دو بڑی رکاوٹیں حائل تھیں۔ پہلی رکاوٹ یہ تھی کہ کسی نہ کسی قسم کی سول انتظامیہ دوبارہ تشکیل دی جائے جس میں انتخابات کرانے کی صلاحیت ہو۔ کئی سالوں پر محیط ہنگامہ آرائی کی وجہ سے ریاست کی انتظامی مشینری تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ بہت بڑی تعداد میں سرکاری اہل کاروں کو بھارت کے دیگر حصوں سے منگوانا پڑا۔ اس کے علاوہ ریاست کے پاس آبادی کے حوالے سے درست معلومات کا فقدان تھا۔ ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے 1991ء میں کشمیر میں مردم شماری نہیں ہو پائی

تھی اور اگر کوئی انتخابی ریکارڈ تھا تو اس کو بھی جنگجوؤں نے تباہ کر دیا تھا۔

دوسری رکاوٹ کہیں زیادہ بڑی تھی۔ یہ مسلح گروہوں اور آل پارٹیز حریت کانفرنس (اے پی ایچ سی) کی مخالفت تھی۔ مسلح گروہوں نے اپنی انتخاب دشمنی کا مظاہرہ کچھ یوں کیا کہ انہوں نے مارچ 1994ء میں نیشنل کانفرنس کے ایک لیڈر اور ریاستی اسمبلی کے سابق سپیکر ولی محمد یاتو کو قتل کر دیا اور اسی ماہ جب فاروق عبداللہ اور راجیش پائلٹ اکٹھے ریاستی دورے پر آئے تو انہیں بھی قتل کرنے کی کوشش کی۔ اے پی ایچ سی کے راہنماؤں نے، جن میں حال ہی میں رہا ہونے والے یاسین ملک اور شبیر شاہ شامل تھے، یہ بات واضح کر دی کہ وہ اس تجویز کے خلاف تھے اور اگر بھارت نے اپنے منصوبے کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تو ان کی پارٹیاں بائیکاٹ کریں گی۔ اتنے وسیع پیمانے پر مخالفت سے یہ بات پہلے ہی مشکل نظر آ رہی تھی کہ 1995ء کے موسم بہار میں انتخابات منعقد ہوں۔ مئی میں چرار شریف کی درگاہ جلنے سے بہار کے موسم میں انتخابات منعقد کروانے کے تمام تر خواب چکنا چور ہو گئے۔ نومبر میں ایک بار پھر اس وقت انتخابات کی افواہیں گردش کرنے لگیں جب حکومت نے آنے والے مہینوں میں منعقد ہونے والے انتخابات کی نگرانی کیلئے سرکاری اہل کار ریاست میں بھیجے۔ تاہم کشمیر کے اندر سے بہت زیادہ سیاسی مخالفت اور جنگجوؤں کی طرف سے تشدد کی دھمکیوں کی وجہ سے ایک بار پھر الیکشن ملتوی کرنے پڑے۔

بالآخر مئی 1996ء میں جموں و کشمیر میں ایک طرح کے انتخابات ہو ہی گئے لیکن یہ لوک سبھا (بھارتی پارلیمان کے ایوان زیریں) کے انتخابات تھے نہ کہ ریاستی اسمبلی کے۔ اے پی ایچ سی کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور جنگجوؤں کی طرف سے ہر طرح کے انتخابات کو سبوتاژ کرنے کی دھمکیاں جاری تھیں لیکن اس کے باوجود انتخابات کروانے کے فیصلے کو بھرپور انداز میں آگے بڑھایا گیا۔ لگتا تھا کہ راؤ کی حکومت یہ سمجھ رہی تھی کہ:

انتخابات نہ ہونے سے بہتر یہی ہے کہ غلط ملط انتخابات ہی ہو جائیں---دہلی کی حکمرانی کے تسلسل سے بہتر تھا کہ کوئی بھی کشمیری حکمرانی کرے۔(17)

انتخابات میں بہرحال بہت زیادہ گڑبڑ ہوئی۔ یا تو بھارت سے مکمل بیگانگی کے سبب یا پھر جنگجوؤں کی دھمکیوں کے باعث بہت کم کشمیریوں نے ان انتخابات میں ووٹ ڈالنے کے حوالے سے کسی قسم کے جوش وخروش کا مظاہرہ کیا۔ انتخابات میں ووٹ ڈالنے کی شرح کو زیادہ کرنا اور انہیں قابل بھروسہ بنانا بہت ضروری تھا اسی لئے سیکیورٹی فورسز کو کہا گیا کہ لوگوں کو ''متحرک'' کیا جائے۔ٹم مک گرک (Tim Mc Grik) نے انڈیپنڈنٹ اخبار (لندن) کو رپورٹ بھیجی تھی کہ:

ساری وادیٔ کشمیر میں بھارتی حکام نے منظم طریقے سے لوگوں کو ڈرایا دھمکایا اور دھاندلی کی ... ہر جگہ ایک ہی کہانی دہرائی گئی۔ بھارتی سپاہیوں اور پولیس نے لوگوں کو ووٹ ڈالنے پر مجبور کیا: یہ الیکشن انتہائی غیر شفاف اور ایک ظالمانہ فراڈ تھا جو بے احتیاطی کے ساتھ سرانجام دیا گیا۔(18)

مئی 1996ء میں ووٹ ڈالنے کی شرح تقریباً 40 فیصد رہی۔ ووٹوں کی اتنی بڑی شرح سے اگر کوئی معتبر تاثر قائم کیا جا سکتا تھا تو وہ بھی ان ظالمانہ ہتھکنڈوں کے باعث کھو گیا۔ دی ٹائمز نے اس عمل کو

''بھارت کیلئے پروپیگنڈے کے میدان میں تباہی''(19)

قرار دیا تھا۔

جو اصل نتائج سامنے آئے تھے ان کے تحت ریاست کی لوک سبھا کی چھ نشستوں میں سے چار کانگریس کے امیدواروں کو جب کہ ایک ایک جنتا دل اور بی جے پی کو ملی۔

ستمبر 1996ء میں ریاستی اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے۔ مئی کی طرح حریت کانفرنس نے ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا اور یوں محض بھارت نواز پارٹیوں نے ہی

انتخابات میں حصہ لیا جن میں نیشنل کانفرنس، کانگریس، جنتا دل اور بی جے پی قابل ذکر ہیں۔حریت کانفرنس اور جنگجوؤں کی مخالفت کے باوجود اب کی بار حکام کی طرف سے لوگوں کو ووٹ دینے پر مجبور کرنے کی بہت کم اطلاعات موصول ہوئیں۔نتائج کے مطابق فاروق عبداللہ کی نیشنل کانفرنس واضح طور پر الیکشن جیت گئی تھی۔اس نے وادی کی 44 نشستوں میں سے 40 پر اور مجموعی طور پر 57 نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔8 اکتوبر کو عبداللہ نے جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔یہ انتخابی مشق ایک بار پھر کوئی مسئلہ حل کرنے میں ناکام رہی۔فاروق عبداللہ کی پارٹی، نیشنل کانفرنس کوئی بھی مسئلہ حل کرنے میں بری طرح ناکام رہی اور گزشتہ انتخابات میں مفتی سعید کے ہاتھوں بری طرح ہار گئی۔

شورش کا احیاء

1987ء کے انتخابات کے بعد مسلح بغاوت میں جو تیزی آئی تھی اس نے ساری دنیا کو بےخبری کے عالم میں آن لیا۔مئی 1987ء میں فاروق عبداللہ کے خلاف پہلا بڑا اقدام اس وقت اٹھایا گیا جب مسجد کی طرف جاتے ہوئے اس کے قافلے پر حملہ کیا گیا۔اس سال چوری چھپے ہونے والے قاتلانہ حملوں میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا۔

1988ء میں ہنگامہ آرائی تسلسل کے ساتھ جاری رہی جس سے معمول کی زندگی اس شدت کے ساتھ متاثر ہوئی کہ جگ موہن جو اس وقت گورنر تھا اپنی ڈائری میں ان کا مفصل ذکر کیا کرتا تھا۔جون میں بجلی کی قیمتوں میں اچانک اضافے کے خلاف سرینگر میں مظاہرے ہوئے۔اس اضافے سے لوگوں میں غم وغصہ پھیل گیا کیونکہ بجلی کی فراہمی بہترین حالات میں بھی ناقص تھی لیکن حکومت نے عوام کی طرف بےاعتنائی کا رویہ رکھا۔

دو بم دھماکے ہوئے جن سے سری نگر میں واقع سنٹرل ٹیلیگراف آفس اور ٹیلی

ویژن سینٹر بال بال بچے۔ستمبر میں پولیس کے ڈائیریکٹر جنرل علی محمد وتالی پر حملہ ہوا۔ جے کے ایل ایف (JKLF) نے اعجاز ڈار کو اپنا پہلا شہید قرار دیا جو پولیس کے ساتھ مسلح جھڑپوں میں مارا گیا تھا۔ اگر چہ شروع میں ہونے والے سبوتاژ کے واقعات سے کوئی زیادہ نقصان نہ ہوا لیکن وہ اس بات کا عندیہ تھے کہ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے ۔مزاحمتی دھڑے جن کے پیروکاروں کو ''مجاہد'' کہا جاتا تھا مختلف ناموں سے پھیلتے گئے تاہم بھارتی حکام جن پر داخلی بدنظمی کی زیادہ تر ذمہ داری عائد ہوئی تھی محض جے کے ایل ایف کو اپنا نشانہ بنا رہے تھے۔لیکن بغاوت بڑے پیمانے پر جاری رہی۔ 27 اکتوبر کو جو 1947ء میں بھارتی افواج کے سری نگر میں اترنے کی سالگرہ تھی، ایک عام ہڑتال ہوئی جس میں مظاہرین اس دن کو ''قبضے کا دن'' قرار دے رہے تھے۔

سکوفیلڈ اس بغاوت کے بارے میں کہتی ہے:

> 1990ء کی دہائی میں جیسے جیسے وادی میں بغاوت زور پکڑتی گئی تشدد آمیز واقعات کی تعداد اور شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ پولیس اور سیکیورٹی فورسز کا ردعمل اور بھی زیادہ تشدد آمیز تھا اور اکثر اس کی قیمت معصوم شہریوں کو چکانا پڑتی تھی جو فائرنگ کے تبادلے میں پھنس جاتے تھے۔کشمیر کے ہر نوجوان کو مستقبل کا باغی سمجھا جانے لگا۔انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی خبریں عالمی سطح پر شہ سرخیوں کے ساتھ چھپنے لگیں۔ ایذا رسانی، عصمت دری اور بلا امتیاز قتل کی داستانیں عام ہونے لگیں۔ اگر چہ باغیوں کے پاس کوئی طویل المیعاد حکمت عملی نہیں تھی، ایسا لگتا تھا کہ انہیں یہ امید تھی کہ وادی کے اندر بھارتی حکام کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم سے عالمی توجہ ان کے ''درست مقاصد'' پر مبذول ہو گی اور بھارتی حکومت وادی کا کنٹرول چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔ان دنوں سیاحوں کی ایک بڑی تعداد سیاحت کے لئے وادی میں آتی تھی جو

اس بات سے بے خبر تھے کہ آنے والے دنوں میں یہی پہاڑ بم دھماکوں کی آوازوں سے گونجیں گے۔ایک اندازے کے مطابق 1989ء میں تقریباً 80,000 غیر ملکی سیاح کشمیر آئے جو سیاحوں کیلئے وادی کا آخری موسم ثابت ہوا۔(20)

1989ء کے بعد کئی ایک مزاحمتی گروپوں نے پوری وادی کے اندر اپنی کاروائیاں شروع کر دیں۔ان کی کاروائیوں کا محور سری نگر' بارہ مولا، اننت ناگ اور سوپور کے علاقے تھے۔ان کا مقصد یا تو مکمل خود مختاری تھا یا پاکستان کے ساتھ الحاق۔وادی میں جے کے ایل ایف کی قیادت ایک مرکزی ''حاجی'' گروپ کر رہا تھا۔کئی ایک اسلامی پارٹیوں نے بھی مسلح ونگ تشکیل دیے۔ البراق کے عبدالغنی لون کی پیپلز کانفرنس سے روابط تھے۔زین العابدین کی زیر قیادت کام کرنے والی الفتح شبیر شاہ کی پیپلز لیگ کے ایک دھڑے کا مسلح ونگ تھی۔پیپلز لیگ کا ایک دوسرا مسلح ونگ الجہاد تھا۔اللہ ٹائیگرز کی طرح کے گروہوں کا بڑا مقصد ویڈیو کی دکانیں اور بیوٹی پارلر بند کروانا تھا کیونکہ وہ ان چیزوں کو ''غیر اسلامی'' خیال کرتے تھے۔

کشمیر کی آزادی کی مخالفت کی وجہ سے مسلح بغاوت میں پاکستان کے کردار پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔مسلح گروہوں کی مدد کے سلسلے میں اسلام آباد نے بہت زیادہ احتیاط کا مظاہرہ کیا ہے۔یہ ان گروپوں کی حوصلہ افزائی کرتا رہا ہے جو کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے حامی ہیں جبکہ جو گروہ خود مختار کشمیر کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں پاکستان ان کی حوصلہ شکنی کرتا رہا ہے۔چونکہ کشمیر میں مسلح گروہ بیرونی امداد کے بغیر زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتے اس لئے اس بغاوت میں پاکستان نواز گروپوں کا غلبہ رہا۔

پاکستان نے وقفوں وقفوں سے، خاص کر 1965ء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں بغاوت کو بھڑکانے کی کوششیں کی ہیں اگرچہ اکثر اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔تاہم

موجودہ کشمیری بغاوت پاکستان کے اکسانے پر شروع نہیں ہوئی تھی۔لیکن جب ایک بار یہ بغاوت چل نکلی تو پاکستان بھارت سے علیحدگی کی جنگ میں سرگرم کشمیری مسلمانوں کی اخلاقی اور عملی مدد کا منبع بن گیا۔

بغاوت کے ابتدائی دنوں میں حزب المجاہدین کو، جس کا مرکز سوپور تھا اور جسے جماعت اسلامی کا مسلح ونگ خیال کیا جاتا تھا' وادی کے اندر وسیع حمایت حاصل نہیں تھی۔حزب المجاہدین کا سرکاری مقصد پاکستان کے ساتھ الحاق تھا۔اس وقت حرکت الانصار بھی بغاوت کے مرکزی دھارے کا حصہ نہیں تھی۔ پاکستان کی حمایت کرنے والے گروہوں میں حزب اللہ' العمر مجاہدین' لشکر طیبہ' اخوان المجاہدین' تحریک المجاہدین اور دیگر چھوٹے گروہ شامل تھے۔

ابتداء میں ان گروپوں کے درمیان تفریق ڈھکی چھپی تھی۔ایک گروپ ہڑتال کی کال دیتا تھا اور دوسرے اس کی تعمیل کرتے تھے۔جو نوجوان ان گروپوں میں آئے وہ زیادہ تر پڑھے لکھے ڈاکٹر' انجینئر اور اساتذہ وغیرہ تھے جو نئی دہلی کی حکومت کی پالیسیوں اور نوکریوں کے فقدان کی وجہ سے مایوسی اور بیگانگی کا شکار تھے۔ان کے مصائب کی نوعیت جس قدر سیاسی تھی اتنی ہی معاشی بھی تھی۔

ریاستی دہشت گردی

مزاحمت کی ابھرتی ہوئی لہر میں اس وقت ایک فیصلہ کن موڑ آیا جب 1990ء میں وی پی سنگھ کی حکومت نے جگ موہن کو کشمیر کا گورنر مقرر کیا۔ 19 جنوری کو جب جگ موہن حلف لے رہا تھا تو سری نگر کی گلیوں میں ایک بہت بڑا مظاہرہ ہوا۔اس کے ردعمل میں دریائے جہلم پر واقع گاؤ کدل کے پل کے دونوں طرف نیم فوجی دستوں نے پوزیشن سنبھال لی۔ جب غیر مسلح ہجوم پل تک پہنچا تو اس پر دریا کے دونوں طرف سے گولیاں برسائی گئیں۔ یہ کشمیر کی تاریخ کا بدترین قتل عام تھا۔ 100 سے زائد

افراد مارے گئے ۔ کچھ لوگ گولی لگنے سے مارے گئے اور کئی اس وجہ سے کہ انہوں نے خوف کے مارے دریا میں چھلانگ لگا دی اور ڈوب گئے ۔

اگرچہ ہندوستانی اخبارات نے اس واقعے کو بہت کم اہمیت دی لیکن غیر ملکی پریس نے اس قتل عام اور اس کے اثرات دنیا کے سامنے پیش کیے ۔ اس کے نتیجے میں غیر ملکی نامہ نگاروں کے وادی میں داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی ۔ غیر معینہ مدت کیلئے کرفیو لگا دیا گیا ۔ کئی دوسرے قصبوں میں بھی کرفیو لگا دیا گیا ۔ اس واقعے کے بعد کسی قسم کی پبلک انکوائری کا حکم نامہ جاری نہ کیا گیا ۔

> انتظامیہ کے تشدد کے باوجود بغاوت میں زیادہ جرات آ گئی اور مزاحمت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گئی ۔ انتہائی غیر معمولی رجائیت کے عالم میں لوگوں کو اس بات کا یقین تھا کہ انہوں نے تقریباً شروع ہونے سے پہلے ہی جنگ جیت لی تھی ۔ حسیب نامی ایک شخص نے سکوفیلڈ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ''میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ محض 10 دنوں کے اندر اندر بھارت کو کشمیر خالی کرنا پڑے گا ۔ '' اساتذہ ' ڈاکٹر ' وکلاء ' سرکاری ملازمین اور طلباء احتجاجاً سڑکوں پر نکل آئے ۔ پہلی بار بھارت کے یوم جمہوریہ کے موقع پر 26 جنوری کو جسے یوم سیاہ کے طور پر منایا گیا ' بھارتی پرچم نہ لہرایا گیا ۔ (21)

جگ موہن نے جسے دہلی کی پشت پناہی حاصل تھی ریاستی اسمبلی تحلیل کر دی اور ریاست میں فوج تعینات کرنا شروع کر دی ۔ وفاقی پیرا ملٹری یونٹ ' سنٹرل ریزرو پولیس فورس (سی پی آر ایف) کا طریقہ کار اس قدر شدید اور وحشیانہ تھا کہ مقامی پولیس کو بھی اس سے گھن آنے لگی اور وہ ہڑتال پر چلی گئی ۔ وحشیانہ طریقہ ہائے کار کے باوجود عوام کو نیا حوصلہ ملا ۔ یکم مارچ 1990ء کو 40 سے زائد افراد اس وقت مارے گئے جب سری نگر کی سڑکوں پر آنے والے 10 لاکھ افراد کے جم غفیر پر پولیس نے فائر کر دیا ۔

کرفیو کے نتیجے میں علاقے میں شدید قلت پیدا ہوگئی۔

''ہسپتال بغاوت کا شکار ہونے والے لوگوں سے اس قدر بھر گئے تھے کہ سری نگر کے ہڈی جوڑ ہسپتال کا نام بدل کر گولی اور بم دھماکوں سے زخمیوں کا ہسپتال رکھ دیا گیا۔''(22)

وکٹوریہ سکوفیلڈ جگ موہن کی طرف سے جاری کردہ ظلم اور بربریت کے پیچھے کارفرما نفسیات کا تجزیہ کرتی ہے:

''اپنے ذاتی مقصد کے زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے جگ موہن کے مطابق بغاوت کی اس تحریک کو پاکستان نے بھڑکایا تھا' جسے ظالمانہ انداز میں کچل دینا چاہیے تھا، چاہے اس کے لئے کشمیر کی پوری آبادی کو ہی نشانہ کیوں نہ بنانا پڑے۔''(23)

جگ موہن اپنی یادداشتوں میں اپنی وضاحت پیش کرتا ہے:

ظاہر ہے کہ میں بچھوؤں سے بھری ہوئی وادی میں ننگے پاؤں نہیں چل سکتا' وہ وادی جہاں دہشت گردی کی داخلی اور خارجی طاقتوں نے یونین کو تباہ و برباد کرنے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کیلئے ساز باز کر رکھی تھی ... مجھے اپنے آپ کو ہر طرح کے نتائج کا سامنا کرنے کیلئے لیس کرنا تھا۔ میں کسی بھی چیز کو قسمت کے سہارے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ایک معمولی سا جھول یا چھوٹی سی غلطی کا مطلب ایک تائنامین سکوائر(Tiananmen Square) یا ایک بلیو سٹار ہوسکتا تھا یا پھر اپنی تمام تر بین الاقوامی الجھاؤ کے ساتھ ایک نئی مذہبی ریاست کا باضابطہ اعلان ہوسکتا تھا...(24)

ہر ایک بغاوت میں طبقاتی تضاد زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ بڑے پیمانے پر ہونے والی ایک ہجرت کے دوران 140,000 ہندو وادی چھوڑ کر جموں سے باہر واقع مہاجر کیمپوں کیلئے روانہ ہوئے۔ ان میں سے جو چند ایک خوشحال تھے وہ دہلی اور بھارت کے دیگر میٹرو پولیٹن شہروں میں اپنے دوسرے گھروں میں رہنے لگے۔

1990ء سے ان مہاجر کیمپوں کے اندر خراب حالات زندگی کے باعث 6000 ہندو مارے گئے۔ اس کے مقابلے میں بغاوت کے ابتدائی مہینوں میں 1500 کشمیری مارے گئے تھے۔

بھارتی ریاستی غلبے میں رہنے والے کشمیریوں کیلئے مخصوص اہداف پر جنگجوؤں کے حملوں کے معروف طریقے' ریاست کی طرف سے جوابی حملے' گھیراؤ اور تلاشی کے آپریشن اور جنگجوؤں کی طرف سے ہڑتال کی کالیں روزمرہ زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ سیکیورٹی فورسز کو گولی چلانے اور قتل کرنے' بغیر وارنٹ کے تلاشی لینے اور گرفتاری کرنے کے بے شمار اختیارات تفویض کیے گئے اور ان تمام کاموں میں انہیں سزا سے مستثنٰی قرار دیا گیا۔ اس مخصوص آرڈیننس کے فوراً بعد سیکیورٹی فورسز پر جلاؤ گھیراؤ' لوٹ مار اور عصمت دری کا نشہ طاری ہو گیا۔

لڑائیوں کے دوران عصمت دری کرنا ایک ایسا معمول ہے جو روز ازل ہی سے چلا آ رہا ہے: اس میں کوئی بات نئی نہیں ہے۔ کشمیر میں نئی بات یہ ہے کہ عصمت دری کو دشمن کو کمزور کرنے کیلئے شعوری اور منظّم طریقے سے ایک آلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

1993ء میں ایشیا واچ اور ہیومین رائٹس کے ڈاکٹروں کی ایک مشترکہ رپورٹ میں امریکہ میں قائم انسانی حقوق کے ایک گروہ نے بتایا کہ:

> عصمت دری ان عورتوں کو ہدف بنانے کیلئے استعمال کی جاتی ہے جن پر سیکیورٹی فورسز جنگجوؤں کا حامی ہونے کا الزام عائد کرتی ہیں۔ ان کی عصمت دری کر کے سیکیورٹی فورسز تمام تر کمیونٹی کو سزا دینا اور ان کی تذلیل کرنا چاہتی ہیں۔ (25)

عفت ملک اپنے تحقیقی مقالے میں کشمیر عورتوں کی قابل رحم حالت بیان کرتی ہے:

> عورتوں پر زیادہ تر جنسی حملے گھر گھر تلاشیوں کے دوران ہوتے

ہیں۔ مردوں کو یا تو الگ کر دیا جاتا ہے یا نفسیاتی اثرات کو زیادہ سے زیادہ کرنے کیلئے' انہیں دیکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ دیگر حالات میں عورتوں پر جنسی حملہ اس وقت کیا جاتا جب وہ باہر ہوتی ہیں یا انہیں اغوا کر کے فوجی کیمپوں میں لے جایا جاتا ہے۔ مبینہ طور پر بھارتی فورسز نے عصمت دری کے سینکڑوں انفرادی اقدامات کئے ہیں۔ ان میں بدنام ترین واقعہ وہ گینگ ریپ تھا جو اپریل 1990ء میں انت ناگ میں ایک دلہن کے ساتھ اس کی شادی کے موقع پر کیا گیا۔ (26)

سکوفیلڈ 1991ء کا ایک واقعہ بیان کرتی ہے جو بھارتی فوج اور حکومت کی ذہنیت اور عورتوں کے خلاف ہونے والے جرائم کی روک تھام کے حوالے سے ریاست کے رویے کو بے نقاب کرتا ہے:

> فروری 1991ء میں یہ رپورٹ آئی تھی کہ کنان پوش پورا کے چھوٹے سے قصبے میں 53 عورتوں کا گینگ ریپ کیا گیا جبکہ مردوں کو یا تو ٹھٹھرتی سردی میں باہر کھڑا کر دیا گیا یا انہیں گھروں میں تالے لگا کر ان سے تفتیش کی گئی۔ جن سپاہیوں کی شناخت ہوئی ان کا تعلق فورتھ راجپوت رائفلز سے تھا۔ تین مختلف تحقیقات کے بعد یہ رپورٹ مرتب کی گئی کہ عورتوں کے بیانات درست نہیں تھے۔ (27)

اس سے بھارتی سیکولرازم اور جمہوری انصاف کا پتہ چلتا ہے!

عوام کی جدوجہد کو کچلنے کیلئے جن جگہوں پر فوج وسیع پیمانے پر متعین ہے ان میں سے غالباً ایک کشمیر ہے۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے۔

> 1990ء کی دہائی میں ساری ریاست کے اندر جو بھارتی قابض فوج تعینات تھی اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ 6 لاکھ کے لگ بھگ تھی جو دنیا کے کسی بھی خطے میں فوجیوں اور شہری آبادی کا سب سے بڑا تناسب ہے۔ اس تعداد میں بھارت کی باقاعدہ فوج کی 33 ڈویژن میں

سے تقریباً آدھی، بارڈر سیکیورٹی فورسز (بی ایس ایف 100,000) اور جموں وکشمیر پولیس (30,000) شامل ہیں۔ (28)

جب سے بغاوت کا احیاء ہوا ہے جنگجوؤں یا مشتبہ جنگجوؤں کو ایذارسانی بھارتی ریاستی تشدد کا ایک حصہ بن گیا ہے جس کے ذریعے وہ اطلاعات حاصل کرتے ہیں، اعتراف پر مجبور کرتے ہیں اور سزا دیتے ہیں۔

عمومی طور پر ایذارسانی میں بجلی کے جھٹکے دیے جاتے ہیں۔ مار پیٹ کی جاتی ہے یا ٹانگوں کے پٹھوں پر بھاری رولر چلائے جاتے ہیں جس سے پٹھوں کو اس قدر شدید نقصان پہنچتا ہے کہ گردے کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ انسانی جسم کے دیگر اعضاء کے ساتھ غیر انسانی سلوک جن میں جنسی ایذارسانی شامل ہے کی رپورٹیں بھی موصول ہوئی ہیں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ جموں وکشمیر میں 63 تفتیشی مراکز ہیں جہاں ایذارسانی ایک معمول ہے۔ ان میں سے زیادہ تر مراکز بارڈر سیکیورٹی فورسز (بی ایس ایف) اور سی پی آر ایف (سنٹرل ریزرو پولیس فورس) چلاتی ہیں۔ کتنے لوگوں کو ایذارسانی کے ذریعے موت کے گھاٹ اتارا گیا اس بارے میں متضاد اعدادوشمار پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن گزشتہ 16 سالوں کے دوران یہ تعداد ہزاروں تک جا پہنچتی ہے۔

اگر امن عامہ کو خطرہ لاحق ہو تو ایک سال تک اور اگر ریاستی استحکام کو خطرہ لاحق ہو تو دو سال تک فرد جرم عائد کیے بغیر گرفتاری کی اجازت ہے۔ نظام قانون اور انصاف کی حیثیت ایک کھلواڑ سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ کوئی بھی عدالتی احکامات کی پابندی نہیں کرتا جو کبھی کبھار ہی جاری کئے جاتے ہیں۔

سماجی معاشی تباہی

ماضی میں کشمیر کو نئی دہلی سے جو فنڈز ملتے تھے وہ زیادہ تر حکمران اشرافیہ کی جیب

میں چلے جاتے تھے۔ چاہے حکومت کی سربراہی شیخ عبداللہ کے پاس رہی ہو، بخشی غلام محمد کے پاس یا جی ایم شاہ کے پاس وہ ایک چیز جس کی وجہ سے کشمیر کی انتظامیہ بدنام ہے وہ بدعنوانی ہے۔اس لئے مرکز سے ملنے والی امداد سے عام کشمیریوں کو بہت کم فائدہ حاصل ہوا ہے۔

کشمیر کو مرکز کی طرف سے جو فنڈز دیے جاتے تھے ان میں سے صرف 30 فیصد گرانٹ کی شکل میں اور 70 فیصد قرضوں کی شکل میں دیے جاتے تھے جو سود کے ساتھ واپس کرنا پڑتے تھے۔ یہ تناسب باقی ماندہ ریاستوں کو دیے جانے والے 90 فیصد گرانٹ اور دس فیصد قرضے کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔قرض کی اتنی بڑی شرح کا مطلب یہ تھا کہ مرکز سے گرانٹ لینے سے ریاست کی مالی حیثیت اور بھی زیادہ خراب ہورہی تھی:

> بڑھتے ہوئے سالانہ بجٹ خساروں کے زیادہ تر حجم کا سبب مرکزی حکومت کو ادا کیے جانے والے سود کا بوجھ ہے۔ 2-2001ء کے بجٹ میں مجوزہ خسارہ تقریباً 370 کروڑ روپے تھا' جس میں تقریباً 300 کروڑ روپے سود کی مد میں ادا کئے گئے تھے۔(29)

تقریباً گزشتہ دس سال سے مرکز سے ملنے والے فنڈ کا ایک بڑا حصہ کشمیر میں سیکیورٹی برقرار رکھنے کیلئے خرچ کیا جارہا ہے۔

جو امداد لوگوں تک پہنچ رہی تھی اس میں سے بہت کم ریاستی معیشت یعنی صنعتوں وغیرہ کی تعمیر پر خرچ کیا جاتا تھا۔جی ایم شاہ نے اندر کمار گجرال کی موجودگی میں اندرا گاندھی سے شکایت کی تھی کہ:

> بھارت کشمیر پر کروڑوں خرچ کر رہا ہے لیکن کشمیر میں بہت کم۔اگر میں آپ کو بتاتا کہ امن وامان کی صورتحال کے پیش نظر مزید ایک ڈویژن فوج درکار ہے تو آپ آنکھ جھپکائے بغیر یہ بھیج دیتیں لیکن اگر میں آپ

سے دو فیکٹریاں لگانے کو کہوں تو آپ مجھے بیس ایسی وجوہات بتائیں گی کہ یہ کیونکر نہیں ہوسکتا۔(30)

گجرال نے جو کشمیر کے حوالے سے وزرائے مملکت کی کمیٹی کا کنو ینر تھا بعد میں لکھا تھا:

> لیکن مجھے انتہائی افسوس اور پژمردگی کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہماری کامیابیاں انتہائی معمولی نوعیت کی تھیں۔ ہم دو فیکٹریاں لگانے میں کامیاب ہوگئے لیکن ہم روزگار کی صورتحال میں کوئی فرق پیدا نہیں کر سکے۔ زراعت میں کچھ ترقی ہوئی لیکن یہ کوئی بڑی کامیابی نہیں تھی کیونکہ زراعت اور پھل تو بہرحال پیدا ہو ہی رہے تھے۔ جو رعائتیں دی گئیں ان سے جموں کے علاقے کی صنعتوں نے استفادہ حاصل کیا لیکن کشمیر میں کچھ خاص نہیں ہو پایا تھا۔ بڑی ناکامی یہ ہے کہ ہمیں پبلک سیکٹر میں سرمایہ کاری پر زیادہ توجہ مرکوز کرنی چاہیے تھی۔(31)

صنعت کاری میں ہونے والی سرمایہ کاری درحقیقت نہ ہونے کے برابر ہے۔ بھارتی بورژوازی اور ریاست نے درحقیقت صنعت کے شعبے میں قطعاً کوئی سرمایہ کاری نہیں کی ہے۔محض حکومتی سیکٹر میں کنجوسی سے اسمبلنگ یونٹس پر مشتمل دو ناکافی فیکٹریاں لگائی گئی ہیں جن میں سے ایک میں 5 کروڑ اور دوسری میں 50 لاکھ کی سرمایہ کاری کی گئی ہے۔

کشمیر کی معیشت کا وہ واحد شعبہ جس کی کارکردگی بہتر تھی وہ دستکاریوں کا شعبہ تھا.... شالوں، قالینوں، پیپر ماشی وغیرہ کی پیداوار کا شعبہ۔ 1989ء تک یہ شعبہ اتنی زیادہ وسعت اختیار کر گیا تھا کہ یہ جی ڈی پی کا 6 فیصد تھا۔لیکن اپنی تعریف کی روح سے ان کا شمار گھریلو صنعتوں میں ہوتا ہے جن میں بہت تھوڑی تعداد میں لوگوں کو روزگار ملتا ہے اور آمدنی بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ آمدن کا دوسرا بڑا ذریعہ سیاحت

تھی۔ایک اندازے کے مطابق 1983ء میں ریاست کی آمدن کا ایک تہائی اس سے حاصل ہوتا تھا۔تاہم لڑائی کی وجہ سے سیاحت ماند پڑ گئی۔

نئی دہلی کی طرف سے کشمیر میں کی جانے والی سرمایہ کاری زیادہ تر سڑکوں اور ذرائع مواصلات کو بہتر بنانے تک محدود تھی جن میں زیادہ قابل ذکر جموں سری نگر ہائی وے ہے۔اس کا بنیادی مقصد دفاعی نوعیت کا تھا کیونکہ اس سے ریاست کے اندر فوج اور ہتھیاروں کی ترسیل میں آسانی پیدا ہو رہی تھی۔

اگر بھارت اور کشمیر کی تجارت کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک نوآبادیاتی طرز کا معاملہ ہے جہاں ''نوآبادی'' کشمیر' حکمرانان دہلی کو خام مال فراہم کرتا ہے اور پھر اس کے تیار شدہ مال کی غلامانہ منڈی بن جاتا ہے۔کشمیر کے دو اہم قدرتی ذرائع پانی اور تعمیراتی لکڑی ہیں۔کشمیر سے بھارت میں ریلویز تعمیر کرنے کیلئے لکڑی بھیجی جاتی ہے جس کی وجہ سے جنگلات تباہ ہو گئے ہیں۔وسیع پیمانے پر ناموافق ماحولیاتی اثرات کے علاوہ یہ انتہائی قیمتی اثاثہ دراصل کوڑیوں کے مول فروخت کیا گیا جس سے نہ صرف کرنٹ ریونیو کو کوئی خاطر خواہ مالی فائدہ حاصل نہیں ہوا ہے بلکہ ریاست کی مستقبل کی امکانی آمدن اور ریاست کی خود انحصاری کی اہلیت بھی ختم ہو گئی ہے۔جہاں تک پانی کا تعلق ہے یہ بجلی پیدا کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہ بجلی کشمیر کو نہیں بلکہ بھارت کو سپلائی کی جاتی ہے۔

> دسمبر کے وسط میں جب سری نگر میں ہفتے کے تین دن تک بجلی نہیں ہوتی تھی' سلال ڈیم سے شمالی گرڈ کو بجلی فراہم کی جا رہی تھی۔ایسا غالباً دہلی کی ضروریات پوری کرنے کیلئے کیا جا رہا تھا۔(32)

کشمیر کی سب سے بڑی برآمدی جنس پھل دہلی میں نیلامی کی قیمتوں پر فرخت ہوتا ہے اور ایک اندازے کے مطابق کشمیر میں یہ پھل اگانے والے اس نیلامی کے بھاؤ کا 20 فیصد وصول کرتے ہیں۔

جموں وکشمیر اور بھارت کے درمیان کسٹمز کی رکاوٹیں اس وقت اٹھائی گئیں جب شیخ عبداللہ کی جگہ 1953ء میں بخشی غلام محمد وزیراعلیٰ بنا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عمل کا فائدہ بھارت کو پہنچا۔ بھارت سے کشمیر کو ہونے والی برآمدات، درآمدات کا چار گنا ہیں۔ عوامی استعمال کی تقریباً تمام تر اشیاء جن میں اشیائے خوردونوش اور ایندھن شامل ہے بھارت سے ریاست میں آتی ہیں۔

بحیثیت مجموعی جموں وکشمیر کی معیشت کا بہت زیادہ انحصار نئی دہلی پر ہے۔ اس سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ انحصار کم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی گیا ہے۔

> 1950-51ء میں محض 3.7 فیصد ریونیو مرکزی حکومت سے آتا تھا اور 96.2 فیصد ریاست اپنے ذرائع سے پورا کرتی تھی۔ 1987-88ء تک یہ تناسب الٹ چکا تھا: 27.95 فیصد ریاست اپنے ذرائع سے پورا کرتی تھی اور 72.04 نئی دہلی سے آتا تھا۔ جب سے تصادم شروع ہوا ہے یہ عمل تقریباً مکمل طور پر الٹ چکا ہے۔ (33)

دیہی علاقوں کے سکولوں پر سیکیورٹی فورسز نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ یونیورسٹیوں کے کیمپس بھی انہی کے قبضے میں ہیں۔ سرکاری اعدادوشمار سے پتہ چلتا ہے کہ 1993-94ء میں سکول محض 93 دن کھلے رہے اور 1994-95ء میں 140 دن۔ بعد کے دور میں جبری تالہ بندیوں اور ہڑتالوں، حکومتی دفاتر، پلوں اور بسوں پر حملوں اور پولیس اور انٹیلی جنس کے افسروں کے قتل سے حکومت بہت زیادہ حد تک مفلوج ہو کر رہ گئی۔ خود فاروق عبداللہ نے بغاوت کی اس تیز رفتار اٹھان کے اہم ترین سبب کا اعتراف کیا تھا۔ نئی دہلی میں 15 اپریل 1994ء کو ایک انٹرویو میں اس نے کہا،

> ہم ملازمتیں دینے اور بدعنوانی کی روک تھام کرنے میں ناکام

رہے تھے۔ہم فیکٹریاں اور بجلی گھر فراہم کرنے میں ناکام رہے تھے۔
ہر ایک مرحلے پر ہمیں وہ امداد نہ ملی جس کی ہم نے اس وقت توقع کی تھی
جب ہم کانگریس کے ساتھ شامل ہوئے تھے .... میں کیا کرسکتا ہوں؟
اس کے باوجود کہ ہم نے گزشتہ دو سالوں کے اندر 2000 انجینئروں کو
ملازمتیں دی ہیں ابھی بھی 3000 انجینئر ملازمتوں کے منتظر
ہیں۔(34)

کشمیری نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بیروزگار تھی۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جسے فاروق عبداللہ سمجھ تو رہا تھا لیکن اس کا مداوا کرنے سے قاصر تھا۔تقریباً دس ہزار گریجویٹ بے روزگار تھے۔ جو لوگ سکول کی تعلیم سے فارغ ہوکر بے روزگار تھے ان کی تعداد چار ہزار سے پانچ ہزار تھی۔ داخلے کے عمل میں بدعنوانی کے الزامات سے بھی لوگ بیگانگی کا شکار ہوئے۔

یونیورسٹی آف کشمیر کے ایک لیکچرر نے بتایا کہ 1980ء کی دہائی
میں ذہین طلباء کو کالجوں میں اس وقت تک داخلہ نہیں ملتا تھا جب تک کہ
وہ سیاستدانوں کو رشوت نہ دیتے۔اس تمام تر عمل کے باعث نظام سے
یقین اٹھ گیا اور بالآخر اس کا نتیجہ بغاوت کی صورت میں برآمد
ہوا۔(35)

طبی سہولتیں ناکافی ہیں اور ہسپتالوں میں حفظان صحت کی صورتحال خراب ہے۔ ڈاکٹروں کو بے تحاشا کام کرنا پڑتا ہے اور کئی ایک وہاں سے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ کچھ ڈاکٹروں کو گن پوائنٹ پر زخمی جنگجوؤں کا علاج کرنے کیلئے بھی لے جایا گیا۔

بچوں کے حفاظتی ٹیکوں کے پروگرام کم ہوگئے ہیں۔ بغاوت میں اضافے سے عوام کی صورتحال خراب تر ہوگئی ہے۔ 1989ء میں مزاحمت کی اس نئی لہر کے شروع ہونے سے پہلے بھی بھارتی قابضین کشمیری عوام کے معیار زندگی کو بہتر بنانے یا ان کے سماجی' معاشی حالات کو بہتر بنانے میں ناکام رہے تھے۔

مجرمانہ انصاف

انٹرنیشنل کمیشن آف جیورسٹس کی کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے 1994ء کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ:

> تفتیش کے دوران ایذارسانی درحقیقت ایک معمول ہے۔ایذارسانی بجلی کے جھٹکوں سے لے کر مار پیٹ' تشدد کی دیگر شکلوں اور جنسی تشدد تک پھیلی ہوئی ہے... صورتحال اس حقیقت کے پیش نظر اور بدتر ہو جاتی ہے کہ عدالتی کاروائی میں ایسے اعتراف قابل قبول ہوتے ہیں جن پر لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے۔(36)

ایمنیسٹی انٹرنیشنل نے تبصرہ کیا تھا کہ'

> ''جموں وکشمیر میں وحشت اور ایذارسانی ناقابل یقین ہیں۔''(37)

مختلف سیکیورٹی فورسز کے اپنے اپنے تفتیشی مراکز ہیں۔ساری ریاست میں ان کی تعداد درجنوں پر محیط ہے جن میں سے صرف سری نگر کے مضافات میں تقریباً 30 ہیں۔ان میں ہری نواس کا بدنام زمانہ مرکز بھی ہے جو پہلے ایک محل تھا جسے کشمیر کا مہاراجہ استعمال کیا کرتا تھا۔ان مراکز میں ایذارسانی کا بے تحاشا استعمال کیا جاتا ہے۔اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ کئی سو' بلکہ غالب امکان یہ ہے کہ ہزاروں افراد مارے گئے ہیں یا غائب ہو گئے ہیں۔

ایک بھارتی اخبار کے نامہ نگار کی رپورٹ کے مطابق:

> ان (کشمیری نوجوانوں) میں سے بہت کم ان تفتیشی مراکز میں شدید ایذارسانی کے بعد جن کی حیثیت ٹارچر سیلوں کی سی ہے رہائی حاصل کر پاتے ہیں... لیکن بعض اوقات آدمی یہ سنتا ہے کہ ایسی نعشیں دریائے جہلم میں تیرتی ہوئی یا سڑکوں پر پڑی نظر آتی ہیں جن کا حلیہ بگڑا ہوتا ہے۔کشمیر میں پولیس حراست میں اموات ایک معمول ہے۔(38)

کشمیر بار ایسوسی ایشن کے ہیومین رائٹس ڈویژن کا چیئرمین عبدالمجید ملک دعویٰ

کرتا ہے کہ:

> حراست میں اموات کی صورتحال اس قدر خراب ہے کہ وہ کشمیری جنہیں ایذارسانی کے بعد رہا کر دیا جاتا ہے انہیں خوش قسمت خیال کیا جاتا ہے اور انہیں مبارک باد دی جاتی ہے کہ کم ازکم وہ زندہ اپنے خاندانوں تک واپس پہنچ گئے ہیں!(39)

کشمیر میں یہ بھی ایک معمول ہے کہ لوگ ''غائب ہو جاتے ہیں'' ان لوگوں کو ''گمشدہ افراد'' کہا جاتا ہے اور بڑے پیمانے پر کشمیری یہ سمجھتے ہیں کہ سیکیورٹی فورسز انہیں غائب کر دیتی ہیں۔آئی اے ایس کے ایک سینئر افسر آشوک جیٹلے جسے اس مسئلے کو حل کرنے کیلئے ریاست میں لایا گیا تھا 81 ''گمشدہ افراد'' کو ڈھونڈنے کی کوشش میں ناکام رہا۔ بعد میں اس نے درخواست کی کہ اس کا تبادلہ کہیں اور کر دیا جائے۔

کشمیر میں ماورائے عدالت قتل بھی عام ہیں۔عمومی طور پر حکام یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ مشتبہ افراد مقابلے میں مارے گئے یا عام شہریوں کی ہلاکت کی صورت میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ وہ کراس فائر کے ''حادثہ'' میں مارے گئے۔

> ورسنگ ایک بھارتی سول افسر کا حوالہ دیتا ہے جسے گمان تھا کہ اس طرح کی ہلاکتیں ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ ہیں جو سیکیورٹی فورسز نے پنجاب کے تجربے سے سیکھا ہے۔اس نے بتایا کہ وہاں سیکیورٹی فورسز سخت گیر سکھ جنگجوؤں کو آسانی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارنے کیلئے جعلی مقابلوں کا استعمال کرتی تھیں.... اس کے اندازے کے مطابق یہ ماڈل کشمیر میں درآمد کیا گیا تھا تاکہ کشمیری جنگجوؤں کے ہاتھوں بی ایس ایف کے اہلکاروں اور ان کے خاندانوں پر ہونے والے حملوں اور ان کے اغواء کی روک تھام کی جا سکے۔(40)

شہری حقوق کیلئے سرگرم کارکن اس کے پیچھے ایک اور مقصد کارفرما دیکھ رہے ہیں:

> مشتبہ افراد کی ماورائے عدالت ہلاکتیں بغاوت کا مقابلہ کرنے کا

سب سے زیادہ کارگر بلکہ واحد کارگر طریقہ تھا۔ بھارت میں عوامی مقدمات بہرحال بدنامی کی حد تک سست رفتار، مہنگے اور غیر یقینی نتائج کے حامل تھے۔(41)

سیکیورٹی فورسز کے اہل کاروں کی طرف سے عام شہریوں کی ہلاکتوں کا ایک تیسرا سبب جنگجوؤں کے حملوں کا بدلہ لینا ہے۔ چونکہ وہ ہمیشہ ذمہ دار افراد پر براہ راست ہاتھ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوتے اس لئے غضبناک سپاہی عام لوگوں پر اپنی بھڑاس نکالتے ہیں۔ ایشیاواچ کی رپورٹ معمول کے اس عمل کی وضاحت کرتی ہے:

جنگجوؤں کی طرف سے گولی چلنے یا گرنیڈ کے حملے کی زد میں آنے کے بعد اکثر اوقات گھنٹوں کے اندر اندر سیکیورٹی فورسز آس پاس کے علاقے کو گھیرے میں لے لیتی ہیں جس کے بارے میں ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہاں سے حملہ کیا گیا تھا اور گھر گھر تلاشیاں لیتے ہیں۔ جن شہریوں پر جنگجوؤں کی مدد کرنے کا شبہ ہوتا ہے ان کو مارنا پیٹنا ایک معمول ہے اور بعض معاملات میں ان کو گرفتار کرلیا جاتا ہے یا انہیں گولی ماردی جاتی ہے۔(42)

پرہجوم بازاروں میں فوج کی طرف سے بلا امتیاز فائرنگ کے واقعات ریکارڈ پر ہیں جن میں سے بدترین 6 جنوری 1993ء میں سوپور میں ہوا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق 100 افراد گولی یا آگ لگنے سے مارے گئے تھے۔ سوپور کے واقعے پر ایمنیسٹی کی رپورٹ میں کہا گیا تھا:

''سپاہی بے قابو ہوگئے تھے۔ وہ ہر طرف فائرنگ کررہے تھے۔''(43)

شکست خوردہ جبر

اس کے باوجود بھی وہ مزاحمت کو دبانے اور عوامی بغاوت کو کچلنے میں ناکام

رہے ہیں۔خود بھارتی فوج کے اندر وسیع پیمانے پر بغاوت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔بھگوڑوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ سپاہیوں میں یہ رجحان زیادہ پایا جاتا ہے۔کئی ایک ایسے واقعات ہیں جن میں سپاہیوں یا چھوٹے افسروں نے اپنے اعلیٰ افسروں یا ساتھیوں کو قتل کیا ہے۔

> کشمیری عوام کی نظروں میں ولن اور بھارتی اشرافیہ کی ہیرو بھارتی فوج ایک بیدار قوم کو دبانے اور ریاست کو اپنا مطیع بنانے میں 5000 سے زیادہ فوجی گنوا چکی ہے۔آخر محنت کش طبقے اور غریب کسان گھرانوں سے تعلق رکھنے والے ان سپاہیوں نے اپنی جان کس لئے گنوائی ہے؟ اس تمام تر خون خرابے کے باوجود وہ مسئلہ حل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔اور اب ان کیلئے ضروری ہو گیا ہے کہ ''قومی تحفظ'' کے ظالمانہ اندازوں کی بجائے وہ سیاسی عمل کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔(44)

اپریل 2003ء میں واجپائی کی طرف سے اچانک امن کے لئے بڑھنے والا ہاتھ اتنا اچانک بھی نہیں تھا۔دراصل یہ ایک ڈھکا چھپا اعتراف تھا کہ بھارتی ریاست مزاحمت کو شکست دینے میں ناکام ہو گئی ہے۔حال ہی میں بھارت کی طرف سے ''امن کے عمل'' کی طرف آگے بڑھنے کے حوالے سے بھارتی تناظر میں یہ ایک اہم عنصر رہا ہے۔

لیکن نام نہاد امن کے عمل کی دعوت کے بعد دو سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود کشمیریوں کیلئے کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے اور تعطل جاری وساری ہے۔اجے شکلا انڈین ایکسپریس میں لکھتا ہے:

> بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے قریب آئے لیکن کشمیری ہمیشہ کی طرح بیگانگی کا شکار ہو کر دور سے ہی دیکھ رہے ہیں۔ بھارتی فوج کے گھٹن زدہ سرد سائے تلے رہتے ہوئے کشمیری لائن آف کنٹرول پار کر

کے مظفرآباد تو جا سکتے ہیں لیکن نیچے مارکیٹ تک جانا اب بھی معمول کی ایک آزمائش ہے... وزیراعظم من موہن سنگھ کے جموں و کشمیر میں افواج کم کرنے کے اعلان کے پانچ ماہ بعد وادی کے مکینوں کیلئے بھارت کا چہرہ کچھ اس طرح کا ہے: وردی میں ملبوس افراد ہر جگہ نظر آ رہے ہیں۔ سیکیورٹی دستے گاؤں گاؤں' گھر گھر گشت کر رہے ہیں' مشین گنوں کے پیچھے سے سنتری گھورتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شناختی دستاویزات کا غیر مہذبانہ مطالبہ کیا جاتا ہے جنہیں چند لمحوں پہلے ایک اور سنتری نے ایک اور چیک پوسٹ پر دیکھا ہوتا ہے۔ زیادہ تر کشمیریوں کیلئے امن کا عمل کسی دوسری دنیا میں ہو رہا ہے۔(45)

جموں و کشمیر کے حوالے سے نئی دہلی کی حکمت عملی' جو ہمیشہ سیکیورٹی نہ کہ سیاست کے حوالے سے تشکیل دی جاتی ہے' یہ رہی ہے کہ شورش میں شامل ہونے والے پرانے جنگجوؤں کو اتنی تیزی سے مارا جائے کہ نئے ان کی جگہ نہ لے سکیں۔ جموں و کشمیر میں جو بھی یونٹ داخل ہوتی ہے وہ اپنے پیش رو یونٹ سے زیادہ جنگجو مارنے کی تاک میں ہوتی ہے۔

مقابلے کی ایک فضا میں جہاں ایوارڈ' اعزازت اور بالآخر ترقی براہ راست جنگجوؤں کے سروں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے وہاں کسی آپریشن میں دل اور دماغ جیتنا دوسرے درجہ کا ایک گھٹیا آپشن بن جاتا ہے۔ فوجی سربراہ کا یہ وعدہ کہ فوجی یونٹوں کی کارکردگی کا جائزہ ان کے انسانی حقوق کے ریکارڈ سے لگایا جائے گا اس سادہ حقیقت سے متصادم ہو جاتا ہے کہ جیتے گئے دلوں کو گننا مشکل ہے جبکہ جنگجوؤں کی نعشوں کو گننا کہیں زیادہ آسان ہے۔ اس طرح کی فضا میں انسانی حقوق پامال ہوتے ہی ہیں۔ لیکن ان زیادتیوں کے نہ ہونے کے باوجود بھی محض ایک ایسی فوج کی موجودگی ہی شدید تلخی کا سبب بن جاتی ہے جسے قابض فوج سمجھا جا رہا

ہو۔ ہندواڑہ میں کشمیری خواتین کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے خلاف گزشتہ برس جوہجوم گلے پھاڑ پھاڑ کرانصاف کا مطالبہ کررہا تھاوہ محض اس ایک واقعے کے خلاف احتجاج نہیں کررہا تھا۔ درحقیقت وہ اپنی بھڑاس نکال رہے تھے۔ وہ مشتبہ حالت میں زندہ رہنے کی ذلت' دن اوررات کے کسی بھی لمحے تلاشی اورتفتیش کی بے چارگی کے خلاف سراپا احتجاج تھے۔ بھارتی ریاست کی کامیابی کا اظہار کرنے کیلئے فوج نے 5000 افراد گنوائے۔ عام حالات سے تین گنا زیادہ چیک پوسٹیں ہیں جہاں سے گزرنے والے ہرمقامی آدمی کی مکمل تلاشی لی جاتی ہے۔لیکن اس کا نتیجہ یہ نہیں نکلتا کہ عام حالات سے تین گنا زیادہ لوگوں کی تلاشی لی جاتی ہے بلکہ اکثر نفرت میں تین گنا زیادہ اضافہ ہوجاتا ہےاور تاخیر میں بھی تین گنا اضافہ ہوجاتا ہے۔''(46)

کشمیری عوام کی بھارتی برتری اور جبر کے خلاف اتنی طویل جرات مندانہ جدوجہد کی جدید تاریخ میں کم ہی مثالیں ملتی ہیں۔لوگوں کی قربانیاں' عزم اور بار بار ابھرنے کی قوت حیران کن ہے۔لیکن اس قدر بھرپور اور جرات مندانہ تحریک اور جدوجہد اپنی منزل یعنی آزادی کشمیر حاصل نہیں کر پائی ہے۔اس کی کئی ایک وجوہات ہیں جن کا ہم بعد کے ابواب میں ذکر کریں گے۔مصائب کچھ اس قدر زیادہ ہو چکے ہیں کہ وقت کو پیچھے نہیں موڑا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ وادی کی زیادہ تر سویلین آبادی جنگ سے اکتا چکی ہے۔لیکن لوگ معمول کی زندگی کی طرف اس لئے نہیں لوٹنا چاہتے کیونکہ اس کا مطلب سٹیٹس کو کی طرف لوٹنا ہے۔

بھارت تیسری دنیا کا نسبتاً ایک پسماندہ ملک ہے جہاں کروڑوں لوگ افلاس کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ یہ تاریخی مادیت کا ایک عجائب گھر ہے یہاں کا حکمران طبقہ یہاں کی بے تحاشا آبادی کو ایک تاریک عہد اور قابل رحم زندگی سے باہر نکالنے میں ناکام رہا ہے۔ پھر بھی بھارت کا حکمران طبقہ اس قدر احساس برتری کا شکار ہے کہ وہ

اس وسیع و عریض ملک کے کرب کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ زار شاہی کے روس کی طرح بھارت بھی خود تباہ کن سامراجی غلبے کا شکار ہونے کے باوجود خود جارحانہ سامراجی عزائم بھی رکھتا ہے۔ نہ صرف بھارت' بھارتی یونین کے اندر موجود مختلف قومیتوں پر جبر کر رہا ہے بلکہ یہاں کہ حکمران طبقے نے خطے کے چھوٹے ممالک کی طرف بھی سامراجی رویہ اپنا رکھا ہے۔ بھارتی بورژوازی کی یہ سامراجی سوچ اس کی جموں وکشمیر کی پالیسی میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔

جے پرکاش نرائن کے اس بیان کہ کشمیر کے مسئلے کا حل الحاق کی حدود کے اندر تلاش کیا جائے کا مطلب یہ ہے کہ کشمیر کے مسئلے کو بھارتی حکمران طبقے کی کثیف عینک سے دیکھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ بھارت کشمیری عوام کو درپیش سماجی معاشی مسائل میں سے ایک بھی حل نہیں کر سکتا۔ اس نظام کے تحت کوئی حقیقی دیرپا حل ممکن نہیں ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ داری کے اندر رہتے ہوئے اصلاحات اور ساز باز کرنے کی صلاحیت اور گنجائش بہت تیزی سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس گھناؤنے نظام حکمرانی میں کشمیر ایک رستا ہوا زخم اور دہکتا ہوا آتش فشاں ہے اور رہے گا جو ہر بار اور زیادہ بڑے دھماکے سے پھٹے گا۔ اور یہ آتش فشاں بھارتی سرمایہ دارانہ ریاست کی بنیادوں کو ہلاتا رہے گا۔

اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ دونوں جانب کی کمیونسٹ پارٹیاں اور بائیں بازو کی دیگر قوتیں قومی مسئلے پر لینن کے موقف کی بنیاد پر ایک انقلابی پالیسی اختیار کریں۔ کشمیر کی جدوجہد آزادی کو برصغیر کی دیگر فرسودہ حکومتوں کے خلاف جدوجہد سے منسلک کرنا ضروری ہے۔ بھارت کی بھاری بھرکم ریاست کشمیر میں مزاحمت کو کچلنے میں ناکام رہی ہے۔ اب کشمیر کی انقلابی تحریک کو بھارتی سرمایہ دارانہ ریاست کو شکست فاش دینی ہوگی۔

باب نمبر 6

آزاد کشمیر کا کرب

بربادٔ انہاں آزادیاں توں
ہوئے تسی وی اوٗ تے ہوئے اسی وی آں
لالی اکھیاں دی پئی دسدی اے
روئے تسی وی اوٗ تے روئے اسی وی آں

استاد دامن (1)

دھوکوں کی سیاست

جب 14-15 اگست 1947ء کو برصغیر برطانوی تسلط سے آزاد ہوا تو تاریخ میں پہلی بار 1589ء میں یعقوب شاہ چک کی اکبر کے ہاتھوں شکست کے بعد ایسا وقت آیا جب کشمیر ''آزاد'' ہوا تھا۔لیکن یہ آزادی محض 73 دن تک ہی قائم رہ سکی۔12 اگست کو ہری سنگھ نے ٹیلی گراموں کے ایک تبادلے کے ذریعے حکومت پاکستان سے معاہدہ قائمہ (Stand Still) کیا۔اس معاہدے کے تحت یہ

یقین دہانی کرائی گئی کہ مواصلات، سفر اور تجارت کی سہولیات اسی طرح جاری رہیں گی جس طرح برطانوی راج کے دوران موجود تھیں۔ معاہدے کے تحت ریلوے کا کنٹرول پاکستان کے پاس رہنا تھا۔ اس کے علاوہ دریاؤں کا انتظام و انصرام بھی پاکستان کے حصے میں آیا تھا کیونکہ دریائے جہلم کے ذریعے کشمیر کی لکڑی کو میدانی علاقوں تک پہنچایا جاتا تھا۔ بھارت نے تاہم ایسا کوئی معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے پاکستانی حکمرانوں میں یہ شکوک وشبہات پیدا ہو گئے کہ بھارتی حکومت کشمیر کے مستقبل بارے اپنی ہی کوئی منصوبہ بندی کر رہی ہے اور وہ اس خیر سگالی معاہدے سے کسی طرح متفق نہیں ہے۔

> ہری سنگھ اور پاکستان کے درمیان ہونے والا معاہدہ اصل حقائق پر پردہ ڈالنے کے لئے تھا تا کہ پاکستان کو لوری دے کر سلایا جا سکے اور پس پردہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ (2)

سکوفیلڈ، تقسیم کے دوران کی جموں و کشمیر کی صورتحال کے بارے لکھتی ہے؛

> ریاست جموں و کشمیر میں مسلم لیگ کے حامی موجود تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ آزادی کے بعد وہ لوگ پاکستان کا حصہ بن جائیں گے۔ اور جب 14 اور 15 اگست کی درمیانی شب تقسیم کا اعلان ہوا تو ان لوگوں نے جشن منائے۔ تقریباً سبھی ڈاک خانوں پر پاکستانی پرچم اس وقت تک لہرایا گیا جب تک مہاراجہ نے اسے اتارنے کا حکم نہیں دیا۔ تمام پاکستان نواز اخبار بند کر دیے گئے۔ (3)

آزادی کے بعد کے کئی ہفتوں کے دوران بھی، ہری سنگھ کے معاہدے کے ہو جانے کے باوجود ، سیاسی سازشوں اور جوڑ توڑ کا سلسلہ ہر طرف جاری رہا۔

> پاکستان اور بھارت دونوں واقعات کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں رکھنے کی سر توڑ کوششیں کر رہے تھے تا کہ کشمیر کسی نہ کسی طرح ان کے زیر نگیں ہو جائے۔ بھارت کو اس حوالے سے برتری رہی، اس کے

باوجود کہ مہاراجہ نہرو کو سخت ناپسند کرتا تھا لیکن پھر بھی اس نے پاکستان کی نسبت بھارت کے ساتھ باقاعدگی سے اور دلچسپی کے ساتھ گفتگو جاری رکھی۔(4)

13 ستمبر 1947ء کو مہاراجہ نے بھارتی حکومت سے کہا کہ وہ اس کے کمانڈر انچیف کیلئے میجر جنرل سکاٹ کے متبادل کوئی بھارتی فوجی افسر ادھار دے۔ بھارت کے ساتھ مواصلات بہتر بنانے کے لئے واضح اقدامات کئے جا رہے تھے جن میں ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور سڑکوں کو بہتر بنایا جا رہا تھا۔

پاکستان کے اندر یہ خیال عام تھا کہ 1947ء کے موسم خزاں میں بھارت کشمیر کے اپنے ساتھ الحاق کا اعلان کر دے گا۔ پاکستانی حکمران حالات کا رخ اپنے حق میں موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی دوران کشمیری حکومت نے پاکستان پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ وہ فوجی مداخلتوں اور سرحدی محاصروں کا مرتکب ہو رہا ہے۔ کشمیر کا نیا وزیراعظم مہر چند مہاجن پہلے ہی بھارت سے درخواست کر چکا تھا کہ وہ اسے ریاست میں پھیلتی گڑبڑ سے نمٹنے کیلئے اسلحہ بارود فراہم کرے۔

بھارت اور پاکستان دونوں نے ریاست جموں وکشمیر کے نئے اور پرانے لیڈروں پر اپنا دباؤ جاری رکھا، یہ سب سفارتی سرگرمیاں اس وقت تعطل کا شکار ہو گئیں جب یہ اطلاع پھیلی کہ پاکستانی پختونخواہ (شمال مغربی سرحدی صوبے) سے بہت سے جنگجو سرحد عبور کر کے کشمیر پر حملے کیلئے پیش قدمی کر رہے ہیں۔ 24 اکتوبر 1947 کو اس قبائلی یلغار کے دوران باغی کشمیری لیڈروں نے ایک تارک الوطن حکومت قائم کرنے کا اعلان کر دیا اور سردار ابراہیم خان کو اس کا صدر مقرر کر دیا۔ آزاد کشمیر کی اس حکومت نے اپنے آپ کو ''جنگی کونسل'' کا نام دیا جس کا مقصد جموں وکشمیر کے باقی علاقے کو آزاد کرانا اور اپنے زیر کنٹرول علاقے کا انتظام سنبھالنا تھا۔ ایک کابینہ تشکیل دی گئی جس میں میر پور، پونچھ، وادی کشمیر اور

جموں سے لوگوں کو وزارتیں دی گئیں۔لیکن وادی سے کوئی حقیقی نمائندگی نہیں تھی۔

اپنی حکومت کو قانونی جواز دینے کے لئے 3 نومبر 1947ء کو آزاد کشمیر حکومت کے قائدین نے مختلف سربراہانِ مملکت سے اپیل کی کہ ان کی حکومت کو تسلیم کیا جائے۔ان سربراہوں میں کلے منٹ اٹیلی (برطانیہ)، ہیری ٹرومین (امریکہ)، جوزف سٹالن (یو ایس ایس آر) اور چین کے چیانگ کائی شیک شامل تھے۔لیکن آزاد کشمیر کو قانونی حیثیت کبھی بھی نہ مل سکی۔ یہ نہ تو خودمختار ریاست ہے اور نہ پاکستان کا صوبہ۔ یو این سی آئی پی کی 13 اگست 1948ء کی قرارداد کے مطابق اس خطے کو مقامی حکومت کے ذریعے اقوام متحدہ کے کمیشن کی نگرانی میں کنٹرول کیا جائے گا۔(5)

جنوری 1949 کے بعد آزاد جموں کشمیر حکومت کا بنیادی کام یہ تھا کہ وہ سیز فائر لائن کے مغربی حصے کا انتظام سنبھالے۔مغربی حصے کا انتظام سنبھالنے والی ایک تارک الوطن حکومت جس کے اقتدار کا مرکز مظفر آباد میں تھا، آگے چل کر ایک مقبول حکومت بن گئی۔ پہلے پہل ہنزہ، گلگت، نگر اور بلتستان بھی اس حکومت کے زیر انتظام ہی تھے تاہم 1949ء میں پاکستان نے ان پر براہ راست کنٹرول کر لیا۔

کٹھ پتلی ریاستیں

پاکستانی حکومت بھارت کے زیر انتظام کشمیر کو بھارت کا مقبوضہ (Indian Held Kashmir) قرار دیتی ہے، جبکہ بھارتی حکومت بھی پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کو اسی نام کے تحت یاد کرتی ہے۔ دراصل دونوں صحیح ہیں۔کشمیر کے دونوں حصے پاکستان اور بھارت کی بورژوا حکومتوں کی ڈھال کا کام کر رہے ہیں۔ ان دونوں حصوں کے دارالحکومت چاہے سرینگر اور مظفر آباد میں ہوں لیکن اصل حکم دہلی اور اسلام آباد کا چلتا ہے۔ نام نہاد آزاد کشمیر میں ایک صدر اور ایک وزیر اعظم بھی پایا جاتا ہے۔لیکن ان دونوں کے اختیارات اسلام آباد کے مرکزی سیکرٹریٹ میں

بیٹھے امور کشمیر کے ڈپٹی سیکرٹری سے بھی کم ہیں، جبکہ امور کشمیر کی یہ وزارت پاکستان کی وفاقی حکومت کی کمزور ترین وزارتوں میں سے ایک ہے۔

سرکاری طور پر آزاد کشمیر 5134 مربع میل طویل پہاڑی سلسلے پر مبنی ایک تنگ پٹی ہے۔جس طرح وادی جموں کشمیر کا حصہ ہے اسی طرح آزاد کشمیر اور 27000 مربع میل پر محیط شمالی علاقہ جات جو سابق گلگت ایجنسی اور بلتستان پر مشتمل ہیں، بھی ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہیں۔

آزاد کشمیر ایک آزاد ملک کی تمام خصوصیات سے مستفید ہو رہا ہے۔اس کا اپنا آئین ،اپنا وزیراعظم ،اپنا صدر ،اپنی قانون ساز اسمبلی ،اپنا عدالتی نظام اور اپنا دارلحکومت وغیرہ سب کچھ ہے۔لیکن اس سب کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ آزاد کشمیر خودمختاری سے قطعی طور پر محروم ہے۔ جہاں تک ریاست کی معیشت اور فوج کا تعلق ہے تو ایسا ہونا ہی تھا۔لوگوں کی بڑے پیمانے پر ہجرت کے باعث افرادی قوت کی کمی نے کشمیر کو معاشی طور پر کمزور کر کے اس کی پیداواری صلاحیت اور ٹیکسوں کی آمدنی کو انتہائی کم کر دیا ہے جس کی وجہ سے اس کا پاکستان پر معاشی انحصار بڑھ گیا ہے۔مثلاً 1989ء میں تعلیم زراعت اور انفراسٹرکچر کی تعمیر کے بجٹ کا 80 فیصد وفاق پاکستان کی طرف سے دیا گیا۔ 1989ء میں خرچ کی جانے والی رقم کا نصف ان منصوبوں پر صرف کیا گیا جن کی منظوری پاکستان کی وزارت خزانہ اور ترقی نے دی تھی۔

ریاست کی سیاسی خودمختاری میں پڑنے والی دراڑیں بہت ہی گہری ہو چکی ہیں۔1952 میں قائم کردہ وزارت کشمیر کے ذریعے پاکستان کی وفاقی حکومت مختلف بہروپ میں کشمیر کے معاملات چلاتی آ رہی ہے۔آج کل آزاد کشمیر کی قانون ساز اسمبلی 48 ارکان پر مشتمل ہے،جن میں سے چالیس منتخب اور باقی آٹھ نامزد ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ یہاں ایک ریاستی کونسل ہے جس کے چودہ میں سے نصف ارکان صدر پاکستان کی طرف سے نامزد کئے جاتے ہیں، جبکہ اس کونسل کا سربراہ بھی

ہوتا ہے۔آزاد کشمیر کی سیاسی خودمختاری اس وقت مزید عیاں ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں ریاستوں میں ایک جیسی ہی سیاسی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ایوب خان آمریت کے دوران متعارف ہونے والے بنیادی جمہوریت کے نظام کو پاکستان اور کشمیر دونوں جگہ لاگو کیا گیا۔اسی طرح ضیاء آمریت کے دوران مسلط کئے گئے تمام تر قوانین بھی دونوں طرف نافذ کئے گئے بے شک ان کے لئے علیحدہ علیحدہ صدارتی آرڈیننس جاری کئے گئے۔

پاکستان کی سبھی حکومتیں ریاست میں اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کرنے کیلئے ہر قسم کی سازشیں کرتی چلی آرہی ہیں۔جب جنرل ضیاء نے جولائی 1977 میں شب خون مارا تو 1976 میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہونے والا مسلم کانفرنس کا رہنما محمد ابراہیم، جوکہ ذوالفقار علی بھٹو کا اتحادی بھی تھا، آزاد کشمیر کا صدر تھا۔ضیاء نے پہلے تو اس پر دباؤ ڈالا کہ وہ استعفیٰ دے جس کے بعد الیکشن کروائے گئے۔الیکشن کے نتیجے میں محمد ابراہیم دوبارہ اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جس پر ضیاء نے اس کو برخاست کر دیا اور اس کی جگہ بریگیڈیر حیات محمد خان کو صدر بنا دیا گیا۔

آزاد کشمیر کی (کاغذی) خودمختاری کو قائم رکھنے کیلئے پاکستان کی دائیں بازو کی تمام بڑی جماعتیں مظفرآباد میں اپنے اپنے مراکز قائم کرنے سے گریز کرتی ہیں۔اس کی بجائے وہ ذیلی پارٹیوں کے ذریعے وہاں کام کرتی ہیں جیسا کہ آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس پاکستان کی سرکاری مسلم لیگ کی برانچ کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔۔صرف پاکستان پیپلز پارٹی ہی واحد استثناء ہے جوکہ 1974ء سے کشمیر میں وجود رکھتی ہے۔اسلام آباد میں قائم حکومت کبھی بھی یہ برداشت نہیں کرتی کہ مظفرآباد میں اس کی مخالف پارٹی یا اس کے مخالفوں کی حکومت قائم ہو۔

1990ء میں بے نظیر کی پہلی حکومت کی برطرفی کے بعد کشمیر میں راجہ ممتاز راٹھور کی حکومت پر اسلامی جمہوری اتحاد (آئی جے

آئی)، اسلام آباد اور کشمیر میں آئی جے آئی کے اتحادی اور صدر کشمیر سردار قیوم خان کی طرف سے بے پناہ دباؤ ڈالا گیا۔ مجبوراً راٹھور کو استعفیٰ دینا پڑا اور نئے الیکشن ہوئے جس کے بعد مسلم کانفرنس اقتدار پر براجمان ہوگئی۔(6)

اسی طرح دائیں بازو کی جماعتوں کی اپنی اپنی شکایات ہیں۔

جولائی 1996ء کے انتخابات کے نتائج الٹ گئے، قیوم خان نے بے نظیر بھٹو پر الزام عائد کیا کہ اس نے وفاقی حکومت کے وسائل اور طاقت کو پیپلز پارٹی کے امیدواروں کو جتوانے کیلئے استعمال کیا۔(7)

اسلام آباد کشمیر کی ریاست کی علیحدہ سیاسی حیثیت کے حوالے سے بہت احتیاط برتتا ہے لیکن شمالی علاقہ جات کو پاکستان کا حصہ بنائے رکھنے میں کوئی عذر نہیں۔ شمالی علاقوں کا انتظام 1947ء میں پاکستان کے پاس اس لئے آگیا تھا کیونکہ ان کا انتظام و انصرام آزاد کشمیر کی نئی قائم شدہ حکومت کے بس کی بات نہیں تھی۔ مظفر آباد کا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ شمالی علاقوں کا یہ الحاق عارضی اقدام ہے اور جب کبھی بھی ہماری حکومت مستحکم ہو جائے گی یہ علاقے پھر سے ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ لیکن یہ واپسی ابھی تک ایک خیال ہی ہے۔ اس کی بجائے پاکستان نے ایک بتدریج الحاق کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ 1972ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے گلگت اور بلتستان کو رسمی طور پر براہ راست وفاق کے ساتھ ملحق کر دیا بعد ازاں ہنزہ کو بھی شمالی علاقہ جات میں شامل کر دیا گیا۔ بھٹو کے بعد ضیاء نے بھی شمالی علاقوں کو پاکستان کا حصہ بنانے کی پالیسی جاری رکھی۔ 1977ء میں شمالی علاقی جات مارشل لاء کے زون E کا حصہ تھے جبکہ اپریل 1982ء میں وفاقی مجلس شوریٰ کے تین ارکان شمالی علاقہ جات سے لئے گئے۔

جولائی میں ضیاء نے واضح طور پر کہہ دیا کہ گلگت، ہنزہ اور سکردو

پاکستان کا ناگزیر حصہ ہیں۔ ہیوٹ لکھتا ہے (ہنزہ سمیت) شمالی علاقہ جات کی آزاد کشمیر سے علیحدگی کے بعد پاکستان سابقہ ڈوگرہ راج کے 25% علاقے کو اپنی (اسلامی) جمہوریہ کا حصہ بنا چکا ہے۔(8)

''آزادی'' کا تجربہ

جب مارچ 1948ء میں مسلم کانفرنس کے رہنما غلام عباس کو سری نگر جیل سے رہا گیا تو وہ بھی پاکستان پہنچ گیا اور آزاد کشمیر حکومت میں سرگرم ہو گیا۔ پہلے تو اسے مہاجرین کی نگرانی اور دیکھ بھال کے فرائض سونپے گئے جن کی تعداد اس وقت دو لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ کچھ مہاجرین تو پاکستان کے بڑے شہروں میں چلے گئے جبکہ ان کی اکثریت سرحدی شہروں سیالکوٹ، گجرات اور گوجرانوالہ میں آباد ہو گئی۔ جبکہ باقی ماندہ مہاجرین 1949ء کے سیز فائر کے بعد اپنے اپنے علاقوں راجواڑی اور مہندر کی طرف لوٹ گئے۔

بھارتی مقبوضہ کشمیر سے مہاجرین کی ایک بڑی تعداد اور اس سے بھی بڑی تعداد میں آزاد کشمیر کے لوگ گزشتہ تین نسلوں بلکہ اس سے بھی زائد عرصے سے پاکستان کے بڑے شہروں میں رہ رہے ہیں۔ یہ لوگ کوئٹہ سے لے کر کراچی اور پنڈی سے لے کر لاہور تک آباد ہیں۔ اگرچہ حکومت پاکستان نے تعلیمی اداروں سمیت دیگر سرکاری محکموں میں کشمیریوں کیلئے خصوصی کوٹے مقرر کیے ہوئے ہیں تاہم سچ یہ ہے کہ گندگی سے بھرے شہروں میں رہنے والی کشمیر کی نئی نسل کی حالت زار انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ وہ لوگ اپنے وطن میں موجود بھوک، محرومیوں اور مشکلات کے باعث ''جنت'' کو چھوڑ کر پاکستانی شہروں میں چھوٹے چھوٹے کام کاج کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ نوجوان ان شہروں کے قہوہ خانوں اور ہوٹلوں میں برتن مانجھ کر پیٹ کا دوزخ پالتے

ہیں۔وہاں ان کی اجرتیں انتہائی کم ہیں اوران کے ساتھ قومیتی تعصب بھی روا رکھا جاتا ہے جس سے ان کی ذہنی اذیت اورمحرومی میں اوراضافہ ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کشمیری نوجوانوں اور طالب علموں کی جتنی تنظیمیں کشمیر میں ہیں اتنی ہی پاکستان کے مختلف شہروں میں ہیں۔کئی جگہوں پر تو وہ پاکستانی تنظیموں سے بھی زیادہ سرگرم اور منظّم ہیں۔پاکستان کے ریاستی ذرائع ابلاغ اور پاکستانی سرمایہ داروں کی ملکیت دیگر نام نہاد آزادمیڈیا دن رات کشمیریوں کی مظلومیت اور کسمپرسی کا رونا روتے رہتے ہیں اوراسی مظلومیت اورکسمپرسی سے وہ سیاسی مفادات بھی حاصل کرتے چلے آرہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا حکمران اور درمیانہ طبقہ اپنے لاشعور میں کشمیریوں کے ساتھ تعصب اورتحقیر کا رویہ رکھتا ہے۔زندہ رہنے کیلئے اوراپنی بقاء کیلئے کشمیریوں کواس عمومی ذلت وتحقیراور حالات کی سختیوں کو جھیلنا اور برداشت کرنا پڑرہا ہے۔

کشمیریوں کی اپر کلاس اوراپر مڈل کلاس جوشروع سے ہی پاکستان کے حکمران طبقے کا حصہ بن گئی تھی اس نے پاکستانی تعصب کومکمل طور پر اختیار کرلیا ہے بلکہ اپنے اظہار میں اس کی شدت پاکستانیوں سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

1950ء کی دہائی میں ’’حکومت آزادکشمیرکے قواعد وضوابط‘‘ کے نام سے ایک آرڈیننس نافذ کیا گیا، جسے بنیادی قانون کے طور پر منظور کیا گیا۔اس قانون کے تحت ریاست کے سربراہ کومکمل بااختیار بنادیا گیا اس وقت ریاست کی سربراہی مسلم کانفرنس کے پاس تھی ۔اس سربراہ کو صدر، وزارتی کونسل کے ارکان، چیف جسٹس سمیت ہائی کورٹ کے ججوں کی تقرری کے اختیارات تفویض کیئے گئے ۔لیکن اس سربراہ کو پاکستان کی وزارت برائے امورکشمیر کے تابع قرار دے دیا گیا۔

شروع میں مسلم کانفرنس مسلم لیگ کا ہی ذیلی ادارہ تھی ۔غلام عباس کی سربراہی میں یہ جماعت آزادکشمیر کی واحد سیاسی پارٹی تھی ۔ پارٹی کے اندر جمہوری روایات نہ

ہونے کے برابر تھیں۔غلام عباس اور سردار ابراہیم کے مابین تعلقات کشیدہ چلے آرہے تھے۔جموں کے کشمیری عباس کے اور پونچھ کے سدھن سردار،ابراہیم میں ثقافتی تال میل نہیں ہو پا رہا تھا۔ابراہیم جو کہ کشمیر کا صدر اور عباس جو کہ آزاد کشمیر حکومت کا سربراہ تھا،کے مابین مفاہمت کی ہر ممکن کوشش کے باوجود خطے میں بیک وقت دو متوازی حکومتیں تھیں۔دونوں قیادتوں کے مابین چلنے والا تنازعہ اس وقت انجام کو پہنچ گیا جب مئی 1950ء میں سردار ابراہیم کو صدارت سے ہٹا دیا گیا۔

پونچھ کے سدھنوں میں اس معزولی کے خلاف شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا گیا۔یہ ردعمل اتنا شدید تھا کہ 50 کی دہائی کے آغاز میں آزاد کشمیر حکومت پونچھ کے علاقے میں بے اثر ہو کر رہ گئی۔

مظفر آباد اور اس کا نواحی،میر پور کا زرخیز علاقہ جو شمالی پنجاب تک پھیلا ہوا تھا،کے علاوہ آزاد کشمیر کا زیادہ تر علاقہ سابقہ مہاراجہ کے دور سے ہی غربت کی زد میں تھا۔اس کے ساتھ ساتھ یہاں کسی قسم کی زرعی اصلاحات بھی نہیں کی جاسکیں جبکہ وادی میں شیخ عبداللہ یہ اصلاحات کر چکا تھا۔فرسودہ جاگیرداری نظام کو جڑ سے نہیں اکھاڑا گیا تھا جس کی وجہ سے حالات زندگی بہت ہی ابتر تھے۔خطے میں سکولوں ،اساتذہ،ہسپتالوں،ڈاکٹروں اور نرسوں کی اشد ضرورت تھی۔مئی 1954ء میں ابراہیم نے امور کشمیر کے وزیر کی اقربا پروری،بدعنوانی اور غبن کے خلاف احتجاج کیا۔ اس کے علاوہ اس نے پاکستان پر الزام عائد کیا کو وہ کشمیر کو نوآبادی بنانا چاہتا ہے۔

> اپنی حساس فطرت اور عمومی غربت کے باعث آزاد کشمیر پاکستانی سیاست کا جزو لاینفک بن کر رہ گیا۔کبھی اس کو وادی میں مخصوص مقاصد حاصل کرنے کے لئے بیس کیمپ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی اس کی حیثیت ایک غریب رشتہ دار جیسی ہوتی ہے۔لیکن اس سب کے دوران

آزاد کشمیر معاشی طور پر پاکستان کا محتاج ہی رہا ہے۔آزاد کشمیر کے عوام بھی، اپنے وادی میں رہنے والے بہن بھائیوں کی طرح سے اپنی شناخت اور حیثیت کیلئے ہونے والے استصواب رائے کا انتظار کرتے رہے ہیں' جس کے بارے پاکستانی حکومت کا خیال تھا کہ جب بھی یہ استصواب رائے ہوگا،اس کا فیصلہ پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں ہی ہو گا۔(9)

اپریل 1958ء میں کوئی چار ماہ کی آزادی کے بعد بھارتی حکومت نے شیخ عبداللہ کو استصواب کا مطالبہ کرنے اور کشمیر کے حق خودارادیت کی بات کرنے پر دوبارہ گرفتار کرلیا۔اس گرفتاری پر پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں شدید احتجاج ہوا۔ معروف سیاسی قائدین محمد صراف،سردار ابراہیم اور غلام عباس نے فیصلہ کیا کہ تحریک آزادی کشمیر(KLM) شروع کی جائے،انہوں نے ''کشمیر چلو'' کے نعرے لگاتے ہوئے سیز فائر لائن عبور کرلی۔لیکن پاکستانی حکومت نہیں چاہتی تھی کہ بھارتی حکومت کیلئے اشتعال انگیزی کا ایسا ماحول پیدا ہو جائے جو اس وقت دونوں حکومتوں کے مابین باہمی ہم آہنگی کو خراب کرے۔اسلئے اس نے سیز فائر لائن کراس کرنے کی حمایت نہیں کی، چنانچہ غلام عباس سمیت سینکڑوں کارکنوں کو گرفتار کرلیا گیا۔محمد صراف نے اس واقعے پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے ساتھ الحاق کا علمبردار غلام عباس پاکستانی جیل اور بھارت کے ساتھ الحاق کا حامی شیخ عبداللہ بھارتی جیل میں ہے۔یہ نہ کوئی حادثہ تھا نہ محض اتفاق بلکہ یہ ان حکومتوں کی زیادہ سے زیادہ علاقے اور لوگوں پر تسلط قائم کرنے کی ہوس کا اظہار تھا۔

الحاق کے مسائل

جہاں بھارتی حکمران کشمیر پر سامراجی غلبے کے منصوبے بناتے ہیں وہیں پاکستانی حکمرانوں کے اپنے سامراجی عزائم ہیں۔کمزور سرمایہ دارانہ ممالک ہونے

کے باوجود انہیں نہ صرف اپنے محنت کش طبقات کا استحصال کرنا ہوتا ہے بلکہ اپنے زیر تسلط مظلوم قومیتوں کو بھی اپنے جبر واستحصال کا شکار بنانا ہوتا ہے۔ یہ ان کے بحران زدہ نظام کی ضرورت بھی تھی جسے یہ دونوں ریاستیں اوران پر براجمان حکمران طبقات مسلسل نشو ونما دینے کی کوشش کرتے چلے آرہے ہیں تاکہ ان کے مفادات تعیّشات، مراعات، دولت اوراقتدارکو زیادہ سے زیادہ مضبوطی اوراستحکام میسرآسکے۔لیکن ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود دونوں ملکوں میں سرمایہ دارانہ نظام سماج کی مجموعی ترقی کا فریضہ سرانجام دینے میں نااہل ثابت ہو چکا ہے۔اسی طرح ان ملکوں کواپنے مختلف علاقوں،صوبوں اورقوموں کے درمیان تضادات حل کرنے کیلئے درکار مالیاتی اور تکنیکی وسائل بھی دستیاب نہیں ہیں۔کشمیر بھی اس کیفیت سے مبرا نہیں ہے۔ پاکستان اور بھارت دونوں اپنے اپنے کشمیر کے مسائل حل کرنے اوران کواس حدتک ترقی دینے میں کامیاب نہیں ہوسکے کہ وہاں کے عوام ان کے ساتھ اپنی مرضی سے الحاق کرنے پر راضی ہو جاتے۔یہی وجہ ہے کہ دونوں طرف کے کشمیروں کے اندر اوروہاں سے باہر رہنے والے کشمیریوں میں ’’قومی آزادی‘‘ کی جدوجہد کا جوش و جذبہ زور پکڑ چکا ہے۔

آزاد کشمیر میں پاکستانی سرکار کی کارگزاریوں نے ریاست کے اندرغم وغصے کی کیفیت طاری کی ہوئی ہے۔علاقے کی نام نہاد جھوٹی آزادی، جومحض ایک آئینی ڈھکوسلہ ہے اور پاکستان کی ریاست کے معاملات میں بے جا مداخلت کے خلاف کشمیریوں میں نفرت پائی جاتی ہے۔زیادہ ترغم وغصہ شمالی علاقہ جات کی آزاد کشمیر سے مسلسل علیحدگی کے حوالے سے ہے۔

> مظفرآباد ان علاقوں کوتقسیم سے پہلے کی ریاست جموں وکشمیر کا حصہ سمجھتا ہے اوراب بھی وہ ان کوآزاد کشمیر کا اٹوٹ انگ تصور کرتا ہے۔اسی لئے ان علاقوں کو پاکستان کا حصہ بنائے جانے کو غیر قانونی تصور

کرتا ہے۔1992ء میں مظفر آباد ہائی کورٹ نے ایک فیصلہ جاری کیا جس کے مطابق گلگت سکردو اور ہنزہ کشمیر کا حصہ ہیں اور یہ کہ ان کے سیاسی مفادات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔اس فیصلے کے مطابق پاکستان کی علاقے کی ''انتظامی نگرانی'' غیر قانونی ہے۔(10)

کشمیریوں کے غم و غصے کی دوسری بڑی وجہ پاکستان کی طرف سے کشمیر کا معاشی استحصال ہے جو وہ شروع سے کرتا چلا آ رہا ہے۔

''دیہی ترقی پر ہونے والے اخراجات پاکستان کی نسبت کشمیر میں بہت کم ہیں۔''(11)

ایک منگلا ڈیم کے استثناء کے سوا جسے کشمیریوں کے غم و غصے کو کم یا ختم کرنے کا ذریعہ بنایا جا سکتا تھا لیکن اس معاملے نے صورتحال کو اور بھی بھڑکا دیا۔ان لوگوں کی بستیاں، زمینیں اور سڑکیں وغیرہ پانی کی نذر ہو گئیں لیکن منگلا سے حاصل ہونے والی توانائی کے فوائد کی باران رحمت لاہور اور پاکستان کے دوسرے حصوں میں برس رہی ہے۔اسلام آباد نے منگلا ڈیم کی تعمیر سے ہونے والے انفراسٹرکچر کے نقصان کی بحالی کیلئے آج تک کوئی سنجیدہ منصوبہ بندی نہیں کی جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علاقے کی ترقی کیلئے کتنا مخلص ہے!

پاکستانی فوج اور دیگر ریاستی ایجنسیاں جمہوریت کے دھوکے میں اس علاقے کو اپنی آہنی گرفت میں رکھنا چاہتی ہیں۔روایتی کشمیری لیڈر پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلامی بنیاد پرستی کو نہ صرف بھارت کے خلاف اپنے مخصوص مفادات کے تحت حربی کارروائیوں کیلئے ابھارا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر انہیں ان بائیں بازو کے ترقی پسند عناصر اور گروپوں کو کچلنے کیلئے استعمال کیا گیا جنہوں نے ان کی پالیسیوں کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ہر ابھرتے ہوئے لیڈر کی بولی لگائی جاتی ہے اور اسے اپنا زر خرید بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔بیرون ممالک رہنے والے کشمیریوں کی

طرف سے بھیجا جانے والا سرمایہ بھی ان حالات میں بہتری پیدا نہیں کرسکا۔

کشمیر میں سڑکیں، ٹرانسپورٹ ،مواصلات،سکول اور ہسپتال وغیرہ سبھی کی حالت دگرگوں ہے۔کشمیر کی معیشت کا زیادہ تر دارومدار بیرون ملک سے آنے والے سرمائے پر ہے۔جبکہ کشمیر کی مقامی اشرافیہ اپنے مالی مفادات ٹمبر مافیا(لکڑی کی غیر قانونی تجارت)اور پاکستان سے ملنے والی مختصر امداد کی بندر بانٹ کے ذریعے حاصل کرتی ہے۔آزاد جموں وکشمیر کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ بلیک مارکیٹ اور منشیات کی آمدنی پر مبنی ہے۔نام نہاد''آزادی'' ٹیکسوں کے اس بوجھ میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کرسکی جو کشمیری صدیوں سے اٹھاتے چلے آرہے تھے۔ پاکستانی حکمرانوں کی کشمیریوں کے حالات سدھارنے کے لئے بنائی جانے والی تمام پالیسیاں منافقانہ اور مصنوعی ہیں۔اور ابھی تک بھی کشمیریوں کے ساتھ ان کا سلوک اس سے مختلف نہیں ہے جو وہ بنگالیوں کے ساتھ روا رکھتے تھے، جب بنگلہ دیش''مشرقی پاکستان'' ہوا کرتا تھا۔المیہ یہ ہے کہ کئی کشمیری لیڈر مفادات کی سیاسی منڈی میں خود کو بیچ چکے ہیں اور یہ بلا چون و چرا وہی کرتے ہیں جو اسلام آباد والے چاہتے ہیں۔اس سب کا خمیازہ ان کشمیریوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے جن کی اکثریت استحصال زدہ ہے۔

معاشی جبر نے ان کی بڑی تعداد کو وطن بدر کردیا ہے۔ایک اچھے روزگار اور ایک اچھی زندگی کی طلب جب ان کو راولپنڈی، پشاور، لاہور، کراچی یا کسی دوسرے شہر لے جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ زندگی آسان ہونے کی بجائے مزید اجیرن ہوگئی ہے۔ جو لوگ برطانیہ یا یورپ پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی زندگیاں بھی مصائب کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہو پاتیں۔ یہ مصائب مختلف ضرور ہیں ہیں لیکن استحصال اور جبر وہی ہے جو مظلوم طبقات کے ساتھ ہر جگہ کیا جاتا ہے۔ بریڈفورڈ، برمنگھم، مانچسٹر اور لندن سمیت کئی برطانوی شہروں میں ہزاروں لاکھوں کشمیری ایسے ہیں جن کا معیار زندگی میرپور مظفرآباد اور اسلام آباد میں بسنے والے حکمران طبقے اور

اپر مڈل کلاس کشمیریوں سے کہیں کمتر ہے۔ یہ تلخ حقائق کشمیریوں کی قومی آزادی اور خودمختاری کو ایک نیا مفہوم دیتے ہیں۔

پردیس خصوصاً برطانیہ میں رہنے والے کشمیریوں کی طرف سے بھیجا جانے والا غیرملکی زرمبادلہ پاکستان کی معیشت کیلئے انتہائی اہمیت رکھتا ہے لیکن یہ بات رقم بھیجنے والے سبھی کشمیری بھی جانتے ہیں کہ اس خطیر رقم کا عشرعشیر بھی آزاد کشمیر کی ترقی و خوشحالی پر خرچ نہیں کیا جاتا۔ ان لوگوں میں یہ سوال اٹھ رہا ہے کہ اس رقم کو کیوں بھیجا جائے جب ہماری دھرتی کو اس کا فائدہ ہی نہیں ہو پا رہا؟

آزاد کشمیر کے لیڈر اپنی دفاعی اور معاشی مجبوریوں کے باعث اسلام آباد پر اپنا غم وغصہ ظاہر نہیں کر پاتے۔ لیکن مصلحت پسندی ہمیشہ کامیاب نہیں ہوا کرتی۔ کئی بار کشمیری لیڈروں نے لائن آف کنٹرول کو پار کرنے کی کوشش کر کے اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے اور پاکستانی حکمرانوں کو پیغام دینے کی سعی کی ہے کہ آزاد کشمیر پاکستان کا حصہ نہیں ہے بلکہ اس کی اپنی ایک الگ شناخت اپنا ایک وجود ہے۔ ایسا کرنے سے ان کا مطلب اسلام آباد پر یہ دباؤ ڈالنا بھی ہوتا ہے کہ وہ کشمیر کی بڑھتی ہوئی سرکشی کے خلاف ٹھوس اور موثر اقدامات کرے۔ جبکہ کئی لیڈر اس قسم کے طور طریقوں کو اپنے مفادات حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔

> کئی تو اس قسم کی بیان بازیوں تک بھی پہنچ گئے کہ ان کی جدوجہد کشمیر کے ازسرنو اتحاد کیلئے ہے اور یہ کہ اس جدوجہد کا مقصد کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانا نہیں بلکہ خودمختاری دلانا ہے۔ مثال کے طور پر محمد ابراہیم جس نے 1950ء کی دہائی میں کشمیر لبریشن موومنٹ تشکیل دی تھی جس کا مقصد ایک متحدہ وخودمختار کشمیر کا قیام تھا۔ اسی طرح اکتوبر 1969ء میں کشمیر کے صدر بننے والے عبدالرحمان نے کھلے عام بیان دیا تھا کہ کشمیر پاکستان کا حصہ نہیں ہے بلکہ ہمارا تعلق آزادانہ دوستی پر مبنی

ہے۔(12)

رائے شماری کے تجزیوں کے مطابق آزاد کشمیر میں پاکستان سے الحاق اور خود مختاری، دونوں حوالوں سے حمایت موجود ہے۔ جہاں تک الحاق کا سوال ہے تو اس میں یہ مدنظر رکھا جانا چاہئے کہ پاکستان کے ساتھ رہنے کی خواہش کے پیچھے پاکستانی حکومت کے اقدامات کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ پاکستان کی وفادار کشمیری قیادت کی پاکستانی اقدامات پر تنقید کے پیچھے بھی یہی مطالبہ ہے کہ ہمیں زیادہ خودمختاری دی جائے۔خود مختاری کا مطالبہ کرنے والے ان ''میر پوریوں'' کے بارے میں راجر بیلارڈ لکھتا ہے:

> جو موقف یہ اختیار کر رہے ہیں وہ خطہ کشمیر کی اجتماعی ثقافتی پہچان کے ساتھ ان کی مثبت اور شفاف وابستگی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ اس سلوک کا نتیجہ ہے جو پاکستان نے ان کے ساتھ اختیار کئے رکھا ہے۔(13)

بھارت اور پاکستان دونوں نے کشمیر کی باہمی تقسیم کے وقت سے اپنے اپنے کشمیر کے ساتھ ایک ہی جیسا رویہ رکھا ہوا ہے۔ دونوں کے مابین جو بڑا فرق ہے وہ یہ ہے کہ نئ دہلی نے اپنے کشمیر کے ساتھ اپنی جڑت کو قانونی شکل دے دی ہے جبکہ اسلام آباد آئینی حیلہ سازی اور چال بازی کے ذریعے معاملات کو سنبھالنے اور چلانے کا وطیرہ اختیار کئے ہوئے ہے۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اگر پاکستان بھارتی کشمیر پر قبضے کا خواہشمند نہ ہوتا تو بہت پہلے ہی آزاد کشمیر کو اپنا پانچواں صوبہ بنا لیتا۔ پاکستانی اور بھارتی مقبوضہ کشمیروں میں دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ پاکستانی کشمیر میں ابھی تک اسلام آباد کے خلاف مسلح بغاوت کے کوئی آثار محسوس نہیں ہو رہے ہیں۔لیکن ان کی اس ''خاموشی'' سے یہ اندازہ لگا لینا ایک فاش غلطی ہو گی کہ وہ پاکستان کے ساتھ ہی رہنا چاہتے ہیں اور یہ کہ ان کے اندر آزادی کی خواہش ختم ہو چکی ہے۔ 1991ء میں وزیراعظم آزاد کشمیر ممتاز راٹھور کی گرفتاری پر بے نظیر بھٹو نے

کہا تھا کہ:

> پاکستان نے آزاد کشمیر کے وزیر اعظم کو گرفتار کر لیا ہے، ساتھ ہی الیکشن میں بھی دھاندلی کی گئی ہے، اور ان کو اس طرف دھکیلا جا رہا ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ رہنے کی بجائے پاکستان سے الگ ہونے کا سوچ رہے ہیں۔(14)

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ نصف صدی سے زیادہ پر مبنی ایک سیاسی یونٹ اور واحد حکومت کے تحت مشترکہ سیاسی و معاشی اور ثقافتی اکائی نے دونوں کشمیروں کے سماجوں کی ساخت اور شناخت پر گہرے اثرات مرتب کیئے ہیں، ان کی کرنسی، اقتصادیات اور مالیات اس عرصے میں اپنے اپنے آقا ملکوں بھارت و پاکستان کے ساتھ ایک بندھن میں بندھی رہی ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ پاکستان اور بھارت کی فلمیں، موسیقی آرٹ اور دیگر ثقافتی رجحانات، ان دونوں کی آپس کی تمام پابندیوں منافرتوں اور دشمنیوں کے باوجود ایک دوسرے سے متصل و پیوست رہی ہیں۔

اگر ہم پچھلے 58 سالوں کی سیاسی تاریخ کو سامنے رکھیں تو ہمیں پاکستان و بھارت کے تعلقات میں پیدا ہونے والی سیاسی و سماجی تبدیلیوں کے مابین ایک جدلیاتی تعلق کارفرما نظر آتا ہے۔ مارکسی نظریے کے مطابق اقتصادی رشتوں میں حاوی زبان سماجی رشتوں پر بھی حاوی ہوتی ہے، یہی بات سیاست پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ معاشی اور اقتصادی باہمی تعلق کی وجہ سے بھارت و پاکستان کے زیر تسلط کشمیروں میں بڑی بڑی پارٹیاں وہی اور ویسی ہی ہیں جیسی ان ملکوں میں ہیں۔ لیکن جیسے ہم اس سے قبل وضاحت بھی کر چکے ہیں کہ بھارتی و پاکستانی سرمایہ داری اپنی فطرت اور کردار کے لاغر پن کے باعث اپنی تکمیل نہیں کر سکی، چنانچہ یہ کشمیر کو سیاسی سماجی اور معاشی طور پر منظّم و مربوط نہیں کر سکی۔ اسی وجہ سے ہمیں یہاں آزادی پسند اور مرکز گریز پارٹیوں کا ظہور اور زور نظر آتا ہے۔ کشمیر میں انتہا پسند مذہبی پارٹیوں

کے عروج کا معاملہ بھی سرمایہ داری کے مذہب کو ریاست سے الگ نہ کر سکنے کی ناکامی کا ہی شاخسانہ ہے۔اس قسم کے فرائض کی تکمیل کیلئے سماجی ومعاشی ترقی کے ایک مخصوص مرحلے کو طے کرنا پڑتا ہے۔ بھارت میں ہندو بنیاد پرستی کا ابھار بھارتی سرمایہ داری کی اپنے بنیادی فرائض کی ادائیگی میں ناکامی کا ہی آئینہ دار ہے۔جبکہ آزاد کشمیر میں اسلامی بنیاد پرستی کا ابھار صرف معروضی حالات اور سیاسی خلاء کا ہی نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ پاکستانی حکمرانوں کی مفاد پرستانہ وموقع پرستانہ سیاست کی پیدا کردہ ہے۔

طبقاتی سیاست

صورتحال خاصی پیچیدہ ہے۔ مذہب کو مسلم بورژوازی کے کچھ دھڑوں کے مفادات کے حصول کے لئے جذباتی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔اس سے ایک ایسی محفوظ منڈی کا قیام مقصود تھا جو ان کی ''اپنی'' ہوتی۔اس کے علاوہ یہ سیاسی مفاد بھی مقصود تھا کہ کسی بھی ایسی تحریک کو ابھرنے سے پہلے ہی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کا شکار کر دیا جائے جو سرمایہ داری کا تختہ الٹنے کا انقلابی فریضہ سرانجام دے سکے۔

عجب حقیقت ہے کہ مذہبی پاکستان 69-1968 کے دوران ایک انتہائی ریڈیکل انقلاب کے تجربے سے گزر چکا ہے جبکہ اس کے برعکس نام نہاد جمہوری اور سیکولر بھارت ابھی تک اس سے محروم رہا ہے۔یہی سبب ہے کہ پاکستان اوراس کے زیرنگیں کشمیر کی سیاست اس سے کہیں زیادہ مختلف اور متضاد ہے جیسی میڈیا اور لبرل دانشور ہمیں دکھاتے ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا ابھار پاکستان اور کشمیر دونوں میں ایک جیسا ہی تھا۔ یہ صرف حق خوداختیاری اور حق آزادی ہی کا نعرہ نہیں تھا جو ذوالفقار علی بھٹو نے دیا تھا اور جس سے آزاد کشمیر میں پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیادیں مضبوط ہوئی تھیں۔تقریباً تمام جماعتیں ہی وقتاً فوقتاً اس قسم کے نعروں کا سہارا لیتی ہیں۔ درحقیقت یہ نعرہ اتنا

زیادہ استعمال ہو چکا ہے کہ کشمیر کے عوام اس نعرے سے تنگ آ چکے ہیں۔

لیکن پاکستان کی طرح کشمیر میں بھی پاکستان پیپلز پارٹی کی جڑیں اس انقلابی تحریک میں موجود تھیں جس نے موجودہ نظام کو للکارا تھا اور یہ امید دی تھی کہ اب سماج کی معاشی و سماجی تبدیلی ممکن ہو جائے گی۔ یہ نظام کی تبدیلی کا نعرہ تھا جس نے پیپلز پارٹی کو کشمیر میں عوامی بنیادیں فراہم کیں۔لیکن مختلف سیاسی اور تنظیمی مسائل کی وجہ سے، جس میں قیادت کے مسائل بھی شامل ہیں، پاکستان پیپلز پارٹی بحیثیت ایک سماجی تبدیلی کی طاقت کے، وقتی طور پر، اپنی اثر انگیزی گنوا چکی ہے۔

اپنے سماجی و معاشی باہمی تعامل کی بدولت آزاد کشمیر اور پاکستان میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ان دونوں کے عروج و زوال مشترک ہیں۔ پاکستانی سرمایہ داری کی کمزوری قومی مسئلے کو تقویت دیتی ہے اور کشمیر کے اندر پاکستانی حکمرانوں اور کشمیر پر براجمان ان کے گماشتوں کی پالیسیوں کے خلاف غیض و غضب اور نفرت کو ابھارتی چلی آ رہی ہے۔ یہ بات صرف کشمیر کے ضمن میں ہی نہیں بلکہ سندھ، پشتونخواہ بلوچستان اور دیگر پاکستانی قومیتوں کے حوالے سے بھی درست ہے، جہاں استحصال اور محرومی اپنا سیاسی اظہار اپنی اپنی قومی منافرت کی شکل میں کرتے چلے آ رہے۔

ایک اور اہم پہلو جسے ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا ہے وہ کشمیر سمیت سارے پاکستان کے عوام کی ایک جیسی بدحالی اور محرومی ہے۔سرحدوں کے آر پار عوام کے باہمی میل ملاپ نے ان میں طبقاتی جڑت پیدا کی ہوئی ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی ایک عجیب و غریب مظہر ہے جو کسی متبادل کے نہ ہونے کے باعث عوام کے تحت الشعور میں ان کی طبقاتی خواہشات کے میلان و رجحان کا پلیٹ فارم بنی ہوئی ہے۔ کشمیر میں پیپلز پارٹی کے لیڈروں کا وہی حال ہے جو پاکستان میں پیپلز پارٹی کے لیڈروں کا ہے۔حکمران طبقات کا حصہ بن کر وہ ریاست کے آلہ کار بن چکے ہیں۔ ریاست کو اپنے مطابق چلانے کی بجائے انہوں نے سرمایہ داری نظام

کی بجا آوری اختیار کر لی۔ یوں ان کی طرف سے کئے گئے اقدامات ان تمام محروم و مظلوم عوام کے مفادات کے خلاف ثابت ہوئے جنہوں نے ان کو ووٹ دے کر اقتدار تک پہنچایا تھا۔ اس سے عوام کی مایوسی اور بے دلی میں شدید اضافہ ہوا اور استحصال کرنے والوں کو مزید کھل کر کھیلنے کا موقع ملا۔ اس جبر و استحصال کے خلاف ہونے والی مزاحمت کو قیادت کی طبقاتی مصالحت اور سمجھوتوں پر مبنی پالیسیوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ کشمیر میں مسلم کانفرنس، بنیاد پرستوں اور رجعت پسندوں کا مقابلہ، خاص طور پر انتخابی میدان میں اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ اب بھی پیپلز پارٹی ہی ہے۔

آزاد اور جموں و کشمیر دونوں کے اندر قوم پرست پارٹیوں کا عوام میں پھیلاؤ سیاسی سے زیادہ نظریاتی ہے۔ 70-1960ء کی دہائیوں میں ان کی عوامی بنیادیں، خصوصاً نوجوانوں اور طلباء میں آج سے زیادہ وسیع اور گہری تھیں۔ قوم پرستوں کا حالیہ عرصے میں کم اثر ہونا کوئی حادثہ نہیں ہے۔ ماضی میں وہ سوویت یونین اور ماؤاسٹ چین کے ''قومی سوشلسٹوں'' یعنی سٹالنزم کو متاثر کرنے کے لئے استعمال کر سکتے تھے اور اس قسم کے قومی سوشلزم کو اپنے ایجنڈے کا حصہ بناتے تھے۔ ان بنیادوں پر وہ نوجوانوں کو کم از کم سوشلسٹ انقلاب کے نعرے دے سکتے تھے۔ سوویت یونین کے انہدام کے فوری بعد یہ سب ختم ہو گیا۔ اور المیہ یہ ہے کہ آج کی سیکولر لبرل اور جمہوری قوم پرستی چاہے اعلانیہ ہو یا خفیہ امریکی سامراج کی پالیسیوں کی نمائندہ اور علمبردار بن چکی ہے۔ اور آج یہ کرنا زیادہ آسان ہے کیونکہ اس سے قوم پرستی سرمایہ دارانہ حدود میں قید ہو جاتی ہے۔ ان کی پیش کردہ ''جمہوریت'' اور ''آزادی'' کا مقصد درحقیقت امریکی سامراج کے مفادات کی نگہبانی کرنا ہے۔ سرمایہ داری کے رنگ روپ اور سانچوں ڈھانچوں میں رہتے ہوئے آپ کو لامحالہ انقلابی پروگرام اور سوشلسٹ اہداف سے اعلان لاتعلقی کرنا پڑے گا۔ بدقسمتی سے آج کی قوم پرستی کا

موجودہ رجحان نہ صرف اس کے قوم پرستانہ نظریاتی دیوالیہ پن کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اس کے امریکی و یورپی سامراج کے آگے سرنگوں ہو جانے کے خطرے کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

اس قسم کی قوم پرستی سے کشمیر کی اس محروم و مایوس نئی نسل کو کوئی دلچسپی نہیں ہے جو کہ سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال اور امتیاز کی سفا کی کے ہاتھوں اپنے خوابوں اپنی نیندوں اپنے آدرشوں اور اپنے مستقبل سے ہی محروم کر دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں جموں کشمیر نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (JKNSF) میں مارکسی رجحان مسلسل فروغ پاتا نظر آتا ہے جو کشمیری نوجوانوں کے اندر ابھی تک موثر روایتی تنظیم کے طور پر اپنی جڑیں رکھتی ہے۔ یہ ان کے اندر قومی آزادی کی لگن اور قومی و طبقاتی استحصال و محرومی کو جنم دینے والے سامراجی نظام کو جڑوں سے ہی اکھاڑ پھینکنے کی انقلابی جستجو کی غمازی کرتی ہے۔ یہ مارکسی رجحان، آزادی کی اس جدوجہد کو ایک واضح تناظر اور لائحہ عمل سے روشناس کراتے ہوئے اس کے ساتھ اپنی جرٔت کا اظہار کر رہا ہے۔ کتاب کے اگلے باب میں ہم قومی آزادی اور طبقاتی جدوجہد کے مابین باہمی تعامل پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے جو مسئلہ کشمیر کے کسی ممکنہ حل کے ضمن میں فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہے۔

بدعنوان اقتدار

اگر یہ بات درست ہے کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے اندر بھارتی فوج نے اپنا سب سے بڑا عسکری اجتماع کیا ہوا ہے تو پھر یہ بات بھی درست ہی ہے کہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر بھی پاکستانی فوج کی گیریژن اور چھاؤنی بنا ہوا ہے۔ یہاں بھی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جو پاک فوج کی عملداری اور مداخلت سے پاک ہو۔ یہاں کے وزراء اور سیاستدان اکثر انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) کے مظفر آباد دفتر کے باہر

قطار میں کھڑے نظر آتے ہیں۔گزشتہ تین دہائیوں سے پاکستانی خارجہ پالیسی کے دو اہم ایشوز افغانستان اور کشمیر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ذریعے ہی چلائے جا رہے ہیں۔آئی ایس آئی کو امریکی سی آئی اے نے سرد جنگ کے دوران تشکیل دیا تھا۔رفتہ رفتہ یہ ریاست کے اندر ریاست کا درجہ اختیار کر گئی اور خارجہ پالیسی مکمل طور پر اس کی مرہون منت بنا دی گئی، خواہ اسلام آباد میں حکومت سویلین تھی یا فوجی۔

''یہ فوج ہی ہے جو پاکستان پر مکمل اقتدار و اختیار کی مالک و مختار سمجھی جاتی ہے۔''(15)

یہ تبصرہ پاکستان کی کشمیر پالیسی پر فوج کے ''اثرات'' کو واضح کرنے کیلئے کافی ہے۔

کشمیر کے دریاؤں کا پاکستان کے ساتھ تعلق بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ سندھ، جہلم اور چناب سبھی دریا جو پاکستان کو سیراب کرتے ہیں، پاکستان میں پہنچنے سے پہلے کشمیر سے ہی ہو کر نکلتے ہیں۔ پنجاب اور سندھ کی زراعت کا دارومدار اسی پانی پر ہے۔اگر جموں و کشمیر مکمل طور پر بھارت کا حصہ بنتا ہے تو اس سے پاکستان کو ہمیشہ پانی کے بند کر دیے جانے کا اندیشہ لاحق رہے گا، اس خدشے کا اظہار بہت عرصہ پہلے سابق وزیر خارجہ پاکستان ظفر اللہ خان نے بھی کیا تھا:

اگر کشمیر بھارت کے تسلط میں چلا گیا تو پاکستان معاشی اور دفاعی نکتہ نظر سے بھارت کا مزارع بن کے رہ جائے گا اور اس کی آزاد ریاست کے طور پر شناخت اور حیثیت ختم ہو جائے گی۔(16)

گزشتہ نصف صدی سے کشمیر پاکستانی ریاستی پالیسیوں کا محور رہا ہے۔ یہ تنازعہ نہ صرف بے حد و حساب فوجی اخراجات کا جواز بنا ہوا ہے بلکہ یہ پاکستانی ریاست کی نظریاتی بنیادوں کا محافظ بھی بنا ہوا ہے۔ دو قومی نظریے کی بقا اور نشو و نما کیلئے لازمی ہے کہ بھارت کے خلاف قومی منافرت، تعصب اور دشمنی کو لگاتار بھڑکایا جاتا

رہے۔اور کشمیر وہ تنازعہ ہے جو اس کار خیر کیلئے درکار ایندھن فراہم کرتا چلا آرہا ہے۔ یہ بھی سچ ہی ہے کہ بھارتی بورژوازی بھی تمام تر نام نہاد سیکولرازم اور جمہوریت بازی کے باوجود، اسی منافرت وتعصب اور دشمنی کو اپنے مقبوضہ کشمیر پر تسلط کیلئے استعمال کرتی چلی آرہی ہے۔ یہ صرف آئی ایس آئی ہی کے تربیت یافتہ افسران نہیں ہیں جو کہ پاکستانی سفارتکاری پر حاوی ہیں، بلکہ بھارتی ایجنسی را(Research and Analysis Wing)بھی اپنے اہم سفارتی عہدوں پر اپنے تربیت یافتہ افسران کی خدمات سے مستفید ہورہی ہے۔ کشمیر نہ صرف دو دشمن ملکوں کیلئے میدان جنگ ہے بلکہ یہ ان کے مابین بالواسطہ جنگوں اور دیگر کاروائیوں کا بھی مرکز و محور بنا ہوا ہے۔اس دوطرفہ دشمنی اور غارتگری کا سب سے زیادہ نقصان کشمیریوں کو ہی بھگتنا پڑرہا ہے، چاہے وہ اسے پسند کریں یا نہ کریں۔لیکن وہ جو دونوں طرف کے مالکوں سے بنا کے رکھنے کے چکر میں رہتے ہیں ان کی قسمت بھی کچھ اتنی بہتر ثابت نہیں ہوا کرتی۔

''ہیروئن'' کی برکات

اپنی کاروائیوں کے اخراجات پورے کرنے کیلئے،خصوصاً افغانستان کے اندر، ہیروئن کی پیداوار اور سمگلنگ سے بھرپور استفادہ کیا گیا۔حالیہ تاریخ میں امریکی سی آئی اے کا بھی اپنے اہداف حاصل کرنے کے اخراجات پورے کرنے کا یہی وطیرہ رہا ہے۔نکاراگوا اور جنوبی ویتنام میں اس کا یہ طریقہ واردات کسی سے بھی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔اور کسی مزید وضاحت کا طالب بھی نہیں ہے۔

امریکہ آجکل بھی افغانستان کے اندر اسی جرم کا ارتکاب کررہا ہے۔ایک تباہ شدہ ملک کو کنٹرول کرنے میں ناکامی کے بعد امریکہ نے انیسویں صدی کا پرانا طریق کار اختیار کرلیا کہ قبائلی سرداروں ''وارلارڈز'' کو رشوت دے کر ان کی وفاداریاں

خرید لی جائیں۔لیکن گزشتہ دہائیوں کے تجربے کے بعد ایک امریکی ناقد نے صورتحال پر یوں تبصرہ کیا ہے'' آپ ان کی وفاداریاں تونہیں خرید سکتے ہاں البتہ آپ ان کو کرائے پر لے سکتے ہیں''

اگر ہم افغانستان کی موجودہ صورتحال پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ طالبان کے تحت افغانستان میں 4163 ایکڑ رقبے پر پوست کی کاشت ہوتی تھی۔جبکہ ان دنوں جنرل جان ابی زید کی زیرنگرانی 510,766 ایکڑ رقبے پر پوست کی کاشت کا کام جاری وساری ہے (یہ دونوں اعداد وشمار امریکی وائٹ ہاؤس کے دفتر کی نیشنل ڈرگ کنٹرول پالیسی کے جاری کردہ ہیں)۔طالبان 40 میٹرک ٹن ہیروئن پیدا کیا کرتے تھے جبکہ امریکی کنٹرول کے بعد سے افغانستان میں افیون کی پیداوار 5000 میٹرک ٹن یا ہیروئن 600 میٹرک ٹن ہو چکی ہے۔2001ء میں افغانستان میں ہیروئن کے سٹاک کی منڈی میں قیمت، فرینکفرٹ اور روٹرڈیم میں 600 ملین ڈالر کی تھی۔جبکہ پچھلے سال اس کی آمدنی انہی شہروں کی منڈیوں کے حساب سے 50 بلین ڈالر تک پہنچ گئی جو کہ پاکستان کی مجموعی قومی آمدنی کے دو تہائی کے برابر ہے۔

> افغانستان پر امریکی تسلط کے بعد ہی جنرل ابی زید کے پیشرو جنرل ٹامی فرینکس نے ہر اس افغانی سردار کو خرید لیا جو اپنی قیمت لگوانے کیلئے بے تاب تھا۔بڑے بڑے سرداروں کو لاکھوں ڈالر ماہانہ کرائے پر اپنا بنا لیا گیا۔اس آمدنی سے ان سرداروں نے جدید اسلحہ حاصل کر لیا اور اپنے زیر تسلط علاقوں پر اپنے کنٹرول کو مزید مستحکم کر لیا۔ان ڈالروں کی خیر و برکت کو انہوں نے طالبان کے خلاف بھی استعمال کیا اور اسی سے انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اپنی پوست کی کاشت میں بھی بے پناہ اضافہ کر لیا۔(17)

اگر امریکی سی آئی اے نے جہاں ڈرگ مافیا کو افغانستان میں 1980ء کی

دہائی میں بائیں بازو کی حکومت کے خلاف استعمال کیا اسی طریقے سے پاکستانی آئی ایس آئی نے کشمیر میں ٹمبر مافیا کو اپنی کاروائیوں کیلئے استعمال کیا۔لیکن منشیات کی تجارت بھی کشمیر کی صورتحال میں بھرپور کردار ادا کر رہی ہے۔

ارضی تباہ کاریاں

کشمیر اپنی سیر وسیاحت کیلئے بہت مشہور ہے۔اس کی خوبصورتی سب کو اپنی طرف کھینچ لاتی ہے۔لیکن ٹمبر مافیا نے اس کی جمالیات کو منڈی اور منافعوں کی سولی پر چڑھا دیا ہے بلکہ درختوں اور جنگلوں کا یہ بلادکار ارضیاتی تباہیوں کے امکانات میں بھی دن بدن اضافہ کر رہا ہے۔

1947ء میں کشمیر کا 42 فیصد صنوبر، میپل، دیودار، چیڑ، اناس، سفیدے اور اخروٹوں کے درختوں پر مشتمل تھا، اور پہاڑوں کی بلندیوں پر برفانی چیتوں کی بہت بڑی تعداد ہوتی تھی۔جبکہ نایاب سرخ ہرنوں کے جھنڈ وہاں کثرت میں پائے جاتے تھے۔صنوبر اور اناس کے جھرمٹ میں سیاہ ہمالیائی ریچھ، مارخور، لگڑ بگے، جنگلی بلے اور کئی دوسرے جانور رہوتے تھے، جبکہ ان جنگلات میں رنگ برنگے نرالے وکمیاب تیتر، دراج وغیرہ بسیرا رکھتے تھے اوران بلند وبالا درختوں سے بھی اوپر سنہری عقاب اور گدھ اڑا کرتے تھے۔مارموت کی سیٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی سنسناہٹ سے یہ جنگل دن رات زندگی سے لبریز رہا کرتے تھے۔

ٹمبر مافیا نے ان جنگلوں کو اجاڑ دیا ہے۔کشمیر کے جنگلات اب 11 فیصد سے بھی کم رہ چکے ہیں۔ برفانی چیتے اپنے لئے درکار ماحول کے قتل عام کی وجہ سے اب ناپید ہوتے جارہے ہیں۔یہی کیفیت کشمیر کے سرخ ہرنوں کی بھی ہوچکی ہے۔منافعوں پر مبنی غارتگری کے ہاتھوں اس ماحولیاتی تباہی کے باعث سائبیریا سے ہجرت کر کے آنے والے پرندوں نے بھی اب کشمیر کا رخ کرنا چھوڑ دیا ہے۔اور یہ سب ایک ایسی

صورتحال میں ہورہا ہے کہ کشمیر میں سرسبز درختوں کے کاٹے جانے پر مکمل پابندی عائد ہے۔

آزاد پتن اورراولاکوٹ کے درمیان بننے والی سڑک اپنی تکمیل سے قبل ہی لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔جنگلات کشی کا سیدھا سادہ مطلب ہے،مٹی کی نمی اور زرخیزی میں کمی ،سیلاب ،ہواؤں کے اثر سے ارضی فرسودگی میں اضافہ۔اس کے ساتھ ہی اس کا مطلب ماحولیات کی آلودگی ،آب وہوا میں تبدیلی ، فطرت کی تباہی ،چٹانوں کا کٹاؤ،طوفانی سیلاب اور جنگلی حیات کا خاتمہ ہے۔پاکستان کا ضلع ہزارہ مرسیڈیز کاروں کی سب سے زیادہ تعداد کے حوالے سے مشہور ہے جو اتفاقاً ٹمبر مافیا کا ’’دارالحکومت‘‘ ہے۔

سیاستدانوں کی ہوس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔لائن آف کنٹرول کی دوسری طرف بھی صورتحال کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ڈال ندی 80 سالوں کے اندراندرختم ہو جائے گی ۔یہ ندی جو اپنے صحت افزا ماحول اور پانی کیلئے شہرت رکھتی تھی،اب غلاظت کا مرکز بن چکی ہے اورایک جوہڑ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

> 1989ء کے بعد سے بھارتی مقبوضہ کشمیر میں نایاب سرخ ہرن جن کی تعداد 800 سے زیادہ تھی اب یہ گھٹ کر 120 سے بھی کم رہ گئی ہے۔سابق وزیراعلیٰ فاروق عبداللہ کے حکم پر سری نگر کے اردگرد سے ہزاروں درخت گالف کے میدان کیلئے کاٹ دیئے گئے اور 52 کروڑ بھارتی روپوں کی لاگت سے وہاں وزیراعلیٰ اوراس کے درباریوں کے لئے گالف کا میدان تیار کیا گیا۔ یہ سب ان حالات میں کیا گیا جب ریاست شدید مالی بحران میں مبتلا تھی۔(18)

کشمیر نہ صرف زلزلوں کے امکانات سے مالا مال ہے بلکہ انتہائی موسلا دھار مون سون بارشوں کی وجہ سے بھاری لینڈ سلائیڈنگ اس ’’عالمی چھت‘‘ کواپنی زد میں

لے لیتی ہے جسے ہمالیہ کہا جاتا ہے۔تین ہزار کلومیٹر طویل ہمالیہ کا یہ پہاڑی سلسلہ افغانستان سے لے کر میانمار تک سات ملکوں سے ہو کر گزرتا ہے۔تجارتی مقاصد کیلئے اس سرسبز وشاداب خطے کو جس بے دردی سے سبزہ وتازگی سے محروم کیا گیا ہے جس طرح مقامی سطح پر درختوں کی کٹائی کی گئی ہے،اس کی وجہ سے زمین کا دامن تنگ ہو چکا ہے۔یہی نہیں بلکہ پانی کو روکنے کی اس کی طاقت بھی کم ہوگئی ہے، جو کہ اب زیادہ روانی اور تیزی سے نیچے کی طرف بہہ کر لینڈ سلائیڈنگ میں شدید اضافے کا باعث بن رہا ہے جسے اب یہاں ''ماحولیاتی بارودی سرنگیں'' قرار دیا جاتا ہے۔اچانک اور انتہائی تیز پانی کا بہاؤ عالمی ماحولیاتی خطرے (گلوبل وارمنگ) کی شدت میں اضافہ کر رہا ہے۔ہمالیائی گلیشیر پگھلتے چلے جا رہے ہیں جس سے صورتحال مزید گھمبیر ہوتی جا رہی ہے۔سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 03-2001ء کے عرصے کے دوران 8000 کلومیٹر طویل جنگلات کاٹے گئے جن میں سے چھ ہزار بھارتی مقبوضہ کشمیر میں تھے جو پہلے سے ہی بدترین استحصال کی زد میں ہے۔

ہن،منگول،مغل،سکھ اور ڈوگرے سبھی نے اس حسین وجمیل دھرتی پر انسانی خون سے اپنی وحشت وبربریت کی داستانیں رقم کی ہوئی ہیں۔لیکن آج کے جدید دور کے حکمران اور ان کے گماشتے تو صرف انسانی خون کو ہی اپنی وحشت وبربریت کی بھینٹ نہیں چڑھا رہے ہیں بلکہ وہ اپنی غارتگر ہوس کے ہاتھوں اپنے منافعوں اور دولت میں اضافے کیلئے ہمالیہ کے اس حسین وجمیل خطے کی خوبصورتی وشادابی کا بھی بلادکار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔سرمایہ دارانہ نظام کشمیر کے ساتھ جو حشر برپا کئے ہوئے ہے اس کی وجہ سے یہ جنت نظیر خطہ جہنم میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔اور جب تک یہ بھوکا وحشی اور سفاک نظام قائم ودائم ہے اس جہنم کی تپش دن بہ دن بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

بغاوت کے لوازمات

اگرچہ کشمیر کی پچھلی 57 سالہ تاریخ میں کوئی ایسی بڑی عوامی تحریک سامنے نہیں آئی جو سارے خطے کو اپنی گرفت میں لے سکتی، تاہم سارا خطہ اس سارے عرصے میں استحصال لوٹ مار عدم استحکام اور محرومیوں کا شکار رہا ہے۔ آزاد جموں وکشمیر کے مختلف حصوں میں اس دوران وقفے وقفے سے مسلح جدوجہد ہوتی رہی ہے۔ آزاد کشمیر کے انفرا سٹرکچر کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے کئی شہروں کے درمیان مختصر ترین رستے پاکستان سے ہو کر جاتے ہیں۔ اور یہ بات ہر کوئی کہتا ہے کہ حکومت پاکستان دانستہ اس صورتحال کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ 1960ء کی دہائی میں اس وقت کے صدر آزاد کشمیر نے اعلان کیا تھا کہ حکومت دریائے جہلم کے کنارے ''کشمیر ہائی وے'' تعمیر کرے گی۔ ابھی تک یہ منصوبہ شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا۔

جہاں تک سماجی منصوبہ جات کا تعلق ہے، ہم یہاں بھی یہی کیفیت ملاحظہ کرتے ہیں۔ کشمیر کے طالبعلموں کو جن میں اکثریت درمیانے طبقے سے تعلق رکھتی ہے، پاکستان کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کی سہولت فراہم کی جاتی رہی ہے لیکن یہاں کوئی یونیورسٹی قائم نہیں کی گئی۔ 1980ء کی دہائی کے شروع میں کشمیری طالبعلموں نے کشمیر یونیورسٹی کے قیام کیلئے جدوجہد شروع کر دی۔ یہ جدوجہد اتنی سرگرم اور شدید تھی کہ اس وقت کے آزاد کشمیر کے صدر بریگیڈیئر حیات خان اور پاکستان کی فوجی آمریت کو فوری طور پر اس مطالبے کے آگے جھکنا پڑا لیکن ایک واحد یونیورسٹی قائم کرنے کی بجائے حکمرانوں نے کشمیری نوجوانوں کو دھوکہ دیتے ہوئے مختلف شہروں میں کچھ ڈیپارٹمنٹس، شعبے اور کالج قائم کر دیے۔ وہ ڈر گئے تھے کہ ایک جگہ پر یونیورسٹی قائم ہونے سے طالبعلم اکٹھے ہو جائیں گے اور ان کا اکٹھا ہونا حکمرانوں کیلئے کسی بھی وقت برا شگون ثابت ہو سکتا تھا۔

یہ اور ایسے کئی دیگر جابرانہ اقدامات کی وجہ سے آزاد کشمیر حکومت کے خلاف اٹھنے والی کئی تحریکوں کی نوعیت مقامی اور مختلف حصوں میں منقسم رہی ہے لیکن اکثر اوقات کشمیر کی کٹھ پتلی حکومت ان تحریکوں کو کچلنے میں ناکام رہی ہے۔ اگر ہم ان تحریکوں کا قریب سے مشاہدہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ کبھی بھی بھارتی مقبوضہ کشمیر کی تحریک کی انتہا کو نہیں پہنچ پائیں۔ لیکن بارہا ایسا ہوا کہ ان تحریکوں نے حکمرانوں کو لرزا کے رکھ دیا۔ پاکستانی حکمرانوں نے بھی اپنے بھارتی حکمران بھائیوں کی طرح ان تحریکوں کو کچلنے کیلئے انتہائی ظالمانہ طریقے استعمال کئے۔

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ 48-1947 میں لڑی جانے والی جنگ کا طبقاتی پہلو انتہائی جاندار تھا۔ جب کشمیر کے عوام اپنے اوپر لاگو جابرانہ قوانین، معاشی بدحالی، وحشیانہ ٹیکسوں اور ڈوگرہ راج کے ظالمانہ کردار کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بدقسمتی سے تحریک کی قیادت پر پسماندہ ورجعتی لوگ براجمان تھے جو کہ پاکستانی حکمرانوں کے دم چھلے کا کردار ادا کر رہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے مقاصد پورے ہو جانے پر آقاؤں نے اپنے ان غلاموں کو بھی نہیں بخشا اور پاکستان کی وزارت کشمیران کو وقتاً فوقتاً برطرف کرتی رہی۔

ان میں سے کئی لیڈروں کو تو گرفتار کر کے پابند سلاسل بھی کیا گیا۔ شروع دن سے ہی پاکستانی حکمرانوں اور ان کے کٹھ پتلی کشمیری حکمرانوں کے مابین اعتماد اور احترام کا تعلق قائم نہیں ہو سکا اور سب روز اول سے ہی ایک دوسرے سے محتاط رہتے چلے آرہے ہیں۔ یکم جنوری 1948ء کو جب کشمیر کا معاملہ اقوام متحدہ میں پیش کیا جانا تھا تو دو کشمیری وفود بھی اپنا موقف پیش کرنے کیلئے روانہ کئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک بھارتی کشمیری اور دوسرا پاکستانی کشمیری وفد تھا۔ پاکستانی وفد کی قیادت سردار ابراہیم خان کر رہا تھا۔ پاکستانی حکمرانوں کو اپنے بھیجے گئے نمائندے پر اتنا اعتماد بھی نہیں تھا کہ وہ اسے کھلی اجازت دے دیتے بلکہ اس کی بجائے انہوں نے اس

کے ساتھ ہی ایک نگران بھی نتھی کر دیا جو ہر وقت اٹھتے بیٹھتے ہر محفل ہر میٹنگ میں اپنے نمائندے کے سر پر سوار رہتا تھا اور اس کو میڈیا سمیت کسی کے ساتھ گھلنے ملنے نہیں دیتا تھا۔شیخ عبداللہ اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے:

> پاکستانی سردار ابراہیم کو میرے مقابلے پہ حقیقی لیڈر کے طور پر پیش کر رہے تھے اور اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے تھے۔لیکن یا تو ان کو سردار ابراہیم کی صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں تھا یا پھر وہ اس سے مشکوک تھے، انہوں نے کشمیری پس منظر کے حامل ایک معروف بیوروکریٹ محمد دین تاثیر کی تصویر پیش کی اور کہا کہ یہ سردار ابراہیم ہے۔تاثیر کو مختلف جگہوں پر سردار ابراہیم کے طور پر متعارف کرایا گیا۔جب سردار ابراہیم کو معلوم ہوا تو وہ برہم ہو کر اگلے دن ہی واپس لوٹ آیا۔(19)

اپنے اس مجرمانہ فعل کی پاداش میں سردار ابراہیم کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا جس پر سارے آزاد کشمیر میں احتجاج شروع کر دیا گیا۔ضلع پونچھ میں راولاکوٹ اور پلندری کے علاقوں میں بغاوت پھوٹ پڑی۔میجر عثمان (جو بعد میں بنگلہ دیش کی فوج میں جنرل بنا تھا) کی قیادت میں 120 فوجیوں کا ایک دستہ بغاوت پر قابو پانے اور اس کی قیادت کو گرفتار کرنے کیلئے بھیجا گیا لیکن یہ دستہ خود ہی باغیوں کے ہاتھوں راولاکوٹ میں یرغمال بن گیا اور باغیوں نے ان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔اس ذلت آمیز شکست کے بعد پاکستانی حکومت نے سردار ابراہیم پر شدید دباؤ ڈال دیا جس کی وجہ سے اسے سمجھوتے پر مجبور کر دیا گیا اور اسے پاک فوج کے ساتھ تحریری معاہدہ کرنا پڑا۔اس نے اپنے قبیلے کو غیر مسلح کر دیا اور یہ اسلحہ اس وقت کے وزیر برائے امور کشمیر مشتاق گورمانی کے ذریعے حکومت پاکستان کے حوالے کر دیا۔1951ء کے آخر تک یہ عارضی اختلاف رفع دفع کر لئے گئے۔

لیکن اس کے باوجود بھی زیریں سطح پر تضادات اور اختلافات ابھرتے رہے۔

سردار ابراہیم نے اپنا احتجاج جاری رکھا اور مطالبہ کر دیا کہ آزاد کشمیر کے صدارتی الیکشن براہ رَاست کرائے جائیں۔ پاکستان اس مطالبے کو نظرانداز کرتا رہا۔ جس کا نتیجہ 1955ء میں ایک اور مسلح سرکشی کی صورت میں نکلا۔ ایک بار پھر پاک فوج کو بغاوت کو کچلنے کی ذمہ داری سونپی گئی لیکن پھر کشمیر میں پاک فوج کی ساکھ متاثر ہونے کے اندیشے کے پیش نظر یہ فیصلہ واپس لے لیا گیا۔ اس کی بجائے یہ فیصلہ کیا گیا کہ پنجاب کانسٹیبلری راولاکوٹ اور سدھنوتی کے علاقے میں یہ کار خیر سرانجام دے گی جو اس مسلح سرکشی کا گڑھ بنے ہوئے تھے۔ پنجاب پولیس کی ایذارسانیوں اور بہیمانہ سرگرمیوں کے بارے میں خود پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے منظورنظر سردار عبدالقیوم خان کے اپنے الفاظ میں:

> 1955ء کے وہ دن جب پنجاب پولیس ہمارے خطے میں آئی تھی، ہماری تاریخ کے سیاہ ترین دن ہیں۔ جب میں 1956ء میں صدر بنا تو مجھے اہل علاقہ کے غموں کا مداوا کرنے کا موقع ملا۔ لہٰذا بہت سے افراد جو اس وقت تک گرفتار تھے، میں نے ان کو رہا کر دیا لیکن جن لوگوں کے گھر جلا دیے گئے تھے، ان کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی اشک شوئی کیلئے میں نے ان کو کچھ رقم دے دی۔ (20)

یقینی طور پر سردار قیوم نے اپنی معروضات میں کشمیری خواتین کے ساتھ پنجاب پولیس کی طرف سے کئے گئے بلادکاروں کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ اس کی وجہ سے کہیں پاکستانی ریاست کشمیری عوام کی نظروں سے ہی نہ گر جائے۔ لیکن جو ان واقعات کے عینی شاہد ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ واقعات اسی نوعیت کے تھے جو کنٹرول لائن کے اس پار بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ہماری بہنوں بیٹیوں کے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔

کشمیر میں مسلسل بدحالی وذلت کی زندگی گزارنے والے عام کشمیریوں کی

حالت زار پر پاکستانی حکمرانوں اوران کے کٹھ پتلی کشمیری حکمرانوں کی مصنوعی وکھوکھلی ہمدردی اوران کی آنکھوں سے ٹپکنے والے مگرمچھ کے آنسو، ان مفلوک الحال کشمیریوں کی توہین کے سوا کچھ نہیں۔اس وقت جب بنیاد پرست، لبرل اور دوسری تمام طلباء تنظیمیں منڈی میں اپنی بولیاں لگواتے رہے، کشمیری نوجوانوں نے جدوجہد کی مشعل کو جرات کے ساتھ تھامے اور روشن کیئے رکھا۔اس وقت جب پاکستان میں طلباء سیاست بازار کی ایک جنس بن گئی جب یہ تعلیمی اداروں کے اندرمنشیات، جرائم،غنڈہ گردی، بدمعاشی اور مفادات کی علمبردار بن کے رہ گئی تھی اگر ایسے تاریک و مایوس وقت میں کشمیری نوجوانوں نے جدوجہد کا دامن نہیں چھوڑا تو آنے والے طوفانی واقعات کے لمحوں میں یہ کیا معجزے کر دکھائے گی اس کا اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں ہے۔انقلابی رجحانات اور طوفانی جذبے جو نوجوانوں میں پروان چڑھ رہے ہیں وہ جب بھی اپنا اظہار کریں گے تو یہ پاکستانی نوجوانوں اور طالبعلموں کیلئے ہمت و جرات کا مینار نور ثابت ہوں گے۔لائن آف کنٹرول کے مغربی طرف بسنے والے کشمیری پاکستانی حکمرانوں کی طرف سے خیرات میں ملنے والی ''آزادی'' کو دیکھتے اور سمجھتے آرہے ہیں؛ وہ اس آزادی کی دیوی کو اچھی طرح جان چکے ہیں جو انہیں محرومی، تذلیل، مایوسی،غربت اور بیماریوں کے سوا کچھ بھی نہیں دے سکی۔ یہ آزادی ان کو اپنا خوبصورت وطن چھوڑ کر دوردراز کے گندگی اور تعصب سے اٹے علاقوں میں ہجرت کرنے سے نہیں روک سکی، آزادی کا اصل مفہوم ان پر عیاں ہو چکا ہے۔روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم،صحت، پانی، بجلی اور دیگر بنیادی ضرورتوں کے بغیر آزادی ایک مفروضہ ایک دکھ، ایک ذلت اور ایک دھوکے سے کم نہیں ہوتی۔

اگر لائن آف کنٹرول کے اس پاران کے بھائی اور بہنیں جبر وتشدد کا شکار ہیں تو یہاں بھی ان کی کیفیت ان سے مختلف نہیں ہے۔کشمیر کے محروم طبقات کی نئی نسل کیلئے اپنے وطن میں رہ کر کوئی مستقبل نہیں ہے لہٰذا ان کیلئے واحد رستہ ہجرت ہی

بچتا ہے۔لیکن بیشتر نوجوانوں نے ہجرت سے انکار کر دیا ہے۔انہوں نے اپنے معروض سے لڑنے،اپنے حالات کی سختیوں کا مقابلہ کرنے اور اپنے حقوق کیلئے جدوجہد کرنے کا رستہ چن لیا ہے۔وہ محرومی کی اسی تاریک رات سے امید اور مستقبل کا روشن سورج ابھار کے رہیں گے۔

لائن آف کنٹرول کے اس پار کے نوجوانوں کی بھارتی بورژوا ریاست کی طاقتور فوج کے خلاف دلیرانہ جدوجہد،اس طرف کے کشمیر کے نوجوانوں کے حوصلوں کو اور بھی تازگی، جرات اور جانبازی عطا کر رہی ہے۔کشمیری نوجوانوں کے اندر جو تڑپ ہمیں نظر آتی ہے اس کے پیچھے یہ عنصر انتہائی موثر کردار ادا کر رہا ہے۔کشمیری نوجوانوں کی انقلابی جرات جلد یا بدیر کشمیری مزدوروں،غریب کسانوں اور محروم عوام کو ایک نئے رستے اور ولولے سے روشناس کرائے گی، جو اس پار کے کشمیریوں کو اپنے ساتھ ملا دے گی اور تب انقلاب کا یہ شعلہ ایک نئی انقلابی تحریک کو بھڑکا دے گا جس کی تپش صرف کشمیر میں ہی نہیں بلکہ دور دور تک اپنے اثرات مرتب کرے گی۔

باب نمبر 7

بنیاد پرستی، قوم پرستی اور سوشلزم

> سوشلزم کا مقصد محض نسل انسان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم اور کسی بھی شکل میں قومی بیگانگی کا خاتمہ ہی نہیں۔ یہ صرف قوموں کو قریب لا کر اکٹھا ہی نہیں کرتا بلکہ وہ ان کا ادغام بھی کرتا ہے۔
>
> وی آئی لینن (1)

عہد

انسانی سماجوں کی تاریخ میں ہر عہد کا اپنا مخصوص کردار ہوتا ہے جس کو مختلف عناصر متعین کرتے ہیں لیکن سب سے بڑھ کر اس مخصوصیت کا تعین وہ معروضی حالات کرتے ہیں جن حالات سے کوئی بھی سماج وقت کے اس خاص لمحے میں گزر رہا ہوتا ہے۔ اگر ہم تاریخ کا عمومی جائزہ لیں تو ہمیں رجعتی رجحانات زیادہ عرصے پر حاوی دکھائی دیتے ہیں۔ سماج کی ہر سطح پر ایک سکوت طاری رہتا ہے اسی لئے انقلابی عہد تاریخ کے غیر معمولی لمحات ہوتے ہیں۔ لیکن پھر پوری تاریخ اس بات کی بھی گواہی

دیتی ہے کہ انتہائی جمود کے عرصوں میں بھی تبدیلی کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ تبدیلی کا یہ عمل بتدریج طرز ارتقاء کی بجائے بڑی پھلانگوں کی صورت میں خود کو تاریخ میں ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابات کو تاریخ کے انجن کا نام دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ مارکس نے کہا تھا:

> تمام تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ اور ہر سماج کی بنیاد' جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حاکم اور محکوم طبقات کی کشمکش اور مخاصمت پر ہے۔ (2)

طبقاتی جدوجہد تمام وقتوں میں ایک ہی رفتار' شدت اور روانی سے کبھی آگے نہیں بڑھتی۔ اس کے باوجود یہ ہر طبقاتی سماج میں موجود ہوتی ہے اور اس کی رفتار اور شدت کا انحصار عہد کے کردار پر ہوتا ہے۔ ایسے عرصوں میں جب تحریک کی شدت اور روانی مدہم ہو جاتی ہے تو دوسرے تضادات جن کا تعلق ماضی کے کسی عہد سے ہوتا ہے ان معاشروں کے سیاسی و سماجی افق پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ماضی کے یہ تصادم ان نئے تضادات کو حل کرنے میں مکمل طور پر نااہل ہوتے ہیں اور نتیجتاً عوامی جدوجہد کو پیچیدہ کرنے اور اس کے دورانیے میں طوالت کا باعث بنتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم کشمیری عوام کی جدوجہد کی تاریخ کو دیکھیں تو ہمیں یہ مظہر ہر اہم موڑ پر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دے گا۔ تقسیم کے بعد کے تمام تر عرصے میں اس جدوجہد میں کوئی ٹھہراؤ نہیں آیا اگرچہ 1989ء کے بعد کی سرکشی زیادہ پرزور تھی لیکن اس سے یہ معنی اخذ کرنا غلط ہوگا کہ اس سے پہلے وہاں کوئی امن اور استحکام تھا۔ فرق صرف یہ ہے اور جیسا ہر قومی آزادی کی تحریک میں ہوتا ہے کہ جدوجہد کی شدت' قوت اور روانی کے ساتھ ساتھ اس پر حاوی رجحانات اور نظریات بھی تبدیل ہوتے ہیں۔ موضوعی عنصر کا کردار بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہمیں ایک لمحے کیلئے بھی اپنی منزل کی سمت کو بھولے بغیر تمام تر راستے کو بھی اس کے تمام اتار چڑھاؤ سمیت دیکھنا ہوتا ہے۔

مذہبی احیاء کی وجوہات

1980ء سے جدوجہد میں جس رجحان نے کافی حد تک نمایاں ہونا شروع کر دیا تھا وہ اسلامی بنیاد پرستی تھی۔ کئی مذہبی جنونی تنظیمیں اور دہشت گرد گروہ کشمیر میں پھلنے پھولنے لگے۔ تاہم اس مخصوص عہد میں یہ مظہر صرف کشمیر تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اسلامی اور متعصب مذہبی رجعتیت دوسری کئی شکلوں میں دنیا کے مختلف خطوں میں زور پکڑ رہی تھی۔

اس کی وجہ بے شمار وجوہات تھیں لیکن سب سے بڑی وجہ 1980ء اور 1990ء میں بائیں بازو کے زوال سے جنم لینے والا خلا تھا جسے کو عارضی طور پر ان رجعتی قوتوں نے پر کیا۔

موجودہ عہد کا المیہ یہ ہے کہ کوئی بھی روایتی عوامی پارٹی کسی بڑی تبدیلی یا زوال پذیر سرمایہ داری نظام کی سماجی تبدیلی کی بات تک نہیں کرتی۔ دیوہیکل واقعات جن میں سوویت یونین اور دیوار برلن کا انہدام شامل ہیں' نے معروضی صورتحال میں رجعتیت کو مزید گہرا کر دیا۔ اس کا نتیجہ ایک عارضی سکوت جس میں ناامیدی اور مایوسی میں اضافہ اور تمام تر خوش فہمیوں کا خاتمہ اور حقائق سے روح گردانی جیسے رجحانات کی بڑھوتری کی صورت میں سامنے آیا۔ ایسے ماحول میں تعصب کے جراثیم اور غیر سائنسی اور غیر عقلی سوچیں تیزی سے پروان چڑھیں۔ پچھلے پچاس سال کے عرصے میں ہم نے معاشی اور سیاسی مقاصد کیلئے مذہبی احیاء دیکھا۔ اس احیاء کی اہم وجوہات یہ ہیں۔

سوویت یونین کے انہدام اور چینی بیوروکریسی کے سرمایہ داری کو گلے لگانے کے نتیجے میں نام نہاد بائیں بازو کی پارٹیوں اور ان کی قیادتوں کی زوال پذیری میں اضافہ ہوا۔ اس میں روایتی عوامی پارٹیوں اور ٹریڈ یونین کی قیادتوں کی غداری بھی

شامل ہے۔

سماج میں بڑھتی ہوئی معاشی اور سماجی تفریق' سماجی بحران میں اضافہ اور اس صورتحال سے نجات کے واضح راستے کا فقدان سیاسی بحران میں اضافے کا باعث بنا جس سے ناگزیر طور پر انتہا پسندی اور دہشت گردی نے جنم لیا۔ یہ مستقبل کے حوالے سے غیر یقینی کی صورتحال میں ماضی کے مزاروں سے روشنی کی تلاش کی ایک رجعتی کوشش ہے۔

بڑے پیمانے پر آبادی کی دیہاتوں سے شہروں کی جانب ہجرت نے اس بحران میں شدت پیدا کر دی۔ شہروں کے مضافات اور جھونپڑ پٹیوں میں عدم تحفظ' مفلوک الحالی اور زندگی کی دیگر تلخیوں نے ذہنی پراگندگی اور مایوسی میں اضافہ کیا۔ یاس و محرومی میں ڈوبے ہوئے بے شمار نوجوان جرائم کی طرف راغب ہوئے اور ان مذہبی تنظیموں نے ان جرائم پیشہ لمپن عناصر کو منظّم کیا اور انہیں سیاسی تحفظ فراہم کیا۔ اس مفلوک الحال زندگی سے نجات کے راستے کے فقدان اور اپنے جرائم پر ندامت و ملامت کے احساس سے نجات کیلئے کئی نوجوان اس مذہبی باطنیت میں غرق ہو گئے۔

نوجوانوں کی پسماندہ پرتوں میں روائتی بورژوا لبرل سیاستدانوں کی بدعنوانی' خودنمائی اور رغرور کے خلاف نفرت بھی ایک اہم عنصر ہے جو ان مذہبی تنظیموں کے کارکنان میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ جبکہ مذہبی سیاستدان ''سماجی انصاف'' ''بدعنوانی کا خاتمہ'' ''ثقافتی پاکیزگی'' اور پارسائی کے منافقانہ واعظ کرتے رہتے ہیں۔ کمیونزم کے خاتمے کے پروپیگنڈے اور قوم پرستی کے تاریخی زوال نے بھی مذہبی تعصّبات کے سماج کی وسیع تر پرتوں میں سرائیت کرنے کی راہ ہموار کی۔

مختلف اسلامی ممالک کے مذہبی مدرسوں میں زیر تعلیم ان ہزاروں لاکھوں بچوں کے والدین وہ ہیں جو ان کی پرورش اور علم و تدریس کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ ان بچوں کے دو ہی مستقبل ہوتے ہیں یا تو وہ چائلڈ لیبر کی منڈی کا خام مال بن

جائیں یا پھر ان مدرسوں کے قید خانوں میں داخل ہو جائیں جہاں انہیں کم از کم چھت اور روٹی کے چند ٹکڑے میسر آتے ہیں۔ان مدرسوں کی انتظامیہ انتہائی بے رحم' جابر' تشدد پسند اور وحشی ہوتی ہے جو ان بچوں پر جنسی تشدد بھی کرتی ہے اور انہیں غیر سائنسی مذہبی عقائد بھی رٹاتی ہے۔

> یہ تعلیم انتہائی اکتا دینے والی اور مابعد الطبعیاتی واعظوں پر مبنی ہے۔ان ''مدرسوں'' کا ایک ہی کام ہے۔ یہ انتہا پسندی' نسلی منافرتیں' تعصّبات اور دہشت گردی کے رجحانات کو پروان چڑھانے والے ... اداروں کی طرز پر تشکیل دیئے گئے ہیں ان مدرسوں میں اردو کے جو حروف تہجی پڑھائے جاتے ہیں وہ ان کی رجعتی سوچ کے علامتی ہیں مثلاً ''ج سے جہاد'' ''ت سے توپ'' ''ک سے کلاشنکوف'' اور ''خ سے خون'' (3)

بعد کے مراحل میں انہیں ماضی بعید کی تاریخ پڑھا کر ان کے ذہنوں کو قرون وسطیٰ کے عہد سے پہلے کی عادات' رویوں' قدروں' مذہبی داستانوں اور جنگوں کے اندھیروں میں ڈبو دیا جاتا ہے۔ماضی بعید کے اندھیروں میں غرق شدہ یہ ذہن آج کے جدید حالات سے متصادم ہو جاتے ہیں اور بالآخر ایسے جنونی اور وحشیانہ حرکات و اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں جن کا مظاہرہ ہم نے گزشتہ چند دہائیوں کے دوران دیکھا۔

حالیہ سفاک اور زہر آلود اسلامی بنیاد پرستی کی یہ اصل بنیادیں ہیں۔اس نے اسلامی پس منظر کی حامل نوجوانوں کی ایک پوری نسل کو برباد کر دیا ہے۔ دہشت گردی' بربریت اور خونریزی اس انتہا پسندی کا نتیجہ ہیں جو ایک جمود کا شکار سماج اور گلے سڑے نظام جس میں مستقبل انتہائی تاریک اور خوفناک ہی ہو سکتا ہے' کی براہ راست پیداوار ہے۔ان اسلامی بنیاد پرستوں کے کارکنان میں اضافے کا ایک اور ذریعہ ان کا فلاحی کام اور صحت اور دوسری ضروری سہولیات فراہم کرنے کی وہ

سرگرمیاں ہیں جو یہ اس جمع شدہ دولت سے کرتے ہیں جو انہوں نے سامراج' سرمایہ داروں اور منشیات کے سمگلروں سے اپنی خدمات کے عوض اکٹھی کی ہوئی ہے۔

ڈالر جہاد

مذہبی بنیاد پرستی کی مالیاتی اور سماجی حمایت کا ایک اور بڑا ذریعہ گلوبلائزیشن اور سامراجی اجارہ داریوں کا کچل دینے والا غلبہ ہے جس نے مقامی صنعتکاروں' تاجروں' کاروباریوں اور منشیات کے سمگلروں کے ایک حصے کو برباد کر دیا۔ مذہبی پارٹیوں کو سب سے بڑی حمایت سماج کے انہیں حصوں سے ملتی ہے۔ مذہبی بنیاد پرست مطلوبہ دولت کے حصول کی خاطر مختلف مجرمانہ طریقے بھی استعمال کرتے ہیں جن میں منشیات کی پیداوار اور اسلحے کی سمگلنگ وغیرہ شامل ہیں۔ 1980ء کی دہائی میں افغان جہاد کی مالی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے امریکی سامراج نے بھی ان کی مالی امداد کی اور اس مجرمانہ تجارت کو مزید فروغ دیا۔

> ہیروئین کی بے پناہ پیداوار پہلی افغان جنگ (88-1979ء) کا براہ راست نتیجہ تھا۔ اس سے جو دولت حاصل ہوتی تھی وہ مجاہدین کی مدد کیلئے خرچ کی جاتی تھی جو سابقہ سوویت یونین کے خدا کے منکر فوجیوں سے برسرپیکار تھے۔
>
> بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل (BCCI) کی تشکیل اور تیزی سے پھیلاؤ سرد جنگ اور منشیات فروشوں کی فوری ضروریات کا تقاضا تھا۔ اس کے ذریعے بہت بڑے پیمانے پر کالے دھن کو سفید کیا جاتا تھا۔ پاکستان سے ہیروئین اور کولمبیا سے کوکین کا پیسہ تمام مغربی ممالک میں سیاستدانوں اور بینکاروں کو رشوت دینے' نکاراگوے میں ردانقلابی سرگرمیوں کو فروغ دینے اور افغانستان میں ملاؤں کو دیا جاتا تھا۔ (4)

منشیات کے تاجروں نے اس گھناؤنی تجارت سے اربوں کمائے۔ ذاتی ملکیت

پر یقین اور اس کے بھرپور تحفظ کے نظریات ہمیں ابوالاعلیٰ مودودی اور اسامہ بن لادن جیسے بنیاد پرست نظریہ دانوں کی تحریروں اور تقریروں میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ حقیقت میں مسلمان علماء سرمایہ داری کے سب سے بڑے حمایتی ہیں چونکہ ان کے اپنے سیاسی اور سماجی وجود کا انحصار مالیاتی سرمائے پر ہے۔ تاہم سامراج اور بنیاد پرست اپنے بدلتے ہوئے مفادات کے مطابق اپنی وفاداریاں بھی مسلسل تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ اسی لئے ایک وقت میں سامراج اور بنیاد پرست ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں اور پھر دوسرے وقت میں دشمن ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

اگر مسلم ممالک میں بنیاد پرستی ہے تو امریکہ میں بھی عیسائی بنیاد پرستوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ امریکہ کی 90 فیصد آبادی خدا پر یقین رکھتی ہے۔ 60 فیصد کو فرشتوں کے وجود پر یقین ہے۔ صرف اکیلے امریکہ میں پورے یورپ سے زیادہ معتقد پائے جاتے ہیں۔ امریکی عیسائی بنیاد پرستوں نے 9/11 کے واقعات کو خدا کا قہر قرار دیا تھا جس کی وجوہات ان کے خیال میں یہ ہیں کہ امریکی سماج میں مردوں اور عورتوں کا آزادانہ میل جول، اخلاقی زوال پذیری اور سماجی بدعنوانی اپنی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔ اسی طرح یہودی بنیاد پرست اسرائیل کو یہودی بنیاد پرستوں کا حقیقی ماڈل تسلیم نہیں کرتے۔ وہ صہونیت کو پوری دنیا میں پھیلانے کی تعصّبانہ خواہش اور نظریہ کے حامی ہیں۔ وہ فلسطینیوں کے قتل عام کو لادین لوگوں کے قتل عام کے مترادف سمجھتے ہیں۔ بنیاد پرستی کے لبادے میں اسرائیلی حکمران بدترین جبر اور بربریت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جس کا نتیجہ مذہبی تعصب کے پھیلاؤ اور ایک ایسی کیفیت کے جنم کی صورت میں برآمد ہو رہا ہے جس میں دہشت گردی، بربریت اور منافرتیں ایک دوسرے پر پلتی ہیں۔ معصوم انسانوں کا لہو بنا کسی رکاوٹ کے مسلسل بہایا جا رہا ہے۔

یہاں تک کہ نام نہاد سیکولر حکمران جیسے بے نظیر بھٹو اور اب مشرف بھی بار بار

مذہب کو استعمال کرتے ہیں جب بھی انہیں کسی بحران، سیاسی خلفشار یا عوامی غیض وغضب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جب حکمرانوں کی گلی سڑی پالیسیاں اور ناکام نظام سماج کو ترقی دینے میں ناکام ہوتے ہیں تو حکمران عوام کے مذہبی جذبات کا استحصال کرتے ہیں خاص طور پر سماج کی پسماندہ پرتوں کا۔ یہ محنت کشوں اور کسانوں کی تحریکوں کو تقسیم کرنے اور ان کو برباد کرنے کیلئے کیا جاتا ہے۔ حج یاترا، مزاروں پر حاضریاں اور مذہبی تقریبات میں شرکتیں ان قیادتوں کی پالیسیوں کا لازمی جزو ہیں۔ ملاؤں اور فوج کے کچھ حصوں کے باہمی اتحاد کی بنیاد بھی امریکی امداد کے بند کیے جانے کی بے وفائی کا مشترکہ احساس ہے۔ اس کا مطلب افغان جہاد کے دوران سامراج کی جانب سے ملنے والی دولت کا خسارہ ہے۔ حال ہی میں ایک ریٹائرڈ پاکستانی جنرل نے اپنے دکھ کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

> پاکستان ایک ایسا کنڈوم تھا جس کی امریکہ کو محض افغانستان میں داخل ہونے کیلئے ضرورت تھی۔ ہم اپنا فریضہ ادا کر چکے ہیں اور اب وہ سوچتے ہیں کہ ہمیں کچرے کے ڈبے میں پھینک دیا جائے۔

ضیاء الحق مسلح افواج (آرمڈ کور) کا ایک ایسا آفیسر تھا جس کی تربیت امریکہ کے سب سے اعلیٰ فوجی تربیتی مرکز فورٹ بریگ میں کی گئی تھی۔ وہ نماز تو شاید خدا کیلئے پڑھتا تھا لیکن اس کے دیگر تمام افعال اپنے حقیقی آقا ریاست ہائے متحدہ امریکہ کیلئے ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر 1970ء میں اس نے عمان میں ایک فوجی آپریشن کی قیادت کی تھی جس میں 18 ہزار فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا تھا۔ یہ واردات خون کے پیاسے اسرائیلی اور امریکی ماہرین نے اردن میں اپنے حواری ایجنٹ بادشاہ حسین کو عمان میں ابھرنے والی فلسطینیوں کی انقلابی سرکشی سے محفوظ رکھنے کیلئے تیار کی تھی۔ لیکن یہ بریگیڈیئر ضیاء تھا جس نے اس وحشیانہ واردات کو عملی جامہ پہنایا تھا۔ یہ

اس کی اسلامی تعلیمات سے بالکل بھی متصادم نہیں ہوا اور اس نے وہاں مسلمانوں کے اتنے بڑے قتل عام میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ اس عہد میں اسلامی احیاء کی کئی تحریکیں بڑی مضبوطی سے امریکی سامراج سے جڑی ہوئی تھیں۔

اس رجعتی بنیاد پرستی کی ایک اور اہم خصوصیت ان کی انتہا درجے کی موقع پرستی ہے۔ ایک جانب یہ دہشت گردی پھیلاتے ہوئے انتہائی سفاکی' جبر اور غیر لچکداری کا مظاہرہ کرتے ہیں جبکہ دوسری جانب ان کے کردار میں بے پناہ موقع پرستی' کمزوری' لالچ اور بزدلی بھی نمایاں ہے۔ بار بار انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اسی کے ہاتھوں بک جاتے ہیں جو انہیں پہلے موقع دیتا ہے۔ اسی لئے مذہبی بنیاد پرستوں کی سب سے بڑی خصوصیت' مذہب کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر' منافقت ہے۔ جن سماجوں میں مذہبی بنیاد پرستوں کی کافی عوامی بنیادیں ہوں منافقت اس سماج میں معمول بن جاتی ہے۔ یہ حقیقت ان کے سامراج اور سرمایہ داری سے تعلقات میں کھل کر سامنے آتی ہے۔

افغان جہاد کے دوران جب پاکستانی جرنیلوں نے عرب ممالک سے درخواست کی کہ شاہی خاندان کے کسی نمایاں فرد کو بھیجا جائے تا کہ جہاد کو آگے بڑھایا جاسکے اور اس کیلئے ریکروٹمنٹ میں اضافہ کیا جاسکے تو جو فرد بھیجا گیا تھا وہ اسامہ بن لادن تھا۔

> جب اسامہ بن لادن پاکستان پہنچا تو اس وقت امریکی نیشنل سیکیورٹی ایڈوائزر زبیگنیو برزنسکی جہاد کو فروغ دینے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے کیلئے پاکستان کے سرکاری دورے پر آیا ہوا تھا۔ اسامہ بن لادن بھی اس کے سامعین میں شامل تھا جب اس نے خیبر پاس پر ایک تقریر کی۔ اپنی تقریر میں برزنسکی نے کہا ''جاؤ اور ان روسیوں سے لڑو جو خدا کے منکر ہیں۔ جاؤ جہاد کرنے کیلئے خدا تمہارے ساتھ ہے۔''(6)

اسامہ بن لادن کا ایک مغرب نواز ''آزادی پسند لڑاکا'' کی حیثیت سے پہلا

آپریشن ایک مخلوط نظام تعلیم کا حامل سکول تھا۔اس سکول پر حملہ کر کے اس کی عمارت کو جلا کر راکھ کر دیا گیا اور اس کے ہیڈ ماسٹر کو وحشیانہ انداز میں قتل کرتے ہوئے اس کا پیٹ چاک کر کے اس کی تمام انتڑیاں باہر نکال دی گئیں۔جنوری 1998ء میں فرانسیسی ہفت روزہ جریدے لے نوول آبزرویٹر نے جمی کارٹر کے نیشنل سیکیورٹی ایڈوائزر برزنسکی کا ایک انٹرویو شائع کیا جس نے شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی:

سوال: سی آئی اے کے سابق ڈائریکٹر رابرٹ گیٹس نے اپنی یاداشتوں (پرچھائیوں سے) میں لکھا ہے کہ امریکی انٹیلی جنس نے افغانستان پر سوویت حملے سے 6 ماہ پیشتر ہی مجاہدین کی امداد شروع کر دی تھی اور اس دور میں آپ صدر کارٹر کے نیشنل سیکیورٹی ایڈوائزر تھے اس لئے آپ کا اس معاملے میں ایک کردار تھا۔کیا یہ درست ہے؟

برزنسکی: ہاں، سرکاری تاریخ کے مطابق سی آئی اے نے مجاہدین کی امداد 1980ء میں شروع کی تھی یعنی 24 دسمبر 1979ء کو افغانستان پر سوویٹ یونین کے حملے کے بعد۔لیکن حقیقت جو ابھی تک سختی سے پس پردہ رکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ 3 جولائی 1979ء کو صدر کارٹر نے کابل میں سوویٹ نواز حکومت کے مخالفین کو خفیہ طور پر امداد مہیا کرنے کے احکامات پر دستخط کئے تھے۔

سوال: کیا آپ کو کبھی بھی اسلامی بنیاد پرستوں کی امداد کرتے ہوئے انہیں اسلحہ اور تربیت دیتے ہوئے ندامت محسوس نہیں ہوئی جو مستقبل کے دہشت گرد تھے۔

برزنسکی: دنیا کی تاریخ کیلئے اہم چیز کیا تھی؟ طالبان یا سوویٹ یونین کا انہدام؟ چند جنونی مسلمان یا وسطی ایشیا کی آزادی اور سرد جنگ کا خاتمہ؟(7)

یہ حقیقت بھی اب ایک کھلا راز بن چکی ہے کہ افغانستان میں ہونے والے اسلامی جہاد میں اسرائیل بھی پوری طرح ملوث تھا۔

> 1985ء میں احمد منصور نامی ایک نوجوان صحافی کا جو اسلام آباد سے شائع ہونے والے ایک انگریزی روزنامے ''دی مسلم'' کیلئے کام کرتا تھا اچانک پرل کانٹی نینٹل ہوٹل پشاور کی بار میں اسرائیلی ایڈوائزر سے آمنا سامنا ہوگیا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ یہ خبر ضیاء کی اسلامی آمریت کیلئے بہت بڑا دھچکہ ثابت ہوسکتی ہے اس نے اپنے ایڈیٹر سمیت کچھ دوستوں اور WTN کے ایک نمائندے سے اس خبر کے بارے میں بات چیت کی۔ چند روز بعد سیکیورٹی ایجنسیوں کے خبردار کرنے پر اسلامی مجاہدین نے اس صحافی کو اغواء کر کے قتل کر دیا (8)

جدید اسلامی احیاء کی تحریکوں اور بدحواس بنیاد پرستی کے حقیقی خالق صدر آئزن ہاور کے دور اقتدار میں امریکہ کا سیکریٹری آف اسٹیٹ جان فوسٹر ڈلز تھا۔ 1956ء میں جنگ سوئز میں سامراج کی شکست کے بعد اور کئی اسلامی ممالک میں مقبول عام (پاپولسٹ) اور بائیں بازو کی تحریکوں کے ابھار کی صورت میں اس مذہبی تعصب پرستی کو عوام میں پھوٹ ڈالنے اور انقلابات کو کچلنے کیلئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ 20 ویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں امریکی پالیسی سازوں اور حکمت عملی کے خالقوں نے بائیں بازو کی تحریکوں اور محنت کش طبقے کی انقلابی جدوجہد کے خلاف اسلامی بنیاد پرستی کی زہر آلود رجعتی قوتوں کو استعمال کرنے کا واضح فیصلہ کیا تھا۔

اسلامی بنیاد پرستی کے پھیلاؤ اور استحصال میں برطانوی سامراج بھی مکمل طور پر شامل تھا۔ روزنامہ دی نیوز لاہور کے مطابق:

> برطانوی انٹیلی جنس ایجنسی (M16) ایم 16 نے عمر شیخ، جو کہ امریکی صحافی ڈینیئل پرل قتل کیس کا مجرم تھا، کو باہر عسکری تربیت کیلئے بھیجا

تھا۔ایم 16 کے رابطوں کا راز سابق برطانوی وزیر مائیکل میکیور نے دی گارڈین اخبار میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں فاش کیا۔اس نے کہا کہ ایم 16 نے 200 برطانوی مسلمانوں کو انتہا پسند تنظیم المہاجرون کے ذریعے ریکروٹ کیا تا کہ انہیں کوسووہ میں جہاد کرنے کیلئے تربیت دی جا سکے۔میکیور نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ برطانوی اور امریکی انٹیلی جنس ایجنسیاں شیخ کو پھانسی دینے کے خلاف تھیں' انہیں یہ خوف تھا کہ کہیں وہ یہ معلومات نہ فراہم کردے کہ برطانوی اور امریکی انٹیلی جنس ایجنسیاں دہشت گردوں کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرتی ہیں۔ (9)

پارسائی کے نقاب میں چھپا ہوا چہرہ

1996ء میں جب طالبان نے کابل پر قبضہ کیا تو سابق صدر نجیب اللہ کو اقوام متحدہ کے دفتر سے گھسیٹ کر باہر لایا گیا اور قتل کر دیا گیا۔بعد میں اس کی نعش کو اس کے بھائی احمد زائی کی نعش کے ساتھ کابل کے مرکزی چوک میں ایک کھمبے کے ساتھ لٹکا دیا گیا اور انتہائی سفاکی سے اس کے مختلف اعضاء کاٹ دیئے گئے۔مغرب کے کسی بڑے دانشور' سیاستدان یا انسانی حقوق کی ٹھیکیدار تنظیم نے اس بربریت کی حد تک وحشیانہ اقدام کا نوٹس تک نہیں لیا۔یہاں تک کہ ٹیلی ویژن سکرینوں پر اور اخبارات میں اس خوفناک بربریت کی تصویریں دیکھ کر بھی نام نہاد عالمی برادری نے احتجاج میں اپنی انگلی تک نہیں بلند کی۔

اب یہ حقائق مکمل طور پر آشکار ہو چکے ہیں کہ امریکی سامراج اور اس کی تیل کی اجارہ داریاں پس پردہ طالبان کی مکمل حمایت کر رہی تھیں۔کابل پر قبضے کیلئے امریکی تیل کی دیوہیکل اجارہ داری یونوکال نے انہیں 30 ملین ڈالر ادا کیے تھے۔حال ہی میں پاکستان کے 2002ء کے عام انتخابات کے بعد جب ایک سیاسی بحران ابھرا اور ایم ایم اے (6 اسلامی پارٹیوں کا اتحاد) کا جنرل سیکریٹری مولانا فضل الرحمان

بھی وزیراعظم کے عہدے کے امیدوار کے طور پر سامنے آیا اور مشرف کے ساتھ بات چیت کے دوران اس نے بطور وزیراعظم اس کے ساتھ اتحاد بنانے کی اپنی آمادگی ظاہر کی۔ جب جنرل نے یہ نقطہ اٹھایا کہ اس کی امریکہ دشمنی ایک سنجیدہ مسئلہ کھڑا کرسکتی ہے تو ملاں نے یہ جواب دیا۔

''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہم نے ماضی میں بھی امریکہ کے ساتھ مل کر کام کیا ہے۔ آپ مجھے وزیراعظم بنا دو میں سارے معاملات ٹھیک کردوں گا۔''(10)

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ امریکی سامراج اور اسلامی بنیاد پرستی کی معاشی بنیاد ایک ہی ہے اور وہ ہے: سرمایہ داری۔ اگرچہ نظام کے شدید بحران کے باعث سرمایہ داری کے مختلف دھڑے ایک دوسرے سے متصادم ہو جاتے ہیں تاہم آخری تجزیے میں یہ سارے دھڑے اسی سرمایہ داری نظام کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ کشمیر کی سیاسی تحریکوں میں ہمیشہ مذہبی عنصر موجود رہا ہے لیکن یہ ہمیشہ ان کی پہچان نہیں رہی۔ 1930ء میں شروع ہونے والی تحریکوں پر غالب رجحانات نہ صرف سیکولر بلکہ سوشلسٹ تھے۔ کشمیر میں اسلامی بنیاد پرستی کا ابھار تحریک کو تقسیم اور کمزور کرنے کیلئے پاکستانی اور ہندوستانی ریاستوں کی تخلیق اور کارستانی کا نتیجہ ہے۔

پاکستانی حکمران مذہبی بنیاد پرستی کے ذریعے تحریک کو اپنے سخت گیر کنٹرول میں رکھنے، اپنی خارجہ پالیسی کو آگے بڑھانے کیلئے اور علاقائی حکمت عملی (سٹریٹیجک) مقاصد کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ دوسری جانب بھارتیوں کے اپنے منصوبے ہیں۔

اچن وینائیک وضاحت کرتے ہیں:

ہندووتا کے حامیوں اور پیروکاروں کا مقصد یہ ہے کہ تمام ہندوؤں کا ایک خودشناس مذہبی اور ثقافتی گروپ کی حیثیت سے اتحاد تشکیل دیا جائے لیکن چونکہ بھارت کے ہندوؤں میں بے شمار تنوع موجود ہے اس لئے اس

> اتحاد کو حاصل کرنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ نہیں کہ ان چیزوں پر زور دیا جائے جو ان میں مشترک ہیں بلکہ اس کی بجائے وہ عنصر جس سے وہ دشمنی کی حد تک مخالفت کرتے ہیں۔ درحقیقت بیرونی مشترکہ مخالفین کے خلاف جتنے شدید نفرت کے جذبات ہوں گے اتنا ہی آپسی اتحاد کی خواہش مضبوط ہوگی۔ اس دشمنی کیلئے واحد مناسب امیدوار ہندوستان کی تاریخ میں ہندوؤں کیلئے ایک ہی ہے اور وہ ہیں مسلمان اور اسلام۔

فروری 1990ء میں انڈین انٹیلی جنس اداروں نے آزاد کشمیر بھر میں 46 ایسے کیمپوں کی نشاندہی کی جن میں ان جنونی بنیاد پرستوں کو تربیت دی جاتی تھی۔ انہوں نے ان کیمپوں کو محفوظ پناہ گاہوں کا نام دیا جہاں ان جہادیوں کو ہتھیار اور دھماکوں کی تربیت دی جاتی تھی۔ آزاد کشمیر کی مقامی حکومت کی طرف سے قائم کئے گئے مہاجرین کے کیمپوں کے برعکس، جہاں ہجرت کرنے والوں کے معمول کے مسائل اور اذیتیں دیکھی جاسکتی ہیں، جماعت اسلامی کے کیمپوں میں کوئی عورت، بچہ یا بزرگ نہیں ہوتا تھا۔ ان کیمپوں میں سبھی نوجوان ہوتے تھے جنہیں بہترین خوراک دی جاتی تھی۔ ریاستی جبر میں اضافہ ان جہادیوں کی عددی بڑھوتری کا باعث بنتا تھا۔ حفاظتی دستوں کی جانب سے ڈھائے جانے والے وحشیانہ مظالم کی داستانوں میں آئے روز اضافہ ہوتا تھا خاص کر دیہی علاقوں میں جہاں اوپر سے کنٹرول زیادہ موثر نہیں تھا۔ 1995ء میں وکٹوریہ سکوفیلڈ نے لکھا:

> بھارتی حکومت کے اندازے کے مطابق ایک جہادی کی اوسط عمر دو سال ہے جس کے بعد یا تو وہ مارا جاتا ہے یا پھر اس کا جہاد کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے۔ جو باغی ہتھیار ڈالتا ہے اس سے ابتدائی بحالی نو کے پروگرام کے اصولوں کے مطابق سلوک کیا جاتا ہے اور بعض اوقات اسے اپنی شناخت تبدیل کرنی پڑتی ہے۔ حفاظتی دستوں کی طرح بنیاد پرست باغیوں پر بھی عام لوگوں میں دہشت پھیلانے اور لوٹ مار کرنے کے الزامات

ہیں۔1995ء میں ایک طالبعلم نے انٹرویو میں کہا کہ میری پڑوسی خاتون کے گھر ایک رات کومجاہدین آئے اور روپے مانگے۔اگر وہی پہلے والے حالات ہوتے تو وہ انہیں اندر آنے کا کہتی انہیں کھانا کھلاتی لیکن اب کہ اس نے انکار کرتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔اس لئے انہوں نے دروازہ توڑ کر اس کو گولی ماردی۔اگر یہ مجاہدین کبھی آپ کے گھر آتے ہیں اور پیسے مانگتے ہیں یا جہاد کے لئے ایک بیٹا تو اگر آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں تو آپ کو اپنا ایک بیٹا دینا ہوگا۔(12)

یہ جہادی روپے کیلئے امیر کشتی مالکان کو یا قالین کے سوداگروں کو نشانہ بناتے ہیں۔ستمبر 1995ء کو بی بی سی اور رائیٹرز کے سری نگر میں نمائندے یوسف جمیل کو ایک پارسل بم بھیجا گیا۔اس کے دفتر میں ایک فوٹوگرافر جس نے یہ پارسل کھولا اس بم دھماکے میں مارا گیا۔

جون 1994ء میں JKLF نے یہ تسلیم کیا کہ جہادیوں کے کچھ حصوں کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم نے لوگوں کو بیگانگی اور لاتعلقی اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے اور تحریک میں شامل اس طرح کے غلط عناصر کے خلاف سخت اقدامات کئے جائیں گے۔(13)

مذہبی انتہا پسندوں کے بارے میں آنے والی آبروریزی کی رپورٹوں نے بھی ان کی ساکھ کو برباد کیا۔اس کے علاوہ خواتین پر اسلام میں بیان کردہ لباس کے مطابق نقاب نہ پہننے پر بھی حملے کیے جاتے تھے۔دختران ملت نامی رجعتی خواتین کا گروہ خاص طور پر خواتین کو دھمکانے میں بہت زیادہ متحرک تھا۔کئی خواتین ہسپتالوں میں زیرعلاج ہیں کیونکہ ان کے چہروں پر نقاب نہ ہونے کی وجہ سے تیزاب پھینکا گیا۔

بڑی تعداد میں حملے صرف ذاتی مقاصد کیلئے کیے گئے۔علیحدگی پسند تحریک عام شہریوں کو لوٹنے کا ایک جواز بن گئی اور تشدد اور تصادموں کے ماحول

میں اس قسم کے جرائم کا ارتکاب آسان ہو گیا۔ حتیٰ کے جہاں زبردستی حاصل کئے گئے فنڈز حفاظتی دستوں کے خلاف لڑنے کیلیئے استعمال کئے جاتے تھے وہاں بھی ان کو جبراً حاصل کرنے کے طریقے نے ان جہادیوں کو عوام میں مقبول نہیں کیا۔ بلکہ اس طرح جبراً چھینے گئے فنڈز نے عوام کو مزید بیگانگی اور لاتعلقی پر مجبور کیا کیونکہ جہادیوں کے اس سارے عمل میں تشدد، قتل اور آبروریزی جیسے اقدامات شامل ہوتے تھے۔ (14)

یہ بنیاد پرست گروہ اور تنظیمیں منشیات کے کاروبار اور بدعنوانی میں بھی ملوث تھیں جس کا مطلب پوری تحریک کو مجرمانہ بنانا تھا۔ فاروق عبداللہ کے مطابق:

ان جہادیوں، نیم فوجی دستوں اور حکومت کے کچھ حصوں کے درمیان ایک خاص تعلق تھا جس کے باعث یہ ایک ایسی مطلق طاقت اور بدعنوانی کے مزے لوٹ رہے تھے جو کسی بھی حکومت کو کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ (15)

جہادیوں اور بھارتی فوج کے مابین موجود ان سیاہ تعلقات کو 1995ء میں آئی سی جے (ICJ) کی ایک رپورٹ نے بے نقاب کیا تھا۔

اس رپورٹ میں لکھا گیا:

یہ جہادی اور سرکاری اہل کار ترقیاتی فنڈز آپس میں بانٹتے ہیں: بھارتی سیکیورٹی فورسز نہ صرف ضبط شدہ اسلحہ دوبارہ فروخت کرتی ہیں بلکہ ایک خاص قیمت پر سرحد عبور کرنے کی اجازت بھی دیتی ہیں۔ (16)

حتیٰ کہ کشمیر کے مجاہد اول، دائیں بازو کے سیاستدان اور مسلم کانفرنس کے راہنما سردار عبدالقیوم نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں کہا:

جہاد ایک کاروبار بن چکا ہے۔ کشمیر کی جدوجہد کو درحقیقت سب سے بڑا نقصان ان جہادیوں نے پہنچایا ہے .... جہاد کا کوئی مستقبل نہیں۔ (17)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی بنیاد پرستوں کی بغاوت کو پاکستانی ریاستی

ایجنسیوں کا تعاون اور حمایت حاصل تھی اور اس کے ساتھ پاکستان میں ان کی پرورش کردہ تنظیموں کی بھی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ قوم پرستوں اور بائیں بازو کا زوال بھی تھا جس نے ان اسلام پسندوں کیلئے خلا پیدا کیا۔

9/11 کا موڑ

تاہم 9/11 کے واقعات کے بعد پورے عمل میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ پاکستان کی فوجی حکومت پر دباؤ کے بڑھنے اور اسلامی بنیاد پرستوں کو ملنے والی امریکی امداد میں کمی نے ان دہشت گردی کی سرگرمیوں کو روک دیا۔ پینٹا گون اور ڈیفنس انٹیلی جنس ایجنسی کیلئے خوش قسمتی یہ تھی کہ فوج پہلے ہی سے پاکستان میں برسر اقتدار تھی۔ یوں ایک نئی فوجی بغاوت کیلئے درکار واشنگٹن کے وقت اور توانائیوں کی بچت ہوگئی۔ جنرل مشرف کے دن پھر گئے۔ بش نے وائٹ ہاؤس اور بلیئر نے ڈاؤننگ سٹریٹ نمبر 10 میں مشرف کی ضیافت کی۔ یہ کوئی نئی بات ہرگز نہ تھی: ماضی میں انہی جگہوں پر ریگن اور تھیچر نے اسامہ کے دوستوں کو خوش آمدید کہا تھا اتحادی اور دشمن بدل گئے لیکن طریقہ کار وہی پرانا تھا اور یوں بطور ادارہ پاکستانی فوج کے کردار کے تسلسل کی محض یقین دہانی مقصود تھی۔

> پاکستانی سویلین حکمران طبقہ بھی مسرت کے جذبے سے سرشار تھا۔ بلاشبہ وہ ایک ناکام ریاست کے نمائندے تو ہوسکتے ہیں لیکن کم از کم وہ اچھوت ذات سے تو تعلق نہیں رکھتے۔ ایک نئی سامراجی جنگ وہ بھی ان کی اپنی فوج کے ذریعے اور ان کا پورا ملک اس آپریشن کو جاری کرنے کی آماجگاہ کے طور پر استعمال کیا جانا تھا اس کا مطلب ہے کہ ایک بار پھر ان کی ضرورت آن پڑی تھی۔ اس کا مطلب قرضوں کی ادائیگی کے دورانیے میں تبدیلی (ری شیڈولنگ) اور دولت تھی۔ ان حکمران طبقات کا سب سے لبرل دھڑا بھی یہ خواب دیکھ رہا تھا کہ مشرف اور پینٹا گون کے مستقل

اتحاد سے ایک ایسا محور تشکیل پائے گا جو پاکستان سے ان جنونی اسلامی انتہا پسندوں کے غلبے کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دے گا۔ بے نظیر بھٹو جیسے رسوا سیاست دانوں کی جانب سے بھیجے گئے ایلچی جو امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے نااہل اور گھٹیا جونیئر افسران میں انتہائی جانی پہچانی شخصیت بن گے وہ ان کے آگے انتہائی بے چارگی کے عالم میں یہ گزارشات کرتے تھے کہ پاکستانی فوج پر بھروسہ نہ کیا جائے۔ (18)

لیکن پاکستانی ریاست اور ان بنیاد پرست گروپوں کے درمیان تعلقات کسی بھی صورت میں مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے۔ پاکستان ایک ناکام ریاست ہے چونکہ اس کا حکمران طبقہ اپنے عوام کیلئے نااہل ہے۔ سرکاری عہدے منڈی سے خریدے جا سکتے ہیں اور اپنی خرچ کی ہوئی رقوم جبر اور رشوت کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ انصاف کی سرعام نیلامی ہوتی ہے یا انتہائی بیہودہ انداز میں اس کی فراہمی کا انتظام ہوتا ہے۔ سرمایہ داری نظام صرف امیروں کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

اسلامی دہشت گردوں نے مشرف کو قتل کرنے کی دو سنجیدہ کوششیں کی ہیں۔ انتہا پسندوں کے خاتمے میں ناکامی کی زیادہ تر وجوہات فوج کی اپنی ساخت اور اس اکٹوپس (آٹھ زہریلے ڈنگوں والا سمندر جانور) آئی ایس آئی (انٹر سروسز انٹیلی جنس) کے بطن میں موجود ہیں جس کو اس نے پہلی افغان جنگ کے دوران تخلیق کیا تھا۔ آئی ایس آئی فوج کے اندر ایک فوج کی حیثیت اختیار کر چکی ہے جو صرف اپنی ہائی کمان کے آگے جوابدہ ہے اور جس کا اپنا بجٹ ہے جس کی زیادہ تر ترسیل براہ راست واشنگٹن سے ہوتی تھی۔ یہ آئی ایس آئی ہی تھی جس کی نگرانی میں طالبان نے کابل پر قبضہ کیا: یہ آئی ایس آئی ہی تھی جو ماہر دہشت گرد تاجروں کو مقبوضہ کشمیر بھیجتی تھی: اور یہ آئی ایس آئی ہی تھی جس کے اسامہ بن لادن

> اوراس کے گروہ کے ساتھ براہ راست رابطے تھے۔اور یہ کہ فوج پاکستان کے اندر سے تشدد کا خاتمہ کیوں نہیں کرسکتی اس کی وجہ یہ ہے کہ جو بھی اس راستے پر چلنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ راستہ فوج کی اپنی تنظیم کے ہیڈکواٹر کی طرف جاتا ہے۔صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ایم ایم اے کی فتح بھی آئی ایس آئی کے کچھ حصوں کی فتح تھی۔ اور اب وہ فوج کے اندر مزید تنازعات بڑھانے کے عمل کو جاری رکھ سکتے ہیں۔(19)

2003ء میں مشرف پر کیے جانے والے دو قاتلانہ حملوں کا منتظم فراج ال لبی جس کو القاعدہ کی اعلیٰ قیادت میں تیسرے نمبر پر مانا جاتا تھا حال ہی میں مردان سے گرفتار ہوا۔

> ''گرفتاری کے بعد فراج نے دعویٰ کیا کہ پاکستان کی مسلح افواج میں القاعدہ کی بھاری سرمایہ کاری موجود ہے۔''(20)

ان تحریکوں میں امریکی سامراج کی پالیسی میں تبدیلی اور ریاستی ایجنسیوں کے کشمیر کی جدوجہد کے بارے میں جذبات کے ماند پڑنے کی وجہ سے پھوٹ ناگزیر تھی۔ایک اور عنصر کشمیر میں جاری اس مسلح بغاوت کی تھکاوٹ اور کشمیری عوام میں اس کی حمایت میں گراوٹ بھی ہے۔ نجیب اللہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد عرب اور افغان جہادی جو کشمیر میں گئے وہ کشمیریوں کیلئے مکمل طور پر اجنبی رہے۔ ان کے سفاکانہ اور بربریت پر مبنی طریقہ کار نے مقامی آبادی میں خود ان کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارے۔

ان کے رویوں اور عادات نے جہاد کو مضبوط کرنے کی بجائے اس سرکشی کے اندر پھوٹ اور تصادموں کو جنم دیا۔تاہم چند منتشر گروہ ابھی تک ان کاروائیوں میں ملوث ہیں اور انہیں پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی خفیہ حمایت بھی حاصل ہے۔اس سرکشی میں اتر چڑھاؤ آئیں گے۔ جونہی امن کے امکانات دھندلے ہوں گے یہ

سرکشی ایک بار پھر زور پکڑے گی چونکہ موجودہ کیفیت کے جوں کے توں رہنے کی صورت میں کشمیر کے تنازعے کا کوئی مناسب حل ممکن نہیں اور نہ ہی ایک سماجی اور معاشی تبدیلی کے بغیر اسلامی بنیاد پرستی کا خاتمہ ممکن ہے۔ ہندشاونزم اور بھارتی ریاست میں موجود تعصب کے عناصر بھی اسلامی بنیاد پرستی میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔سوشلزم کی بجائے بورژوا سیکولرازم کی بنیاد پر ہونے والی سیاست کا انجام مذہبی تعصّبات کی مضبوطی کی صورت میں ہوتا ہے جیسا کہ لبرل سرمایہ داری کی پیدا کردہ تفریق کے ساتھ یہ بنیاد پرست انتہائی بے دردی سے کھیل رہے ہیں۔

نمائندگی کا بحران

مذہبی تنظیموں کے مسلح دستوں (ونگز) کے علاوہ مسلح جدوجہد کے پس منظر کی حامل چند دیگر سیاسی شخصیات نے بھی اب نام نہاد وسیع سیاسی عمل (Mainsteam) کے دھارے میں شمولیت اختیار کر لی ہے یا اس کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہیں۔ کچھ قوم پرستوں، سیکولر عناصر اور خاص کر مذہبی پارٹیوں نے مل کر آل پارٹیز حریت کانفرنس (APHC) کے نام سے بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ایک بڑی سیاسی حزب مخالف کی بنیاد رکھی ہے۔اس میں تقریباً 12 سے 20 پارٹیاں شامل ہیں لیکن یہ ایک ہم آہنگ اتحاد ہونے سے کوسوں دور ہے۔ جس طرح مسلح باغی گروپوں میں تنازعے اور دشمنیاں ہیں اسی طرح اس نام نہاد سیاسی حزب مخالف میں بھی دراڑیں موجود ہیں۔ اس کی قیادت دو بڑے دھڑوں میں منقسم ہے ایک دھڑا سید علی شاہ گیلانی کا ہے جبکہ دوسرے دھڑے میں مولوی فاروق اور مولوی عباس انصاری شامل ہیں جنہیں شبیر شاہ کی بھی محتاط حمایت حاصل ہے۔ موخر الذکر دھڑا نام نہاد اعتدال پسند عناصر پر مبنی ہے جبکہ گیلانی جو جماعت اسلامی کا مضبوط رکن ہے سخت گیر موقف اپنائے ہوئے ہے غالباً آئی ایس آئی کے ایک حصے کی ایماء پر۔

قیادت کے درمیان موجود انفرادی اختلافات کے علاوہ تحریک کے اغراض و مقاصد کے حوالے سے بھی بے شمار اختلافات اور ابہامات پائے جاتے ہیں جن پر اکثر اس حزب مخالف کی قیادت کے درمیان بحث وتکرار اور تلخ کلامی ہوتی رہتی ہے۔نتیجتاً وفاداریوں اور ساتھیوں کی تبدیلی معمول بن چکا ہے۔

ریاستی ایجنسیوں کی حمایت اور ایماء پر ایک کے بعد دوسرے گروپ کی تشکیل' مقاصد میں ابہام' نچلی پرتوں میں تقسیم اور پھوٹ اور مختلف گروپوں کے بارے میں پاکستان کی بدلتی ہوئی پالیسی بھی اس انتشار کو بڑھانے کا موجب ہے۔کشمیر کو''مختلف سطح کے مذاکرات میں'' ویٹو کا اختیار دینے میں سب سے بڑا مسئلہ آزادی کی جدوجہد کرنے والے ایک مربوط گروپ کی عدم موجودگی ہے جو پورے کشمیری عوام کے توسط سے بات کرسکتا ہو۔ان گنت آزادی کی جدوجہد کرنے والے گروہ ہیں جن میں سے ہر ایک کشمیریوں کے نمائندہ ہونے کا دعویدار ہے۔ان میں سے کچھ زیادہ لڑاکا ہیں اور کچھ کم۔ چند ایک کھلے عام پاکستان نوازی کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں جو بھارت کیلئے مشکوک اور کچھ بھارتی ایجنسیوں کی نگرانی کے سائے تلے زندہ ہیں۔لیکن مختلف کشمیری باغی گروپوں کی قیادتوں میں بنیادی تقسیم الحاق پاکستان کے حامیوں اور خودمختار کشمیر کے حامیوں کے درمیان ہے۔ایک وقت میں ان مخالف گروپوں کے تعلقات اس حد تک بگڑ گئے تھے کہ یہ ہندوستانی فوجوں کے خلاف کم اور ایک دوسرے سے زیادہ لڑتے تھے۔ 21 مئی 1990ء کو ایک نمایاں کشمیری راہنما میرواعظ محمد فاروق کو اس کے گھر گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

اس کے قتل کو عمومی طور پر باغیوں کی کارستانی سمجھا گیا جنہوں نے اس کے دہلی کے ساتھ تعلقات کی پاداش میں اسے قتل کر دیا تھا۔ بے شمار کشمیری قائدین کا یہی انجام ہوا۔ 1990ء کی دہائی کے اواخر میں کئی سالوں پر محیط مسلمانوں کے مختلف دھڑوں کے آپسی فسادات کے بعد پاکستانی فوج کی مالی اور عسکری امداد کے ذریعے

افغانستان پر طالبان کا تسلط قائم ہوا اور کچھ عرصہ برقرار رہا۔ پاکستان داخلی طور پر نہایت بدعنوان سیاستدانوں کی گرفت میں تھا اور ہر ماہ فرقہ وارانہ فسادات میں درجنوں لوگ جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ بھارت میں قومی سیاست پر کانگریس کی گرفت کی کمزوری نے ہندو بنیاد پرست جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) کے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ کشمیر میں مسلح اسلامی جتھوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوگیا چونکہ افغان جہاد کے غازی اپنی سربلندی کی جنگ کو جاری رکھنے کیلئے سرحد کے اس پار چلے آئے تھے۔

> بڑے مخالف گروپوں میں مقامی حزب المجاہدین اور پاکستانی حمایت یافتہ اور مسلح کردہ لشکر طیبہ اور حرکتہ المجاہدین تھے۔ یہ گروپ ایک دوسرے کے مجاہدین کو قتل کرتے تھے' مغربی سیاحوں کو اغوا کرتے تھے' کشمیری ہندوؤں کو اس خطے سے بے دخل کرتے تھے جہاں وہ صدیوں سے رہتے چلے آ رہے تھے' کشمیری مسلمانوں کو سزائیں دیتے تھے جو مضبوطی سے سیکولر روایات پر قائم تھے اور کبھی کبھار ہندوستانی فوجیوں اور سرکاری اہلکاروں پر بھی حملہ آور ہو جاتے تھے۔ آپس میں اتحاد کر کے ہندوستانی حکومت کے خلاف ایک انتقامی لڑائی لڑنے کی بجائے ہر گروپ دہلی کے ساتھ موزوں شرائط پر مصالحت کیلئے ہر وقت تیار تھا۔ (21)

اس کا یقین کرنا آسان نہیں کہ ''مختلف سطح کے مذاکرات میں'' کون سی پارٹی کشمیریوں کی نمائندگی کی صحیح مستحق ہے۔ پاکستانی تجزیہ نگار ایم-ایچ عسکری کے مطابق'

> ''خاص طور پر یہ تمام پارٹیاں پاکستانی یا بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی تربیت یافتہ ہیں۔ کوئی ایک بھی پارٹی ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کراہت انگیز تاثر موجود نہ ہو۔ (22)

بھارت روایتی طور پر شیخ محمد عبداللہ کے پوتے عمر عبداللہ کی سربراہی میں نیشنل

کانفرنس کو کشمیری عوام کی حقیقی نمائندہ پارٹی تسلیم کرتا ہے۔ پاکستان اپنے تاریخی تجربات کی روشنی میں نیشنل کانفرنس پر اعتماد نہیں کرتا۔ مزید یہ کہ نیشنل کانفرنس کو دہلی میں بی جے پی کی حکومت کے ساتھ اپنے تعلقات کے باعث پچھلے ریاستی انتخابات میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ دہلی کی طرف سے ریاست پر مسلط کردہ تمام حکومتیں کبھی بھی شفاف یا حقیقی انتخابات کی بنیاد پر سامنے نہیں آتیں اس کی وجہ سے بھی کشمیری عوام میں شدید تلخی اور نفرت پائی جاتی ہے۔ اہم (Mainstream) سیاست کے زیر تسلط اس علاقے میں کسی بھی انقلابی یا بائیں بازو کی پارٹی کی تعمیر یا تشکیل کی ممانعت ہے۔

اس سے اس بات کی درست طور پر وضاحت ہوتی ہے کہ تمام تر مخاصمتوں اور بعض اوقات مسلح تصادموں کے باوجود کشمیر کے کچلے ہوئے اور استحصال کا شکار طبقات کی حقیقی نمائندگی کو ابھرنے سے روکنے کیلئے ان میں ایک مخفی ذہنی ہم آہنگی موجود ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ طبقاتی جدوجہد کے ابھرنے سے یہ سارے کس قدر خوفزدہ ہیں چونکہ یہ جانتے ہیں کہ ایک طبقاتی جنگ ان سب کا خاتمہ کردے گی۔

قوم پرستوں کی مشکلات

جموں کشمیر لبریشن فرنٹ بظاہر تو پاکستان میں بنائی گئی تھی لیکن اب اس کی بھارتی مقبوضہ کشمیر میں بھی کافی بنیادیں موجود ہیں۔

> مئی 1994ء میں جب یاسین ملک جیل سے رہا ہوا تو اس نے مسلح جدوجہد کو ختم کرنے کے اعلان کے ساتھ مذاکرات کی تجویز پیش کی۔ ملک نے مہاتما گاندھی اور اس کے عدم تشدد کے اصول کو اپنی قوت محرکہ قرار دیا۔ اس نے یکطرفہ جنگ بندی کی تجویز بھی پیش کی۔ بہت سی پالیسیوں اور ذاتی مسائل نے یاسین ملک اور امان اللہ خان میں پھوٹ ڈال دی۔ آخرکار 1995ء کے اواخر میں امان اللہ نے یاسین ملک کو جے کے ایل

ایف کے صدر کے عہدے سے ہٹا دیا اور جواب میں یاسین ملک نے امان اللہ کو جے کے ایل ایف کے چیئرمین کے عہدے سے برطرف کر دیا۔(23)

اب بے شمار دھڑے ہیں جو جے کے ایل ایف ہونے کے دعویدار ہیں۔ 1993ء میں جے کے ایل ایف کی حزب المجاہدین پر عسکری برتری ختم ہوگئی۔عسکری زوال کے ساتھ ساتھ تنظیم کے اندر بے شمار اختلافات نے سر اٹھایا۔اس نے تنظیم کو انتہائی دائیں جانب دھکیل دیا۔گزشتہ عرصے میں کشمیری عوام کے استحصال نے قومی سوال کو مزید بھڑکایا اور بیرونی تسلط اور استحصال کے خلاف جدوجہد مزید پیچیدہ ہو گئی۔ کشمیری عوام خصوصاً نوجوان اپنی مزاحمتی جدوجہد میں جوانمردی سے ڈٹے رہے۔لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تحریک کے پاس کوئی قیادت اور پارٹی نہیں ہے جو اس انتہائی پیچیدہ اور خوفناک صورتحال سے نجات کا راستہ دکھا سکے' جس کے پاس ایک واضح مقصد' سمت اور درست حکمت عملی اور طریقہ کار ہو۔قومی جبر اور طبقاتی تضادات اپنے عروج پر ہیں اور عوام اس بھیانک صورتحال سے نکلنے کی راہ کے بیتابی سے متلاشی ہیں۔کشمیر میں جدوجہد کا ایک اہم پہلو قومی مسئلہ ہے۔

کشمیر کی مذہبی' نسلی' لسانی اور ثقافتی خصوصیات ہمیشہ بدلتی رہی ہیں۔حتیٰ کہ کشمیر کا سیاسی جغرافیہ اور ساخت بھی تبدیلی کے عمل سے گزرتی رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وادی کشمیر کی سرحدیں پھیلتی اور سکڑتی رہی ہیں' بعض اوقات وادی کسی سلطنت کا حصہ رہی اور بعض وقتوں میں اس کی اپنی خودمختار بادشاہت قائم رہی۔

عظیم الشان ریاست جموں وکشمیر کی بنیاد 1846ء میں رکھی گئی تھی جو کئی ایک ایسے علاقوں پر بھی مشتمل تھی جو مختلف وقتوں میں خودمختار علاقے یا ریاستیں بھی رہ چکی تھیں ان میں وادی کشمیر' جموں' لداخ' بلتستان' میرپور' پونچھ' مظفرآباد' گلگت' نگر' ہنزہ اور کئی چھوٹی راج دھانیاں اور پہاڑی ریاستیں بھی شامل تھیں۔ جموں وکشمیر کی

ایک مجتمع شدہ ریاست کی تشکیل کے نتیجے میں مختلف زبانوں‘ ثقافتوں اور مذہبوں کے حامل لوگوں نے باہم مل جل کر رہنا سیکھ لیا۔

یہ عظیم الشان ریاست جو ڈوگروں نے برطانوی نو آبادکاروں کی پشت پناہی سے حاصل کی تھی اس کا رقبہ 84 ہزار مربع میل تھا: جبکہ وادی اس قطہ زمین کا محض ایک تہائی ہے۔ کشمیر کا موجودہ مذہبی اور نسلی تنوع صورتحال کی پیچیدگی میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ لداخ میں آبادی کی اکثریت یا تو بدھ مذہب سے تعلق رکھتی ہے یا شیعہ ہے اور نسلی حوالے سے بھی وہ مختلف ہیں۔ جموں کے میدانوں میں رہنے والوں کی اکثریت ہندو ہے اور وہ وادی کے باسیوں سے ثقافتی حوالے سے بہت مختلف ہیں۔ اسی طرح پونچھ‘ گلگت بلتستان اور ہنزہ میں رہنے والوں کے درمیان محض نسلی اور ثقافتی پس منظر کا فرق ہی نہیں ہے بلکہ ان کے انتظامی ڈھانچے بھی بالکل مختلف ہیں۔ جموں و کشمیر کا ایک بڑا علاقہ چین کے تسلط میں بھی ہے۔

قومی جبر کے سب سے غضبناک اقدامات بھارت اور پاکستان کی ریاستوں نے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس بے ہودہ موقف اور سائنسی طور پر غلط نظریے کہ صرف مذہب کی بنیاد پر کوئی قوم تشکیل پا سکتی ہے‘ نے بھی کشمیر کو بری طرح متاثر کیا۔ پاکستان کی تخلیق اور برصغیر کا بٹوارہ بھی اسی بیہودگی پر مبنی تھا۔ کشمیریوں سے امتیازی برتاؤ روا رکھا گیا اور کشمیریوں کا نہ صرف اسلامی مملکت پاکستان نے بلکہ کشمیر کے مسلمان حکمران طبقات نے بھی استحصال کیا۔ اور دوسری جانب ہندوستان کی ریاست نے بھی سیکولر ازم‘ جمہوریت اور آزادی کے نام پر اپنے مکروہ تسلط تلے کشمیریوں کو کچلے رکھا۔

رجعتیوں کا زوال

دونوں اطراف کے بے شمار کشمیری سیاستدانوں نے برصغیر کی دونوں ریاستوں

کے گماشتوں کا کردار ادا کرتے ہوئے سامراجیوں کی پالیسیاں (نقشے) لاگو کیں۔

گزشتہ عرصے میں الحاق پاکستان کی حمایت کا بھی خاتمہ ہو چکا ہے اور اگر کوئی عام رائے شماری ہوئی تو اس بات کے بہت زیادہ امکانات نہیں ہیں کہ کشمیریوں کی اکثریت الحاق پاکستان کے حق میں ووٹ دے گی۔ اسی طرح بھارتی مقبوضہ کشمیر کی موجودہ صورتحال سے واضح ہے کہ ہندوستانی کشمیر اور اس کے تسلط کے خلاف بہت شدید غم وغصہ اور نفرت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ مذہبی پارٹیوں کے وہ حصے جو پاکستان کو قرون وسطیٰ سے پہلے کے عہد کی کوئی بنیاد پرست مذہبی (تھیوکریٹک) ریاست بنانے اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ وسط ایشیائی ریاستوں اور سنکیانگ (چین) میں بنیاد پرست ریاستیں تخلیق کرنے کیلئے کشمیر کو ابتدائی میدان جنگ (لانچنگ پیڈ) کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں افسوسناک حد تک غلطی پر ہیں۔ کشمیر کی تحریک از خود اس رجعتی منصوبے کو مسترد کرتی ہے۔ اور اب یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ پاکستانی ریاست کی حمایت و پشت پناہی اور سامراج کی ایماء کے بغیر یہ بنیاد پرست عسکری یا سیاسی طور پر اتنی مضبوط قوت نہیں بن سکتے کہ کشمیر پر غلبہ حاصل کر سکیں۔

بورژوا ذرائع ابلاغ اور دانشوروں کا یہ پروپیگنڈہ کہ بنیاد پرستوں کے جہاد نے نہ صرف افغانستان میں روسیوں کو شکست دی بلکہ یہی جہادی ''کمیونسٹ دہریت'' کی ''برائی کی سلطنت'' یو ایس ایس آر کے ٹوٹنے کا بھی سبب تھے اس قدر بھیانک جھوٹ ہے کہ گوئبلز بھی اس سے شرماتا ہوگا۔

سوویت یونین کے انہدام کی سائنسی پیشین گوئی صرف مارکسیوں نے کی تھی جس کا آغاز لینن نے 1921ء میں کیا تھا۔ 1917ء سے 1991ء تک کوئی بھی سامراجی دانشور یا عالم اس طرح کے درست نتائج کی پیشن گوئی کی جرات تک نہیں کر سکا۔ سوویت یونین سٹالنزم کی ایک ملک میں سوشلزم کی پالیسی کے اپنائے جانے کے باعث داخلی تضادات کی شدت کی وجہ سے منہدم ہوا۔ ٹراٹسکی نے اس پالیسی کے

نتائج کی شاندار وضاحت 50 سال پہلے 1936ء میں اپنی شہرہ آفاق کتاب ''انقلاب سے غداری'' میں سوویٹ یونین کے انہدام کی صورت میں کر دی تھی۔ یہ تصور بڑی تیزی سے پھیلایا گیا کہ اگر اسلامی بنیاد پرست سوویٹ یونین کو توڑ سکتے ہیں تو وہ کشمیر سے ہندوستانی تسلط کا بھی خاتمہ کر سکتے ہیں۔ یہ بے ہودہ اور انتہائی رجعتی تصور تھا۔ یہاں تک کہ افغانستان کی عوامی جمہوری پارٹی (PDP) کی حکومت بھی اندرونی غداریوں کے باعث ختم ہوئی تھی نہ کہ امریکی پشت پناہی سے لڑے جانے والے جہاد کی وجہ سے۔ سوویٹ یونین کے انہدام کے 16 سال بعد اب کشمیر میں مجاہدین نے نہ صرف پسپائی اختیار کر رکھی ہے بلکہ پس پردہ مذاکرات میں مصروف ہیں اور بھارتی ریاست کے ساتھ تعاون پر راضی ہیں۔

اطاعت

کشمیر میں ایک سیکولر قوم پرستی کی تحریک بھی چلتی رہی ہے۔ اس تحریک کی زوال پذیری کا سبب آزادی کشمیر کے واضح راستے کی فراہمی میں ناکامی تھی۔ کئی سالوں کی جدوجہد اور قربانیوں کا انت کشمیر کی آزادی کیلئے پاکستان اور بھارت کی ریاستوں کے ساتھ مذاکرات پر ہوا۔ جب یاسین ملک نے گاندھی کی راہ پر چلنے کے ارادے کا اعلان کیا تو در حقیقت وہ نظریاتی اور سیاسی اعتبار سے بھارتی حکمران طبقے کی اطاعت کی قبولیت کا اعلان کر رہا تھا۔ کشمیریوں کو پچھلے 58 سالوں میں گاندھی کے ''عدم تشدد'' (ہندوستانی بورژوا ریاست کا سرکاری نظریہ) کا کافی تجربہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے؟۔ کہ بورژوا ریاست کسی بھی انتہا تک جا سکتی ہے، ظلم و جبر کا ہر سلسلہ جاری کر سکتی ہے اور بھارتی حکمران طبقے کے تسلط اور حکمرانی کو دوام بخشنے کی خاطر ہزاروں معصوم انسانوں کے خون سے ہولی کھیل سکتی ہے جیسا کہ وہ کشمیر میں کر چکی ہے۔ یاسین ملک اب پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ بے تکلف تعلقات قائم کر

رہا ہے اور بدنام زمانہ و بدعنوان انفارمیشن کے وزیر شیخ رشید میں اپنا آئیڈیل تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

ماضی میں جدوجہد کشمیر کے قائدین حمایت حاصل کرنے کیلئے سوشلزم کا نام اور انقلابی لفاظی استعمال کیا کرتے تھے۔لیکن موجودہ صورتحال میں مسلح جدوجہد کے یہ سابقہ ہیرو آرام دہ ملبوسات میں ٹہل کر، غیر ضروری مصافحوں اور منافقانہ مسکراہٹوں کے ذریعے''باعزت شہری'' بننے کی کوشش کررہے ہیں۔وہ بورژوا ریاستوں کے ساتھ مذاکرات کرکے''عالمی برادری'' کیلئے قابل قبول سیاستدان بننا چاہتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے انہیں اس نظام کی اطاعت گزاری اختیار کرنا پڑتی ہے جس پر ان ریاستوں کی بنیاد ہے۔وہ نہ صرف مسلح جدوجہد کو ترک کرنے کا اعلان کرتے ہیں بلکہ حقیقت میں اس طریقہ کار کی ناکامی کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔لیکن اگر مسلح جدوجہد ناکامی سے دوچار ہوتی ہے تو مذاکرات کا راستہ بھی کوئی راستہ نہیں رہتا۔ یہ ایک آقا اور غلام کے مابین ہونے والے مذاکرات ہیں۔ مذاکرات کے ذریعے خودمختاری کے حصول کا نظریہ آغاز سے انجام تک غلط ہے۔ یہ حکمران طبقات کشمیریوں کو آزادی پلیٹ میں رکھ کر پیش نہیں کریں گے۔ بھارت اور پاکستان کی تقدیر ایک بھیانک مثال ہے کہ جب قیادتیں مذاکرات اور سامراجی آقاؤں کے ساتھ معاہدوں کے ذریعے آزادیاں حاصل کرتی ہیں تو عوام کو کیسی کیسی خوفناک اذیتوں اور ذلتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

1960ء اور 70 کی دہائیوں میں کشمیری قوم پرست راہنما خودمختار، سیکولر اور جمہوری کشمیر کیلئے مارکس اور لینن کے اقتباسات کے حوالے دیا کرتے تھے۔قومی سوال پر مارکسیوں کے موقف کی نہ صرف غلط تشریحات کی گئیں بلکہ اس کو اس انداز میں مسخ کیا گیا تاکہ یہ قوم پرست قائدین کے مقاصد کی تکمیل کرسکے اور ایسا صرف کشمیر میں نہیں ہوا۔

قومی سوال پر مارکسیوں کا موقف

مارکسی ہر قسم کی نابرابری اور تفریق کے خلاف لڑتے ہیں۔ ہم کسی بھی لسانی، ثقافتی یا مذہبی اکثریتی گروپ کی ہر قسم کی مراعات کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس سوال پر لینن کا موقف بھی یہی تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ لینن نے کبھی دوسری انتہا پر جاتے ہوئے کسی بھی اقلیتی قوم کے ہر مطالبے کی وکالت نہیں کی۔ ایسا کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی مخصوص بورژوا اور پیٹی بورژوا قوم پرستی کو چھوٹ دے دی جائے جس کی حاکم بننے کی اپنی شدید خواہش ہوتی ہے۔ ہم بین الاقوامی ثقافت اور بین الاقوامی مزدور جمہوریت کیلئے لڑ رہے ہیں۔

لینن اس امر سے بخوبی آگاہ تھا کہ اس کے پیچھے ہر قومیت کے استحصالی طبقات کے مفادات مخفی ہیں۔ جیسا کہ مارکس اور اینگلز نے وضاحت کی تھی کہ ہر سماج پر غالب نظریات اور خیالات حکمران طبقے کے ہوتے ہیں۔

لینن نے یوں لکھا تھا:

> ہر قومی ثقافت کے اندر بے شک خام صورت میں ہی مگر جمہوریت اور سوشلسٹ ثقافت کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ چونکہ ہر قوم کے اندر مظلوم اور استحصال زدہ عوام کے حالات زندگی ناگزیر طور پر جمہوریت اور سوشلزم کے نظریات کو بڑھوتری دیتے ہیں۔ لیکن ہر قوم کی ایک بورژوا ثقافت بھی ہوتی ہے (اور بہت سی قوموں کی تو رجعتی اور ملاؤں کی ثقافت بھی ہے) جو محض ابتدائی عناصر کے طور پر نہیں بلکہ غالب ثقافت ہوتی ہے۔ اس لئے عمومی طور پر قومی ثقافت جاگیرداروں، اشرافیہ اور بورژوازی کی ثقافت ہوتی ہے۔ (24)

وہ آگے لکھتا ہے۔

> بورژوازی کی قومی ثقافت درحقیقت (میں یہ دہراتا ہوں کہ بورژوازی

ہر جگہ پر زمین مالکان اور پادریوں کے ساتھ سودے بازی اور اتحاد کرتی ہے) ایک جھگڑالو بورژوا قوم پرستی ہے جو محنت کشوں کی تضحیک کرتی ہے اور انہیں غیر متحد کرتی ہے تاکہ بورژوازی انہیں اپنے مفادات کی قتل گاہ تک لے جاسکے اور موجودہ عہد کی بنیادی حقیقت یہی ہے۔ جو پرولتاریہ کے مقاصد کیلئے کام کرنا چاہتے ہیں انہیں تمام قومیتوں کے محنت کشوں کو متحد کرنا ہوگا اور بورژوا قوم پرستی داخلی اور خارجی دونوں کے خلاف بے رحمی سے لڑنا ہوگا۔(25)

اقلیتی گروپوں کے رجعتی مطالبات جیسا کہ الگ سکول وغیرہ کو رد کرنے میں لینن کوئی دقت محسوس نہیں کرتا تھا لینن سمجھتا تھا کہ اس طرح قومی اور نسلی تعصّبات کمزور ہونے کی بجائے مضبوط ہوں گے۔ اس مسئلے پر اس نے یہ کہا تھا:

''ثقافتی خود مختاری'' درست طور پر انتہائی خالص اور اسی لئے انتہائی مہلک قوم پرستی کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ قومی ثقافت کے نعرے کے ذریعے محنت کشوں کو بدعنوان کرنے اور بے انتہا زہریلے یعنی قومیتوں کی بنیاد پر سکولوں کی علیحدگی جیسے غیر جمہوری پروپیگنڈے کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ مختصراً یہ پرولتاری بین الاقوامیت کے بالکل متضاد ہے اور صرف پیٹی بورژوا قوم پرستوں کے تصورات سے مطابقت رکھتی ہے۔(26)

''قومی ثقافتی خود مختاری'' کے خلاف لینن نے حق خود ارادیت کا دفاع کیا۔ وہ اس بات پر زور دیتا تھا کہ تمام لوگوں کا یہ حق ہے لیکن مارکسی اس بات کے پابند نہیں ہیں کہ وہ ہر طرح کی صورتحال میں علیحدیت کا دفاع کریں۔ اس نے لکھا:

''ایک مارکسی کیلئے یقیناً تمام دیگر صورتیں ایک جیسی ہوں گی' بحر حال بڑی ریاستیں چھوٹی ریاستوں کے مقابلے میں قابل ترجیح ہوں گی۔''(27)

قومی ریاست ایک لمبا عرصہ پہلے پیداواری قوتوں کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بن گئی تھی۔ کوئی ریاست مکمل خود مختاری میں کام نہیں کرسکتی بلکہ تمام ریاستیں

عالمی منڈی کے دائرہ کار کے اندر رہ کر کام کرتی ہیں ۔یہی وہ بنیادی سبب ہے کہ سابقہ نوآبادیاں خودمختاری حاصل کرنے کے باوجود اپنے سابق نوآبادکار آقاؤں پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں۔

> پرولتاریہ ہر قوم کی قومی ترقی کو بالکل بھی خاطر میں نہیں لاتا بلکہ اس کے برعکس اس غلط فہمی کے حوالے سے عوام کو خبردار کرتا ہے اور سرمایہ دارانہ باہمی آزدانہ جڑت اور پیوستگی کی حمایت کرتے ہوئے قوموں کے ہر قسم کے آپسی ملاپ اور ادغام کو خوش آمدید کہتا ہے سوائے ان کے جن کی نبیاد جبر یا مراعات پر ہو۔(28)

طبقہ اور قوم

مارکسی تمام سرحدوں کے خاتمے کی جدوجہد کرتے ہیں ۔ہمارا حتمی مقصد اور منزل دنیا بھر کی سوشلسٹ ریاستوں کا اتحاد ہے۔تاہم ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ مارکس نے کیا کہا تھا: کہ لوگوں کیلئے اس سے بڑی بدبختی کوئی نہیں کہ وہ دوسروں کو محکوم بنائیں۔مارکسی ہمیشہ محکوم قومیتوں کا دفاع کرتے ہیں۔ہم تفریق‘ محکومی اور قومی حقوق سے محرومی کے خلاف لڑتے ہیں۔تاہم محنت کش طبقے کو تمام دوسرے مسائل کی طرح قومی مسئلے پر بھی اپنا خودمختار موقف قائم کرنا ہوگا۔لیکن اس کے طبقاتی مفادات اولین حیثیت رکھتے ہیں اور سوشلزم کیلئے جدوجہد اس کی ترجیحاتی فہرست میں سب سے پہلے آتی ہے۔نام نہاد ’’قومی اتحاد‘‘ کی خاطر محنت کش طبقے کا اپنے طبقاتی مطالبات سے دستبردار ہو جانا ہرگز اس کے مفاد میں نہیں ہے۔تاہم یہ صورتحال مختلف ہو جاتی ہے جب کسی استحصالی یا حاکم قوم کی بات کی جائے۔لینن نے بار بار اس حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے کہ روسی بالشویک ایک عظیم قوم کے رکن یعنی ایک حاکم قوم کے رکن کی حیثیت سے اپنی بورژوازی اور زارشاہی کی ان تمام ظالمانہ پالیسیوں کی بھرپور مخالفت کریں جو زارشاہی نے مظلوم قومیتوں پر جاری رکھی ہوئی ہیں۔

مظلوم اور محکوم قومیتوں کے محنت کشوں اور کسانوں کو یہ یقین دلانا ضروری تھا کہ روس کے مزدور آپ کو محکوم نہیں بنائیں گے بلکہ اس کے برعکس وہ آپ کے تمام حقوق بشمول حق خودارادیت کے دفاع کیلئے لڑیں گے۔ جیسا کہ بالشوازم پر اپنی کتاب میں ایلن وڈز نے لکھا ہے۔ روسی مزدور بے شمار اقلیتوں سے یہ کہتے تھے:

> آپ کو زنجیروں میں قید رکھنے میں ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آیئے متحد ہو کر استحصالیوں کو اکھاڑ پھنکیں اس کے بعد آپ کو آزادی ہوگی' ہمارے ساتھ تعلق کی نوعیت کا فیصلہ کرنے کی ہم آپ کو امید دلاتے ہیں کہ اگر آپ ہمارے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو آپ کے ساتھ مکمل برابری کی بنیاد پر برتاؤ کیا جائے گا۔ لیکن اگر آپ کوئی اور فیصلہ کرتے ہیں تو یہ آپ کا اپنا معاملہ ہے اور ہم آپ کے حق کے دفاع کیلئے لڑیں گے یہاں تک کہ اس کا مطلب آپ کی اپنی الگ ریاست کا قیام ہی کیوں نہ ہو۔(29)

تاہم سکے کا ایک دوسرا رخ بھی تھا۔ لینن کبھی بھی قوم پرستوں کے دباؤ میں آ کر جھکا نہیں بشمول مظلوم قومیتوں کے۔ بین الاقوامیت لینن کی روح میں رچی بسی ہوئی تھی۔

> اگر ایک یوکرائنی مارکسی خود کو عظیم روسی حاکموں کے خلاف اپنی فطری اور جائز نفرت کے اس حد تک زیراثر ہونے کی اجازت دیتا ہے کہ اس نفرت کا ایک زرہ بھی وہ منتقل کرتا ہے جو پرولتاری ثقافت اور عظیم روسی پرولتاریہ کے مقاصد سے میل نہ کھاتا ہو تو ایسا مارکسی بورژوا قوم پرستی تلے دب جائے گا۔ اسی طرح ایسا عظیم روسی مارکسی بھی نہ صرف بورژوازی بلکہ بلیک ہنڈرڈ کی رجعتی قوم پرستی تلے دب جائے گا جو ایک لمحے کیلئے بھی یوکرائنیوں کی مکمل برابری کے مطالبے یا ان کے ایک خودمختار ریاست کی تشکیل کے حق سے غافل ہوگا۔(30)

جیسا کہ ایلن وڈز نے وضاحت کی ہے:

حق خودارادیت کے نعرے کا بنیادی مقصد درست طور پر محنت کش طبقے کے اتحاد کو یقینی بنانا تھا سکے کا دوسرا رخ یہ تھا کہ مظلوم قومیتوں کے مارکسی اپنی بورژوازی کے خلاف جدوجہد کو مرکوز رکھتے ہوئے مظلوم قومیتوں کی بورژوازی اور پیٹی بورژوازی کی قوم پرستی کے زہر کے خلاف ایک بے رحم جدوجہد کریں تا کہ محنت کش طبقے کو قوم پرستی کے اثرات سے بچایا جاسکے۔(31)

لینن ازم اور قوم پرستی

لینن حق خودارادیت کا دفاع کرتا تھا لیکن لینن نے قومی بنیادوں پر محنت کش طبقے کی الگ تنظیموں کے نظریے کی کبھی حمایت نہیں کی۔ اس نے ہمیشہ پارٹی اور ٹریڈ یونین دونوں محاذوں پر محنت کش طبقے اور اس کی تنظیموں کے اتحاد کیلئے جدوجہد کی۔

قوم پرستوں کی اس بحث کہ زبان اور دوسری بنیادوں پر بے شمار بورژوا پارٹیاں ہونی چاہیں' کے بالکل الٹ محنت کش طبقے کی جمہوریت کا مطالبہ غیر مشروط اتحاد ہے اور تمام قومیتوں کے محنت کشوں کا محنت کشوں کی تنظیموں' ٹریڈ یونینوں کو آپریٹوز' سکولوں اور دیگر اداروں میں مکمل ادغام وانضمام ہے جو ہر قسم کی بورژوا قوم پرستی کے متضاد ہے۔ صرف ایسا ہی ایک اتحاد اور باہمی ادغام سرمائے کے خلاف جو پہلے ہی بین الاقوامی شکل اختیار کر چکا ہے اور دن بدن مزید آگے بڑھ رہا ہے' محنت کشوں کے مفادات کا دفاع کرسکتا ہے اور نسل انسانی کی ترقی کے عمل کو اس مقام پر پہنچا سکتا ہے جہاں زندگی کی ایک نئی طرز کا آغاز ہوگا جو مراعات اور استحصال سے ناواقف ہوگی۔(32)

حق خودارادیت کے دفاع کا مقصد تمام قومیتوں کے محنت کشوں کے اتحاد کا

تحفظ تھا چاہے وہ ظالم قوتیں ہوں یا مظلوم۔اس سے کسی بھی قسم کی قوم پرستی یا علیحدگی پسندی کی حمایت ظاہر نہیں ہوتی۔لینن اس معاملے پر بہت واضح تھا۔

> حق خودارادیت کوتسلیم کرنے کا مطلب علیحدگی کے خلاف پروپیگنڈے اوراحتجاج اور بورژوا قوم پرستی کو بے نقاب کرنے کے حق سے محرومی ہرگز نہیں ہے۔(33)

قومی آزادی اورحق خود ارادیت کے پیچھے ہمیں انتہائی رجعتی قوتیں اور مفادات ملتے ہیں۔اس سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ لینن کیلئے حق خودارادیت کا مطالبہ کیوں مطلق اورآفاقی نہیں تھا۔یہ ہمیشہ محنت کش طبقے کے عالمی مفادات کے تابع تھا۔

ہم ایلن وڈز کادوبارہ حوالہ دیتے ہیں:

> مارکسیوں پر یہ ہرگزفرض عائد نہیں ہوتا کہ وہ ہر معاملے میں حمایت کریں جیسا کہ اکثرسمجھا جاتا ہے۔مارکس نے بہت عرصہ پہلے اس رجعتی کردارکو واضح کیا تھا کہ یہ چھوٹی قومیتیں بڑے سامراجی آقاؤں کے پنجوں کا کردارادا کرتی ہیں۔وہ خاص کر(Pan slavism)پرتنقید کر رہا تھا جس نظریے کےتحت زارروس نے خودکوسلایوں کےنجات دہندے کے طور پرپیش کیااوراس پوزیشن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بلقان میں اپنے قدم جمائے۔مارکس کی پیروی کرتے ہوئے قومی سوال پرلینن کےموقف کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مستقل اور مسلسل طبقاتی سوال پرزوردیتا تھا۔اس نے بار بارقوم پرستی کے پرسرور نشے کےخطرے کے بارے میں خبردارکیا اورآزادی کےنعرے پر شدیدتنقیدلکھی جس کے پیچھے بورژوازی اپنی رجعتی سازشیں پوشیدہ رکھتی ہےاورلوگوں کودھوکہ دیتی ہے۔(34)

قومی سوال کوئی آسان اورسیدھا مسئلہ نہیں ہے۔مارکسیوں کوکب اورکس جگہ حق خودارادیت کا دفاع کرنا چاہیے یہ مکمل طور پرحالات پرانحصار کرتا ہے۔جیسا کہ

لینن نے وضاحت کی تھی:

مارکسی نظریے کیلئے کسی بھی سماجی مسئلے کی تحقیق کیلئے ضروری درجہ بندی یہ ہے کہ اس مسئلے کا اس کی تاریخی حدود کے اندر رکھ کر تجزیہ کیا جائے (مثلاً کسی بھی زیر بحث ملک کا قومی پروگرام) اس بات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ ایک ہی تاریخی عہد میں اس ملک کی کیا امتیازی خصوصیات ہیں جو اس کو دوسرے ممالک سے ممتاز کرتی ہیں۔ اور دوبارہ اس پر کسی مارکسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ کسی بھی ملک کا قومی پروگرام مرتب کرتے ہوئے ان تمام تاریخی اور ٹھوس صورت احوال کا جائزہ لینا اور انہیں مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ (35)

قومی سوال پر لینن کے موقف کی غلط تشریحات کا جائزہ لیتے ہوئے ایلن وڈز نے لکھا ہے:

اگر غور کیا جائے تو یہ بالکل واضح تھا۔ لیکن بدقسمتی سے کم علمی ایک خطرناک چیز ہوتی ہے۔ لینن کی تحریروں پر نظر دوڑاتے ہوئے ایک فقرے ''حق خودارادیت'' کو پکڑ کر بے شمار لوگ جو خود کو لینن کا پیروکار گردانتے ہیں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور پھر ادھر ادھر اچھل کود اور چیخ و پکار شروع کر دیتے ہیں کہ خود مختاری کے تمام مطالبات کی حمایت ہمیشہ ضروری ہے۔ لینن کی انتہائی محتاط وضاحتوں اور تفصیلات کو پیچیدہ کرتے ہوئے ایک ذہنی بیماری کا روپ دے دیا گیا ہے۔ جو لوگ اس بیماری میں مبتلا ہیں وہ ہر وقت کسی نہ کسی قوم پرست گروپ کے بجائے جانے والے بین کی آواز پر اچھلتے رہتے ہیں۔ جب کوئی لینن کے ان نام لیوا اور پیروکاروں کی حرکتیں دیکھتا ہے تو اسے حیرت ہوتی ہے کہ جب انہیں ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آیا تو لینن نے آخر اتنا بے پناہ مواد لکھنے کا کشٹ کیوں کاٹا۔ (36)

قومی جدوجہد اور سوشلزم

کشمیر کی جدوجہد کے معاملے میں اگر کشمیری عوام اپنا الگ ملک تشکیل کرنا چاہتے ہیں تو مارکسی حق خودارادیت کی حمایت کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم ابتدائی ابواب میں وضاحت کر چکے ہیں۔ پہلا سوال یہ ابھرتا ہے کہ اگر ہم تمام ممالک کی عالمی معیشت میں جڑت' عہد حاضر کی عالمگیریت کے کردار' آئی ایم ایف اور عالمی بینک کے کردار اور سامراج کی فوجی' سیاسی اور معاشی جارحیت کے وسیع تناظر کا جائزہ لیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایک خودمختار سرمایہ دارانہ کشمیر میں کشمیری عوام کیلئے کوئی بہتری نہیں ہے۔

دوسرا اگر کشمیر کی جدوجہد اپنے اندر اتنی مضبوط نہیں ہے کہ وہ بھارت اور پاکستان کی نیم نوآبادیاتی اور نیم سامراجی ریاستوں کو شکست دے سکے تو یہ دیوہیکل امریکی سامراج اور اس کی کشمیر کو لوٹنے اور استحصال کرنے کی ہوس کو کیسے شکست دے گی۔ تیسرا کشمیر کے حاکم باقی برصغیر کے عوام کے بھی حاکم ہیں۔ مختلف قومیتوں' نسلوں اور مذہبی گروپوں پر جبر کا ایک بے انت سلسلہ پاکستان اور بھارت دونوں میں جاری ہے۔ ان ممالک میں سرمایہ دارانہ نظام کے زوال میں اضافے کے ساتھ یہ جبر بھی تیزی سے بدترین شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ تاہم قومی جبر سے زیادہ طبقاتی جبر واضح اور نمایاں ہو رہا ہے۔ نام نہاد لبرل اور آزاد منڈی کی نجکاری' ڈاؤن سائزنگ' لبرلائزیشن اور ری سٹرکچرنگ وغیرہ جیسی پالیسیاں برصغیر کے عوام کی زندگیوں کو اذیت ناک عذاب میں مبتلا کر رہی ہیں۔ بلاشبہ 1971ء میں آزادی حاصل کرنے والا بنگلہ دیش بھی سامراجی مالیاتی اداروں کے احکامات اور پالیسیوں کا نفاذ کر رہا ہے۔ سرمایہ داری کے اندر رہتے ہوئے بنگلہ دیش کے عوام کو آزادی اور نجات کی بجائے ذلت' محرومی اور عذاب حاصل ہوا۔ 2005ء میں اس کو دنیا کا سب سے بدعنوان ترین ملک قرار دیا گیا۔

پچھلے 60 سالوں میں کشمیر کی آبادی کا ایک بڑا حصہ اس خطے کو خیر آباد کہہ گیا ہے۔ اس اخراج کی ایک وجہ کشمیر میں قومی سوال کے اثرات بھی تھے۔ یہ کشمیری نہ صرف پاکستان اور بھارت کے میٹرو پولیٹن شہروں میں آباد ہیں بلکہ ان کی ایک بڑی تعداد مشرق وسطیٰ کے مما لک میں بھی موجود ہے۔ اور بے شمار برطانیہ یورپ اور دیگر مما لک میں آباد ہیں ان کی اکثریت یقیناً کسی نہ کسی قسم کی خودمختاری کی حمایتی ہوگی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ اوران کی نئی نسلیں جو بیرون ملک ہی پیدا اور جوان ہوئی ہیں رضا کارانہ طور پر خودمختار کشمیر میں لوٹ آئیں گی۔ اس کا جواب یقیناً امکانی حد تک نہیں ہوگا اگر ایک آزاد اور خودمختار کشمیر میں بھی وہی غربت' ذلت' جہالت' بیماری اور محرومی ہے جو اس وقت تھی جب وہ یا ان کے اجداد نے اس خطے کو چھوڑا تھا۔ اور یہ بات خصوصاً ان کے حوالے سے زیادہ درست ہے جو یورپ اور شمالی امریکہ کے جدید ترقی یافتہ مما لک میں رہ رہے ہیں۔ پس طبقاتی سوال اور سماجی و معاشی ڈھانچے کی نوعیت کا مسئلہ قومی سوال کی بحث سے جدا ہرگز نہیں ہے۔ یہ درحقیقت کشمیر کی قومی آزادی کے مسئلے کا داخلی اور نامیاتی جزو ہے۔ صرف منصوبہ بند سوشلسٹ معیشت کے تحت کشمیر میں وہ معیار زندگی حاصل کیا جا سکتا جس پر وہ بھی رشک کریں جو آج انتہائی ترقی یافتہ معاشروں میں رہ رہے ہیں۔

وہ حکمران جو کشمیریوں پر ظلم و جبر کرتے ہیں وہی سرمائے کے استحصال کو قائم ودائم رکھنے کیلئے پورے برصغیر کے عوام کو بھی کچلتے ہیں۔ اس کے ذریعے وہ سامراجی لوٹ مار میں معاونت کے عوض کمیشن' حصہ اور مراعات حاصل کرتے ہیں۔ ان حکمرانوں کے خلاف عوام میں غصے اور بغاوت کا ایک سلگتا ہوا احساس موجود ہے۔ حکمران طبقات کے خلاف تمام قومیتوں کے اس غیض و غضب کو سرمایہ داری کو اکھاڑنے کیلئے ایک ہی جدوجہد میں یکجا ہونا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ حکمران عوام کو کوئی بھی آسائش دینے یا ان کے مسائل کو حل کرنے کیلئے کسی بھی قسم کی اصلاحات کرنے

میں مکمل طور پر نا اہل ہیں۔ خود مختاری تو در کنار یہ حکمران کشمیریوں یا دیگر قومیتوں پر جاری قومی جبر کا بھی خاتمہ نہیں کر سکتے۔ ہم صرف سرمایہ داری نظام کی مکمل تبدیلی کے خلاف کی جانے والی اجتماعی جدوجہد میں متحد ہو سکتے ہیں۔ یہ لڑائی صرف اور صرف طبقاتی بنیادوں پر لڑی اور جیتی جا سکتی ہے۔ قومی آزادیوں کی جدوجہد کے دریاؤں کو اس ظالم نظام اور اس کے حکمرانوں کے خلاف طبقاتی جدوجہد کے سمندر سے جڑنا اور اس کے اندر بہنا ہوگا۔ قومی سوال کی پیچیدہ فطرت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ٹراٹسکی نے اس پر مارکسیوں کے موقف کو انتہائی گہرائی کے ساتھ واضح کیا۔

> قومی خود ارادیت کا حق یقیناً ایک جمہوری اصول ہے نہ کہ سوشلسٹ لیکن ہمارے عہد میں جمہوری حقوق کا ادراک اور حمایت صرف پرولتاریہ کرتا ہے اور یہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ یہ مطالبات سوشلسٹ مقاصد سے جڑ کر تکمیل پاتے ہیں۔(37)

عہد حاضر کے جدید اور بنیادی تضادات طبقاتی ہیں۔ یہ تضادات طبقاتی جنگ کو جنم دیتے ہیں جس کو آخر تک لڑنا ہوگا۔ اس جنگ میں محنت کش طبقے اور مظلوموں کا مقدر انقلابی سوشلزم کی فتح ہوگی۔

باب نمبر 8

سوشلسٹ انقلاب --واحد راہ نجات

> بالشویکوں کی انقلابی سرکشی کو مہم جوئی قرار دینا ایک فیشن بن گیا ہے۔ ہاں یہ مہم جوئی تھی !اور ایسی شاندار جس پر نسل انسان پہلے کبھی بھی عمل پیرا نہیں ہوئی تھی۔محنت کرنے والے عوام کی سربراہی میں انہوں نے تاریخ کے دھارے کو موڑنے کے لئے اپنی چھوٹی چھوٹی مگر وسیع تر خواہشات داؤ پر لگا دی تھیں۔

جان ریڈ(1)

مفلوج سفارتکاری

پاکستان' بھارت اور کشمیر کے حکمران طبقات کشمیر کے مسئلے کو کبھی حل نہیں کر سکیں گے چونکہ وہ سیاسی' فوجی اور سفارتی سطح پر جو بھی کوششیں کرتے ہیں وہ تاریخی طور پر ایک متروک نظام کے تنگ دائروں میں مقید ہیں۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کشمیر کے مسئلے کو موجودہ معاشی' سماجی اور ریاستی ڈھانچوں کو برقرار رکھتے ہوئے حل کرنا چاہتے

ہیں اور یہی وہ ''سٹیٹس کو'' یا صورتحال ہے جو کشمیر تنازعے کی بنیادی وجہ ہے۔ عالمی سطح پر اور برصغیر میں سرمایہ دارانہ نظام جس مرحلے میں داخل ہو چکا ہے وہ انہیں مجبور کرتا ہے کہ منڈیوں کو کھولا جائے، محصولات کم کئے جائیں، باہمی تجارت اور کاروبار کو بڑھایا جائے اور منافعوں کو برقرار رکھنے کیلئے محنت کش طبقے پر وحشیانہ حملے کیے جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کی موجودہ طرز ترقی کے باعث استحصال میں اضافے سے جو بحران مشتعل ہوتا ہے وہ انہیں زیادہ سے زیادہ پھر جبر کرنے والی ریاستی مشینری پر انحصار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ عہد حاضر کے معاشی رجحانات کا تقاضا ہے کہ معیشت میں ریاست کی مداخلت اور اتھارٹی کم سے کم ہو: بحران ریاست کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان معاشی پالیسیوں کے اثرات کو زائل کرنے کیلئے مداخلت کرے۔ یہ وہ بنیادی تضاد ہے جس کا پاکستان اور بھارت کو سامنا ہے۔ درحقیقت پورا براعظم لہو میں لتھڑا ہوا ہے۔ جس طرح پاکستان اور بھارت کے حکمران باہمی تعلقات کو سدھارنا چاہتے ہیں چین کی بیوروکریسی بھی یہی کرنا چاہتی ہے۔ چین خطے میں اپنے معاشی کردار کو بڑھوتری دینے کی کوشش کر رہا ہے تو امریکی اور یورپی بھی برصغیر کے استحصال اور لوٹ مار میں اپنا حصہ بڑھانا چاہتے ہیں۔ ان معاشی رجحانات اور ریاستی کردار کے بنیادی تضاد کی وجہ سے کشمیر جیسے اہم مسئلے مزید پیچیدہ شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان نیولبرل پالیسیوں کے زیر اثر ہونے والی معاشی ترقی سماجی اور انسانی ترقی کا باعث نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس یہ مزید سماجی اور معاشی ابتری کو جنم دیتی ہے جس سے سماج میں خلفشار مزید بڑھ جاتا ہے۔ اس صورتحال سے کئی سیاسی پارٹیوں کی قیادتوں میں پراگندگی جنم لیتی ہے جس سے ان کا اعتماد کمزور سے کمزور تر ہوتا جاتا ہے۔ ہر ایک قدم جو وہ آگے کی جانب اٹھاتے ہیں انہیں دو قدم مزید پیچھے جانا پڑتا ہے اور یوں ایک کے بعد دوسرے بحران کی زد میں آ جاتی ہیں۔ جب بھی وہ کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کیلئے کسی نئے آغاز کی

بات کرتے ہیں تو وہ انہیں پرانی پوزیشنوں کو دہرانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور یوں ہر نئی سفارتی پیش قدمی کا انت پسپائی کی صورت میں ہوتا ہے۔

بس کا سفر لیکن کدھر؟

7 اپریل 2005ء کو سری نگر میں پہلی سری نگر مظفر آباد بس کی روانگی کی سرکاری تقریب کے موقع پر بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ، جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ مفتی سعید اور بھارت کے متحدہ حزب اقتدار کی سربراہ سونیا گاندھی کی موجودگی کشمیر پر بھارت کے اس موقف کہ' کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے کا پرزور اعلان تھا۔ اسی طرح مظفر آباد میں آزاد کشمیر کے وزیر اعظم سردار سکندر حیات کی صدارت میں ہونے والی اسی سلسلے کی تقریب میں جنرل پرویز مشرف اور وزیر اعظم شوکت عزیز کی صریحی غیر موجودگی کشمیر پر پاکستان کے موقف کہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے کا اتنا ہی پرزور اظہار تھا۔

> العرفین، الناصرین، فرزندان ملت اور تحفظ کشمیر تحریک نامی مجاہدین کے گروپوں نے لوگوں کو اس بس میں سفر کرنے سے باز رہنے کا انتباہ کرتے ہوئے یہ دھمکی دی تھی کہ اس بس کو مسافروں کا قبرستان بنا دیا جائے گا۔ مسافر بظاہر امان اللہ اور جے کے ایل ایف کے اس کے دھڑے کے اس طرح کے خوفناک بیانات سے بھی متاثر نہیں ہوئے جیسے یہ بس تحریک آزادی کیلئے دیر سے اثر کرنے والے زہر کی مانند ہے اور نہ ہی حزب المجاہدین اور دوسرے دھڑوں کے اس سے بھی زیادہ خوفناک بیانات سے۔(2)

دختران ملت کی رجعتی قائد آسیہ اندرابی نے بس سروس کے آغاز کو ''کشمیر کو بیچنے'' کے مترادف قرار دیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

> پاکستان کی حکومت نے ہم سے غداری کی ہے اور یہ وہی کیفیت ہے جیسا

کہ طالبان کے ساتھ ہوا تھا۔(3)

پاکستان دیگر بنیاد پرست دانشوروں کے مطابق ایک ''ترمیم پسند طاقت'' کہلاتا ہے۔

بنیاد پرست قائدین کی یہ جھنجھلاہٹ ان کے پاکستان کی بورژوا ریاست کے ساتھ تعلقات اور انحصار کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح یہ جابر ریاستیں ایسی قوم پرستی کی تحریکوں اور ان کی قیادتوں کو استعمال کرتی اور دھتکارتی ہیں جو ان نیم سامراجی ریاستوں پر اعتبار اور انحصار کرتی ہیں۔ ان تحریکوں کی قیادتیں سامراجی طاقتوں کے ''قومی مفادات'' کی تبدیلی کے مطابق اہم یا غیر اہم ہو جاتی ہیں۔ ان قیادتوں کا انت پاکستان کی خارجہ پالیسی کی ضرورتوں اور تقاضوں کے ڈسے ہوئے کے طور پر ہوتا ہے۔ ایک بار جب یہ تنظیمیں ان ریاستوں سے مراعات اور نقد رقوم لینے کی عادی ہو جاتی ہیں تو وہ کبھی بھی حقیقی آزادی کی جدوجہد کرنے کے قابل نہیں رہتیں اور پھر وہ ان کے آقاؤں کی جانب سے کھیلے جانے والے اس عظیم کھیل میں محض ان کے مہرے بن کر رہ جاتی ہیں۔

امریکی حکمرانوں نے اس وقت انگلی تک نہیں اٹھائی جب بھارتی ریاستی دہشت گردی نے ہزاروں معصوم کشمیریوں کا انتہائی سفاکی سے قتل عام کیا۔ وہ ان مظالم کے بارے میں جاننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ کشمیری عوام امریکہ کے نظریہ ''آزادی'' اور ''جمہوریت'' کی حقیقت کے بارے میں عراق' افغانستان اور ویتنام (یہاں محض چند کا ذکر ہے) کے لوگوں سے سیکھ سکتے ہیں۔ کشمیر کے مسئلے کے حل اور برصغیر میں امن کے حوالے سے امریکہ کی حالیہ اچانک تشویش اور دلچسپی درحقیقت اس خطے سے اور زیادہ منافعوں کے حصول کی ہوس کی عکاسی کرتی ہے۔

مظفر آباد اور سری نگر کے درمیان بس سروس کا آغاز حکمرانوں کی اس خواہش کہ کشمیری عوام کی جدوجہد کو خیرسگالی کے جذبات کے اظہار کا ڈھونگ رچا کر ٹھنڈا کیا

جائے کو شاید شرمندہ تعبیر نہ کر سکے لیکن بس سروس کے ظاہری نقاب کے پس پردہ تجارتی راستے اور پاکستان اور بھارت کی بورژوازی کے کچھ پرجوش حصوں اور عالمی اجارہ داریوں کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کی آمدورفت کیلئے راستے کھولنا مقصور تھا۔ یہ سارا عمل پلٹ سکتا ہے جیسا کہ ماضی میں ہوتا آیا ہے۔

13 دسمبر 2001ء کو بھارتی پارلیمنٹ کی عمارت پر حملے' جس کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہرایا گیا تھا' کے بعد جب دونوں ممالک کے درمیان تناؤ بہت بڑھ گیا تھا تو پاکستان اور بھارت کے درمیان فضائی اور ریلوے سروس' بشمول لاہور دہلی بس سروس کے' مکمل طور پر بند ہوگئی تھی۔

متضاد طور پر مظفر آباد سے سری نگر تک بس سروس جیسی معمولی ترین سہولت کشمیریوں کی طرف سے مزید بڑی سہولیات کے مطالبے کی وجہ بنے گی۔ وہ منقسم خاندانوں اور دوستوں کے ملاپ کے زیادہ مواقعوں کا تقاضا کریں گے۔ وہ لائن آف کنٹرول سے دیگر کئی مقامات سے راستے کھولنے کا مطالبہ کریں گے تاکہ بھارتی مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے مہاجرین کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام ہو سکے جن کے عزیز واقارب اس تقسیم کرنے والی لکیر کے دوسری طرف بستے ہیں اور جو زیادہ تر پونچھ' راجوری' بارہ مولہ' کڑاہا اور اوڑی سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔ اس سہولت کی جعلی اور دکھاوے پر مبنی فطرت اس حقیقت سے عیاں ہوتی ہے کہ آزاد کشمیر سے 1500 امیدواروں نے اس بس پر سفر کیلئے درکار تمام لوازمات پورے کئے ہیں۔ اور اس بس کو ہر 15 دنوں کے بعد صرف 30 مسافروں کو لے جاتے ہوئے ان لوگوں کو یہ سہولت بہم پہنچانے کیلئے سالوں درکار ہیں۔ دوسرا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ صرف وہ اشخاص اس سفر کے لوازمات پورے کر سکتے ہیں جن کا انتظامیہ پر اچھا خاصا اثر ورسوخ ہے یا پھر دولت منداور بااثر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بس سروس کے آغاز کے ساتھ ہی بسوں کی تعداد اور آنے جانے کے مقامات میں اضافے کا دباؤ

بڑھے گا۔ کشمیر کے استحصال زدہ عوام کا بڑے پیمانے پر ملاپ انہیں اپنی تکلیفوں اور دکھوں کو بانٹنے کا موقع دے گا۔ وہ اپنی محرومیوں کی وجوہات اور مماثلتیں اور ان کے خاتمے کیلئے متحدہ جدوجہد کے راستے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس سے حکمرانوں کیلئے مشکلات پیدا ہوں گی اور ان کے دہلی اور اسلام آباد کے ایوان خوف سے لرز جائیں گے۔

ہندوستانی حکمران طبقہ اس سفارتی صلح جوئی کے سلسلے کو ہندوستانی مقبوضہ کشمیر میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے اور درحقیقت تمام محاذوں پر پاکستان کی پوزیشن کو کمزور کرنے کیلئے استعمال کر رہا ہے۔

مظلوموں کی آواز؟

ایک اور تصور کچھ تاخیر سے ذرائع ابلاغ میں سامنے آیا اور برصغیر کے حکمرانوں کی تقریروں میں بھی اس کے خدوخال پائے جاتے ہیں کہ پرانے موقف ترک کر کے نئے اور جرات مندانہ آغاز اور اقدامات ضروری ہیں یہ ایک اور بہت بڑی جعل سازی ہے۔ان کے نئے موقف بھی حکمران طبقات کے مفادات کے تابع ہوں گے۔ ان کے ''نئے'' اور ''جرات مندانہ'' آغاز بھی سٹیٹس کو برقرار رکھنے تک محدود ہوں گے اور اس لئے مسئلے کو حل نہیں کر سکیں گے۔ اس تنازعے کے تین فریقین (انڈیا' پاکستان اور کشمیر) کے بارے میں ہونے والی تمام گفتگو بھی دھوکہ دہی ہے۔ یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا پاکستان اور ہندوستان کے حکمران اپنے عوام کے نمائندہ اور ان کی خواہشات کے حقیقی ترجمان ہیں؟ اس کے ساتھ ساتھ کوئی بھی تنظیم کشمیری عوام کی اکثریت کی امنگوں کی حقیقی ترجمان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ پاکستان اور ہندوستان کے موجودہ حکمران ان ممالک کے مزدوروں اور کسانوں کی اکثریت کے حقیقی نمائندے ہرگز نہیں ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں جمہوریت مالیاتی سرمائے

کی وحشیانہ جکڑ بندی کے تابع ہے۔ پورے ڈھانچے کو اس طرز سے تشکیل دیا گیا ہے کہ کوئی بھی ایسی پارٹی، تنظیم یا فرد اس ڈھانچے سے روگردانی کر کے اقتدار نہ حاصل کر سکے جو سرمایہ داری کے مفادات کیلئے خطرہ ہو۔ لینن نے نہایت وضاحت کے ساتھ بورژوا جمہوریت کی فطرت اور کردار کو ''بھگوڑا کاؤتسکی اور پرولتاری انقلاب'' میں بیان کیا ہے؛

> اگر ہم عمومی تصورات اور تاریخ کا مذاق نہیں اڑا رہے تو ظاہر ہے کہ جب تک مختلف طبقات موجود ہیں ہم ''حقیقی جمہوریت'' کی بات نہیں کر سکتے بلکہ ہم صرف طبقاتی جمہوریت کی بات کر سکتے ہیں۔ ''حقیقی جمہوریت'' کسی لبرل کا جھوٹا فقرہ ہو سکتا ہے جو محنت کشوں کو بے وقوف بنانا چاہتا ہے۔ تاریخ بورژوا جمہوریت سے واقف ہے جس نے جاگیرداری کی جگہ لی تھی اور پرولتاری جمہوریت سے جو بورژوا جمہوریت کی جگہ لیتی ہے۔ بورژوا جمہوریت اگرچہ قرون وسطیٰ کی طرز معاشرت کے مقابلے میں تاریخی طور پر بہت آگے کا قدم تھا لیکن یہ جمہوریت ہمیشہ انتہائی تنگ، محدود، جھوٹی اور منافقانہ ہی رہتی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کے اندر اس کا یہی مقدر ہے کہ یہ امیروں کیلئے ایک جنت جبکہ استحصال زدہ اور غریبوں کیلئے فریب پر مبنی ایک پھندا ہوتی ہے۔ (4)

دوسری طرف وہ تمام نئے آغاز اور جو اقدامات کیے جائیں گے وہ کبھی بھی ان سلگتے ہوئے طبقاتی مسائل کی عکاسی نہیں کریں گے جن کا کشمیر کی مظلوم عوام سمیت برصغیر کے عوام کو سامنا ہے۔ بھارت اور پاکستان کی پالیسیاں عوام کی غربت، ذلت اور محرومی میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔ کشمیری عوام کے حقیقی مسائل کو حل کئے بغیر اس تنازعے کا کوئی بھی پائیدار حل تلاش کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

تیسرا یہ کہ حکمران طبقات ان آغازوں پر متفق نہیں ہو سکتے چونکہ یہ آغاز برصغیر کے حکمران طبقات کے مختلف دھڑوں کیلئے قابل قبول نہیں ہیں۔ حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ یہ

کوئی ایسا منصوبہ یا قرارداد مرتب کرنے کے اہل نہیں ہیں جس پر حکمران طبقے کے تمام حصوں کو اتفاق ہو۔ اس نظام کے بحران نے حکمران طبقے کے مختلف دھڑوں کے مفادات کے درمیان تضادات کو شدید کر دیا ہے۔ ان تضادات کی شدت اتنی زیادہ ہے کہ یہ کوئی مستقل معاہدہ بھی نہیں کر سکتے۔

ان کیلئے سب سے کم اہمیت کی حامل جو چیز ہے وہ کشمیر اور پورے برصغیر کے دیگر مظلوم عوام ہیں۔ آخری تجزیے میں ''قومی مفادات'' غالب طبقات یعنی جاگیردار اشرافیہ اور بورژوازی کے مفادات ہوتے ہیں۔ مظلوم طبقات کی آواز تب سنی جائے گی اور ان کے مفادات کے تحفظ کی ضمانت بھی ایک ایسے سماج میں ممکن ہے جس کی حکومت مالیاتی سرمائے کے احکامات کی غلام نہیں ہوگی۔ اور ایسا صرف ان سماجوں اور ریاستوں میں ممکن ہوگا جہاں انسانوں کی محنتوں سے پیدا کردہ سرمایہ جبراً منافع کی صورت میں نہیں لوٹا جائے گا بلکہ انسانی ضروریات کی تسکین و تکمیل کیلئے خرچ کیا جائے گا۔ اور حقیقی جمہوریت جہاں اکثریت کی آواز سنی جائے اور ان کی حقیقی نمائندگی ممکن ہو ایسی ہی معاشی بنیادوں پر فروغ پا سکتی ہے۔

کشمیر کی تقسیم

ایک تجویز یہ بھی ہے کہ کشمیر کو لائن آف کنٹرول کے مطابق یا دریائے چناب کے آر پار تقسیم کر دیا جائے۔ بھارتی حکمرانوں نے کبھی بھی سرکاری طور پر لائن آف کنٹرول کو تسلیم کرنے کی پیش کش نہیں کی کیونکہ اس کا مطلب بھارتی آئین کی خلاف ورزی ہوگی۔ تاہم نئی دہلی نے بھی پاکستان ہی کی طرح جب بھی ریاستی سطح کی سنجیدہ سفارتکاری میں اس تجویز کو پیش کیا گیا مکمل طور پر رد بھی نہیں کیا۔ اس قسم کی تجاویز زیادہ تر محض ذرائع ابلاغ کی رونق ہی بنی رہتی ہیں جن کو بھارتی حکومت کی شہ اور حوصلہ افزائی پر ہندوستانی اخبارات اچھالتے رہتے ہیں۔ حالیہ تقسیم کا منصوبہ شاید اس

تنازعے کے کسی حادثاتی اور اچانک حل کیلئے عوام کو تیار کرنے کے لئے اچھالا گیا اور دوسری جانب اس تنازعے کے تمام فریقین کو یہ اشارہ دینا بھی مقصود تھا کہ اگر موجودہ لائن آف کنٹرول کے مطابق کشمیر کی تقسیم پاکستان کیلئے قابل قبول ہو تو۔ بھارت لچک کا مظاہرہ کرنے کو تیار رہے۔

درحقیقت ہندوستان کیلئے لائن آف کنٹرول کو مستقل سرحد بنانے کیلئے اپنے آئین میں ترامیم وتبدیلی کرنا پاکستان کی اقوام متحدہ کی قراردادوں میں درج موقف کو بدلنے سے زیادہ مشکل ہوگا۔ چونکہ ان قراردادوں کی پاکستان میں کوئی آئینی حیثیت نہیں ہے اور اگر بھارت کوئی سودے بازی کرتا ہے تو مشرف کو اس معاملے پر کسی پارلیمانی منظوری کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اسی لئے مشرف نے ماہ رمضان 2004ء کی ایک خوشگوار شام کو عالم مدہوشی میں کئے جانے والے ایک خطاب میں کشمیر کی تقسیم کے سات منصوبے پیش کئے تھے۔ بعد میں جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ منصوبے محض ''داخلی بحث ومباحثے'' کیلئے پیش کئے گئے تھے۔ یہ ''تاریخی لمحہ'' آنے سے پہلے ہی گزر گیا تھا۔ چونکہ مشرف کشمیر کی اصل ریاست کو تقسیم کرنے پر بضد تھا اس لئے اس کے اس پیغام کو نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا کہ: وسیع تر لوگوں کو ذہنی طور پر پوری ریاست کے بارے میں اپنے اپنے طویل مدت موقف بدلنے یا چھوڑنے کیلئے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے۔ اکانومسٹ جریدے نے اس پر یہ تبصرہ شائع کیا:

> جنرل مشرف گزشتہ ماہ اس تنازعے کے ممکنہ حل کے بارے میں باآواز بلند (لاؤڈ سپیکر میں) اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے خیالات قابل تردید حد تک مبہم تھے لیکن 1950ء میں پہلی بار ایک آسٹریلوی جج اوون ڈکسن کی جانب سے پیش کردہ منصوبے کی طرف اشارہ کرتے دکھائی دیتے تھے۔ پاکستان کے اقوام متحدہ کی نگرانی میں کشمیر کے مستقبل کے فیصلے

کیلئے رائے شماری کے مطالبے سے دستبرداری جو پاکستان کی جانب سے بہت بڑی رعایت ہے کے باوجود یہ منصوبہ بھارت کیلئے ہمیشہ سے نا قابل قبول ہے۔(5)

مشرف نے یہ ''جرات مندانہ اقدام'' غالباً سخت شراب (وسکی) کے زیر اثر کیے ہیں۔تاہم بعد میں اس کی پسپائی پاکستانی ریاست کی کمزور اور نحیف فطرت کو ظاہر کرتی ہے۔اس طرح کے اقدمات اور حرکات حادثاتی نہیں ہیں۔ پاکستان میں جنگ کے تصور کو کوئی بھی سنجیدہ نہیں لیتا خاص کر کارگل میں کی جانے والی حماقت کے بعد جس سے اعلیٰ قیادت (ہائی کمان) میں فوجی مہم جوئی کے جذبات بہت حد تک ماند پڑ گئے ہیں۔اور 9/11 کے واقعات کے بعد جنگ کوئی سنجیدہ راستہ نہیں ہے جب امریکی سامراج کی ترجیحات کے مطابق فوج نے مشرق میں بھارتی سرحد سے مغرب میں افغانستان کی سرحد پر اپنی زیادہ تر توجہ مرکوز کی۔

ہمیں مسلح افواج کے اندر ہونے والے ''ثقافتی انقلاب'' کو بھی نہیں بھولنا چاہیے۔ پلاٹوں کی قیمتیں اور ریٹائرمنٹ کی زندگی کی آسائشوں کے محدود امکانات کارل وان کلازوٹز کے نظریات کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور مطالعے کیلئے توجہ طلب شعبے ہیں۔مختصراً اس طرز کے دماغوں میں جنگ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اگر ریاست پاکستان کے مختلف حصے اس ''نئی خیال آفرینی'' کو قبول نہیں کرتے تو یہ مکمل طور پر رد ہو جاتی اور اس کی وجہ سے کشمیریوں کے جذبات برانگیختہ ہو جاتے جو کئی نسلوں سے کشمیر کی آزادی کیلئے جدوجہد کرتے چلے آرہے ہیں۔اسلامی بنیاد پرست اس صورتحال کو اپنے محدود اور رجعتی مقاصد کیلئے استعمال کرتے جوان کشمیری عوام جو ایک ترقی پسند جدوجہد میں برسرپیکار ہیں' کی خواہشوں سے یکسر مختلف ہیں۔ اگر کشمیر کی تقسیم نا قابل قبول تھی تو کشمیریوں کی اکثریت پاکستان کے الحاق کو بھی مسترد

کر دے گی۔ اسی طرح اگر بھارت اپنے زیر تسلط کشمیر کے ایک حصے کو کنٹرول نہیں کر سکتا تو پورے کشمیر جسے یہ ''بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دیتا ہے'' کو کنٹرول کرنا اس کیلئے بالکل بھی ممکن نہیں ہوگا۔ اسی طرح کشمیر کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کر دینا بورژوا نکتہ نظر سے بھی کوئی سنجیدہ حل نہیں ہے۔ کشمیر کیلئے ایک اور نسخہ یہ تجویز کیا گیا کہ اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ کشمیر کے ہندو اکثریت والے علاقوں کو بھارت کا اور آزاد کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنا دیا جائے اور وادی جس کی اکثریت مسلمان ہے کو اقوام متحدہ کی زیر نگرانی خود مختاری دے دی جائے۔

اگر پاکستان اقوام متحدہ کی شرائط پر کشمیر کی بندر بانٹ کو تسلیم کرتا ہے تو پاکستان کو اپنا روائیتی موقف مسترد کرنا پڑے گا۔ اور پھر وہ دن بھی دور نہیں ہوگا جب خود مختار وادی کے عوام کشمیر کے دوسرے حصوں میں موجود اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ متحد ہونے کا مطالبہ کریں گے۔

کشمیر کی تین حصوں میں تقسیم ہندو بنیاد پرستوں کا بھی مطالبہ ہے۔ ٹائمز آف انڈیا نے 4 ستمبر 2000ء کو لکھا:

> راشٹریا سوایم سیوک سنگ RSS جموں و کشمیر کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کے حق میں تھی کہ جموں کی الگ ریاست اور لداخ کو ملحقہ قرار دیئے جانے سے بہت سارے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ ان دونوں علاقوں پر آئین کی دفعہ 370 کا اطلاق نہیں ہوتا صرف وادی کو ایک خاص حیثیت دینے کی ضرورت ہے۔ (6)

18 مارچ 2000ء کو RSS کی جنرل باڈی نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی جس میں کشمیر کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کے مطالبے کی حمایت کی گئی تھی۔ یہ RSS کے سیاسی ونگ اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے بانی ''جان سنگ'' کے موقف کا اعادہ ہے جو اس نے 1951ء میں پیش کیا تھا۔ ایک اور تجویز ''ماہرین'' کی طرف

سے پیش کی جاتی ہے وہ چناب فارمولا ہے۔ اس کی بنیاد کشمیر کو دریائے چناب کے آر پار تقسیم کرنے پر ہے۔ اس تجویز کے پس منظر میں کشمیر کو مذہبی اور نسلی بنیادوں پر تقسیم کرنے کی سوچ کارفرما ہے۔ دریائے چناب کسی حد تک اپنی جغرافیائی کیفیت میں ہندو اور مسلم علاقوں کو تقسیم کرتا ہے اس فارمولے کا مطلب درحقیقت برصغیر کی تقسیم کے زخموں کو ایک بار پھر تازہ کرنا ہوگا۔ آج کے عہد میں برصغیر کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے والوں کے پیروکار اس فارمولے کے سب سے بڑے حمایتی ہیں۔ یہ ایک رجعتی موقف ہے اور اس کی وکالت کرنے والوں نے بٹوارے اور اس کے بعد کے تجربات سے کچھ نہیں سیکھا۔ کشمیر کی تحریک اتنا آگے جا چکی ہے کہ یہ تصور آغاز سے پہلے ہی ختم ہو گیا اور اسے معمولی سی پذیرائی بھی نہ مل سکی۔ تاہم حکمران طبقات تنازعہ کشمیر کو حل کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں اس لئے وقتاً فوقتاً اس قسم کے غیر سنجیدہ حل سامنے آتے رہتے ہیں۔ ہری سنگھ کے بیٹے کرن سنگھ کے خیالات اس حوالے سے کسی انکشافات سے کم نہیں ہیں۔ 26 فروری 1981ء کو بی کے نہرنے جموں و کشمیر کے گورنر کی حیثیت سے حلف اٹھانے کے فوری بعد لکھا:

> ٹائیگر (کرن سنگھ) نے میرے سامنے ایک ہی وضاحت کی تھی جس میں اس نے ریاست جموں و کشمیر کے حوالے سے انتہائی درست تناظر سے مجھے آگاہ کیا۔ اس نے واضح کیا کہ ریاست کلی طور پر ایک مصنوعی تخلیق تھی اس کے پانچ الگ الگ علاقے حادثاتی طور پر اس وقت متحد ہو گئے جب مہاراجہ گلاب سنگھ نے ان سبھی علاقوں کو فتح کر لیا جن کا برصغیر کے بٹوارے کے وقت اس کا باپ مہاراجہ ہری سنگھ حکمران تھا۔ ان پانچ مختلف علاقوں کا آپس میں کچھ بھی مشترک نہیں تھا۔ گلگت' بلتستان اور سکردو کے پہاڑی علاقے اور مظفر آباد کے پنجابی بولنے والے علاقے وغیرہ پہلے ہی پاکستان کے ہاتھوں میں تھے۔ ریاست کے ہمارے حصے میں بھی تین واضح تقسیمیں موجود تھیں: جموں ہندوؤں کا علاقہ تھا' کشمیر سنی

مسلمانوں کا اور لداخ کے ایک حصے میں بدھ اور دوسرے میں شیعہ مسلمان آباد تھے۔ ان تینوں علاقوں میں کوئی بھی قدر مشرک نہ ہونے کی وجہ سے جتنا جلدی یہ تینوں علاقے الگ ہو جائیں مستقبل کیلئے اتنا ہی بہتر ہو گا۔ کشمیر کے بارے میں میری اپنی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں، سوائے اس کے جو مجھے اس وقت حاصل کرنا پڑی تھیں جب میں واشنگٹن میں سفیر تھا۔ (7)

کشمیر کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کا تصور آغاز سے انجام تک ایک رجعتی منصوبہ ہے۔ کشمیر انتہائی حساس مسئلہ ہے اور اس کو حل کرنے کی ایسی کوئی بھی کوشش بے حد خطرناک ہو سکتی ہے۔ سامراج نے اس مسئلے کو ''بٹوارے کے غیر تکمیل شدہ ایجنڈے'' کے طور پر باقی چھوڑا تھا۔ مقامی حکمران طبقے نے پچھلے 58 سالوں میں داخلی مفادات کیلئے کشمیر کے ساتھ کھلواڑ اور بلادکار کیا ہے کشمیر کو حصوں بخروں میں تقسیم کر دینا کوئی پائیدار حل نہیں ہے بلکہ اس سے صورتحال مزید ابتر ہو جائے گی۔ اس طرح یہ مسئلہ حل ہونے کی بجائے پورے خطے میں مزید خون خرابے اور تصادموں کو جنم دے گا۔ یوگوسلاویہ میں خوفناک بربادی کے مناظر ہمیں یہ یاد دلاتے کہ اس طرز کی تقسیم کہیں بڑی تباہی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ وہ لوگ جو کشمیر کی جدوجہد آزادی میں شامل رہے ہیں وہ اس طرح کی کسی بھی تقسیم کو ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ کشمیر کو انسانی اتحاد اور یکجہتی کے بلند ترین معیاروں کی جانب آگے بڑھنا ہو گا۔ وقت کبھی بھی پیچھے نہیں جا سکتا۔ بورژوازی کی دوسری سازشوں کی مانند اس کا نتیجہ بھی تباہی اور بربادی ہی کی صورت میں برآمد ہو گا۔

خود مختار کشمیر اور سامراجی غلبہ

کشمیریوں کی اکثریت کیلئے اگر اس مسئلے کا کوئی مقبول عام حل ہے تو وہ اقتدار اعلیٰ کی حامل کشمیر کی ایک مکمل خود مختار ریاست کی تشکیل ہے۔ اس حل کے ساتھ کشمیری

عوام کی ایک جذباتی اور گہری حب الوطنی پر مبنی وابستگی ہے اور یہ وابستگی، پاکستان اور بھارت اور دیگر دور دراز ممالک میں رہنے والے کشمیریوں میں زیادہ شدت سے پائی جاتی ہے۔ اگرچہ کشمیریوں کے حق خودارادیت کو تسلیم کیا جانا ضروری ہے لیکن کشمیر کی آزادی کی ٹھوس سماجی اور معاشی بنیادوں کو واضح کرنا نہایت اہم ہے۔

تاہم اس جدوجہد کی حکمت عملی سائنسی انداز میں تشکیل دی جانی چاہیے۔ عالمگیر سرمایہ داری کے عہد میں ہمارے لئے خودمختاری کی صحیح سمجھ بوجھ اور کشمیری عوام کیلئے اس کے مفہوم سے مکمل طور پر آشنا ہونا ضروری ہے۔ موجودہ عہد کی خاصیت سامراجی مالیاتی سرمائے اور اجارہ داریوں کا کچل دینے والا غلبہ ہے۔ دنیا کی 100 بڑی معیشتوں میں سے 51 معیشتیں کارپوریشنوں (کمپنیوں) جبکہ 49 ممالک پر مبنی ہیں۔ عالمی منڈی کے عالمگیر سرمایہ داری نظام سے الگ تھلگ کسی بھی ملک کی بقاء ممکن نہیں ہے۔ عالمی سیاسی قیادتیں جن کی بنیادیں سرمایہ دارانہ معیشتوں پر ہیں غلامانہ انداز میں مالیاتی اداروں کے احکامات کی تکمیل کرتی ہیں یا پھر برباد کردی جاتی ہیں۔ عالمی بینک اور آئی ایم ایف دونوں کے مراکز واشنگٹن میں ہیں۔ ایک جانب وہ عالمی سطح پر ڈالر کے تسلط اور غلبے کو یقینی بناتے ہیں تو دوسری جانب تمام حکومتوں کی معاشی پالیسیوں کی ایسی طرز پر تشکیل کو بھی یقینی بناتے ہیں جن سے سامراجی اجارہ داریوں کے منافعوں میں مسلسل بڑھوتری ہوتی رہے۔

اس سے ایک ایسی کیفیت کا جنم ہوا ہے جس میں تمام ممالک کی داخلی پالیسیاں بھی ان سامراجی اداروں کے تابع ہیں۔

کیتھرین کین فیلڈ اپنی کتاب واہموں کے آقا (Masters of illusions) میں لکھتی ہے کہ کس طرح عالمی بینک نئے قطعات اراضی کیلئے جنگلوں کی بے تحاشا کٹائی، آبی زمینوں کو صحرا بنانے، سہارتو اور مبوتو کے ذریعے لوٹ مار، نیپال سے جنگلات کا صفایا

کرنے' ایمازون کو بے آب وہ گیاہ کرنے اور انڈونیشیا میں لاکھوں انسانوں کے قتل عام کا ذمہ دار ہے۔ عالمی بینک اور دوسرے سامراجی اداروں کی یہی تاریخ ہے۔(8)

ہک گٹمین اس معاشی نظام کی استحصالی فطرت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

غریب ممالک جنہیں غیر ملکی کرنسی کی ضرورت ہوتی ہے کو ملنے والا ہر ایک ڈالر ان ملکوں کیلئے بے شمار نئے مسائل بھی ساتھ میں لاتا ہے' مثلاً شہروں کا تیزی سے اور بے ہنگم پھیلاؤ' محنت میں شدت' شہری غربت میں اضافہ اور دولت کی نابرابری میں نیا ڈرامائی اضافہ ..... بڑے اور مشہور مصنوعات سازوں کی طرف سے انتہائی مہنگی اور ہوشربا اشتہار بازی' جو شاید اس جنس کی تیاری میں خام مال اور سپلائی وغیرہ سمیت پوری تیاری پر آنے والی لاگت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے... ڈومینی کن ریپبلک میں ایک محنت کش جو Nike کمپنی کی ایک اعلیٰ قمیض تیار کرتا ہے وہ صرف (0.8ڈالر) آٹھ سینٹ کماتا ہے جبکہ یہی قمیض امریکی منڈی میں 22.9ڈالر کی قیمت میں بکتی ہے۔(9)

چولستان کے صحرا کے دور دراز علاقوں میں کاشت ہونے والی کپاس کی بھی حتمی قیمت وال سٹریٹ نیو یارک میں طے ہوتی ہے۔ اسی طرح کشمیر میں تیار ہونے والی شالوں' دستکاری اور لکڑی کی مصنوعات کی قیمت بھی دور دراز کے ساحلوں پہ طے ہوتی ہے۔

کسی بھی ملک کا کرنٹ اکاؤنٹ بیلنس جتنا منفی ہوتا ہے اس کے پاس دوسرے ممالک سے تجارت کیلئے رقم اتنی ہی کم رہ جاتی ہے۔ جتنا کسی ملک کے پاس داخلی سرمایہ کاری کیلئے سرمایہ کم ہوگا وہ آئی ایم ایف کے قومی بجٹ میں کٹوتی کے دباؤ کے سامنے اتنا ہی کمزور اور بے یارومددگار ہوگا۔

بیرونی زرمبادلہ کی فراہمی کے بغیر تمام ترقی نحیف ہوجائے گی۔ زرمبادلہ کے ذخائر کی عدم دستیابی کی صورت میں آئی ایم ایف سماجی بہتری کے پروگراموں میں بڑی کٹوتیوں کا مطالبہ موجودہ قرضوں کو جاری کرنے اور نئے قرضوں کی منظوری کی لازمی شرائط کے طور پر کرے گا اس طرح کی سودے بازی کے بغیر غریب اقوام کا زندہ رہنا ہی محال ہو جائے گا۔(10)

سرمایہ دارانہ استحصال کے تخلیق کردہ اس گھناؤنے گھن چکر اور سامراجی جکڑ میں ایک خودمختار کشمیر نہ صرف ایک مستقل بحران کا شکار رہے گا بلکہ کشمیر کے مظلوم عوام بھی مسلسل معاشی بدحالی اور انتشار میں دھنس کر رہ جائیں گے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت کشمیر معاشی حوالے سے اپنے انتہائی پر پیچ اور دشوار گزار علاقے میں ایسا انفراسٹرکچر تعمیر کرنے کی صلاحیت سے محروم رہے گا جو اس کی مختلف النوع آبادی کے باہمی اتحاد کے قیام کیلئے ضروری ہے۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے آئین میں 8 تسلیم شدہ زبانیں ہیں۔ ان میں گلگت بلتستان اور پاکستان کے زیر تسلط دیگر علاقے شامل نہیں ہیں۔ وادی کشمیر، جموں اور لداخ تین مختلف ریاستوں، چین، بھارت اور پاکستان کے زیر تسلط ہیں۔ لداخ کی آبادی دو لاکھ ہے جس کا زیادہ تر حصہ لیح کے علاقے میں مقیم ہے جو باقی برصغیر سے الگ تھلگ اور کٹا ہوا ہے۔ یہاں تک پہنچنے کا واحد راستہ زوجیلہ درہ ہے۔ جو سطح سمندر سے تقریباً 3450 میٹر بلند ہے۔ لیح کی آبادی کی اکثریت تبتیوں اور منگولوں کی نسل ہے۔ جبکہ جموں کی آبادی کی اکثریت آرین نسل سے اور وادی کے باشندوں کی اکثریت غیر آرین ہے۔ اتنے مختلف النوع اور انتہائی سنگلاخ اور دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں بکھرے ہوئے ان لوگوں کو باہم متحد کرنا حقیقی معنوں میں جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

اس اتحاد کو حاصل کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ ان غربت اور

محرومیوں کے شکار لوگوں کے معیار زندگی اور سماجی حالات میں تیز ترین ترقی ہو۔ مذہبی، نسلی، گروہی اور دیگر اختلافات صرف طبقاتی اتحاد کے ذریعے ختم کیئے جا سکتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ دور دراز اور کٹے ہوئے علاقوں کو بڑے مراکز سے جوڑنے کیلئے ضروری انفراسٹرکچر تعمیر کر کے ملک کے حقیقی اتحاد کو یقینی بنانا ہوگا جس کیلئے دیو ہیکل سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔اگر بھارت اور پاکستان بے پناہ وسائل کے باوجود اس فریضے کی تکمیل میں ناکام ہیں تو سرمایہ داری کے اندر رہتے ہوئے کشمیر کیسے اس فریضے کو پورا کرے گا؟

اگر ہم کشمیر کے تنازعے کا گہرائی میں تجزیہ کریں تو سرمایہ دارانہ نظام کے اندر خودمختار کشمیر کی بقاء ممکن نہیں ہے۔حکمران طبقات کی پالیسیوں نے ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ خودمختار کشمیر پاکستان اور بھارت دونوں پر ناقابل برداشت اثرات مرتب کرنے کا باعث بنے گا۔کشمیر کی علیحدگی پاکستان اور بھارت دونوں ریاستوں کی ان نظریاتی بنیادوں کے پرخچے اڑا دے گی جن پر ان کی تخلیق ہوئی تھی۔ بھارتی حکمران طبقہ جمہوری سیکولرازم کو اپنی قومی ریاست کی بنیاد کے طور پر استعمال کرتا ہے۔اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے اور سیکولرازم میں خوش فہمیوں کو برقرار رکھنے کیلئے حکمران یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مختلف عقائد کے حامل لوگ اکٹھے امن اور شانتی سے رہ سکتے ہیں۔کشمیری مسلمانوں کی علیحدگی نہ صرف ہندوستانی ریاست کی نظریاتی بنیادوں کیلئے ایک شدید دھچکا ثابت ہوگی بلکہ اس سے جمہوریت اور سیکولرازم کی جو تصویر بھارتی حکمران طبقے نے دنیا کے سامنے پیش کر رکھی ہے اس کی اصلیت بھی بے نقاب ہو جائے گی۔حقیقت یہ ہے کہ مذہب کے نام پر قتل و غارت دنیا کے باقی ممالک کی نسبت سیکولرازم کے علمبردار بھارت میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ پاکستانی ریاست کی نظریاتی بنیاد مسلمانوں کے مادر وطن کے تصور پر تھی۔اگرچہ اس مذہبی بنیاد کو جناح نے سیکولرازم کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔بٹوارے

سے قبل ہندوستان میں کشمیر ایک مسلم اکثریت والی ریاست تھی اس لئے اس کو پاکستان میں شامل کرنے کا تصور پایا جاتا تھا۔

اگرچہ دوقومی نظریے اور اسلام کی بنیاد پر قومی مملکت کا تصور 1971ء کے واقعات اور بنگلہ دیش کی تخلیق سے پاش پاش ہو گیا تھا تاہم پاکستان کے ابھی تک کشمیر میں نہائیت اہم سٹرٹیجک اور معاشی مفادات ہیں۔ اگرچہ دونوں ممالک اپنے اپنے مفادات کا مختلف نظریات کے ذریعے اظہار کرتے ہیں ایک سیکولر اور دوسرا مذہبی لیکن کشمیر میں بھارت اور پاکستان کے حقیقی مفادات سٹرٹیجک اور معاشی ہیں۔

برصغیر میں شدید قومی' نسلی اور گروہی اختلافات اور تنازعات وجود رکھتے ہیں۔ کشمیر کی علیحدگی بلوچستان سے ناگالینڈ اور آسام سے سندھ تک قومی آزدی کی تحریکوں کو بھڑکانے کا موجب بن سکتی ہے۔ بھارت میں تقریباً 85 کروڑ 30 لاکھ ہندو' 18 کروڑ مسلمان' 2 کروڑ 40 لاکھ عیسائی (اس کے علاوہ سکھ' بدھ' جین اور پارسی) آباد ہیں۔

ناگالینڈ کی نیشنل سوشلسٹ کونسل ایک الگ تھلگ ملک کا مطالبہ کرتی ہے اور اسی طرح آسام کی یونائیٹڈ لبریشن فرنٹ' راجپوتانہ لبریشن فرنٹ' مانی پور کی پیپلز لبریشن فرنٹ' گجرات کی سواراجیہ سنگ' تری پورہ پیپلز ڈیموکریٹک فرنٹ' مراٹھا راشٹرا پریشد اور یوں یہ ایک لمبی فہرست ہے۔ بھارت کی 28 ریاستوں میں سے 19 میں علیحدگی کی تحریکیں سرگرم ہیں۔ برصغیر کے حکمرانوں کیلئے یہ سارا منظر نامہ قطعی ناقابل قبول ہوگا۔ یہ مرکز مخالف قوتیں جو ابھریں گی برصغیر کی جابرانہ اور شکستہ ریاستی ڈھانچے کو پاش پاش کر دیں گی۔ حکمران طبقات کیلئے اس قسم کی صورتحال ناقابل برداشت ہے چونکہ یہ ان کی حکمرانی کا خاتمہ کردے گی اور دوسری جانب اگر ایک سرمایہ دارانہ ''ریاست ہائے متحدہ کشمیر'' قائم ہو بھی جاتی ہے تو اس کا عملی طور پر مطلب یہی ہوگا کہ بھارت اور پاکستان کے حکمران طبقات کشمیری عوام کے استحصال

میں مزید اضافہ کر دیں گے۔ ایک سرمایہ دارانہ کشمیری ریاست کے وجود کا ناگزیر انحصار سامراجی اداروں کے قرضوں اور امداد پر ہوگا۔ اس کا نتیجہ کشمیریوں کی غربت اور ذلت میں اضافہ ہوگا جس سے نئے نسلی' مذہبی اور گروہی تصادم جنم لیں گے۔ جب تک کہ اس نظام کو فیصلہ کن انداز میں توڑا نہیں جاتا' جب تک ریاست اور سماج کو مکمل طور پر تبدیل نہیں کیا جاتا سامراجی زنجیریں آنے والی کئی نسلوں کو جکڑے رہیں گی۔

جنگیں' مذاکرات اور تجارت

جنگیں اور تناؤ پچھلے 58 سالوں پر محیط پاک بھارت تعلقات پر حاوی رہے ہیں ان جنگوں کے درمیانی عرصوں میں مذاکرات' امن کی کوششوں اور سفارتی ساز باز کے دور آتے رہے ہیں جن کو سرمایہ دارانہ نظام کی حاکمیت کو دوام بخشنے کی ضرورتوں کے مطابق ترتیب دیا جاتا تھا۔

کشمیر پر پاکستان اور بھارت کے مابین چار جنگیں ہو چکی ہیں۔ 49-1948ء کی جنگ کے بعد 1965ء کی جنگ ہوئی۔ پاکستان کی فوجی حکومت نے بے شمار نیم فوجی پلاٹونوں کو کشمیر کے اندر بھیج دیا اس امید پر کہ وہاں کوئی بغاوت پھوٹ سکتی ہے۔ حسب معمول ان کی توقعات غلط ثابت ہوئیں۔ کشمیر میں پائی جانے والی بے چینی پاکستان نواز جذبات کا اظہار بالکل نہیں تھی۔ پاکستانی فوج لائین آف کنٹرول عبور کرتے ہوئے کشمیر کے اندر داخل ہوگئی اس مقصد کی غرض سے کہ کشمیر کو باقی بھارت سے کاٹ دیا جائے۔ فوج کی ہائی کمان بے حد پر اعتماد تھی۔

> حملے کے وقت خود ساختہ فیلڈ مارشل ایوب خان کو یقین تھا کہ وہ لاہور کے نزدیک بھارتی شہر امرتسر پر قبضہ کر سکتے ہیں جس کو وہ سودے بازی کیلئے استعمال کریں گے۔ ایک اعلیٰ فوجی افسر نے جو وہاں موجود تھا آہستگی سے کہا: اس کو تھوڑی سے وہسکی اور پلادو تو ہم دہلی پر بھی قبضہ کر سکتے ہیں۔ بھارتی فوج کو حیرانگی ہوئی اور اسے کچھ سنجیدہ پسپائیوں کا سامنا کرنا

پڑا۔اس کا جواب انہوں نے بھی ڈرامائی انداز میں لاہور کے قریب سے پاکستان کی سرحد عبور کرنے کی صورت میں دیا۔اگر یہ جنگ جاری رہتی تو شہر پر قبضہ ہو جاتا لیکن ایوب خان نے واشنگٹن سے مدد کی اپیل کر دی۔ واشنگٹن نے ماسکو کو بھارت پر دباؤ ڈالنے کو کہا اور یوں تاشقند میں ''سوویٹ یونین کے وزیراعظم'' الیکسی کوسجن کی نگرانی میں امن معاہدے پر دستخط ہوئے۔(11)

1999ء کے موسم گرما میں پاک فوج نے کمانڈر انچیف جنرل پرویز مشرف کی زیر قیادت کشمیر میں کارگل کے محاذ پر اچانک حملہ کر دیا۔وزیراعظم نواز شریف کو اس حملے کے آغاز کے بعد معمولی سی بریفنگ دی گئی۔ بھارتی فوج نے پوری طاقت سے اس حملے کا جواب دیا اور دونوں اطراف بھاری جانی نقصان ہوا۔پاکستانیوں نے کئی دفاعی اہمیت کی حامل چوٹیوں اور علاقوں پر قبضہ کر لیا۔تاہم واشنگٹن کے شدید دباؤ کے باعث تصادم روک دیا گیا اور پاکستانی فوج کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔اس سے درمیانے درجے کے افسران میں شدید غم وغصہ پیدا ہو گیا جو پاکستانی اسٹیبلشمنٹ میں سنجیدہ تضادات کا باعث بنا جس کا نتیجہ نواز شریف حکومت اور فوج کے درمیان تعلقات میں تیزی سے کشیدگی کے بڑھنے کی صورت میں برآمد ہوا۔آخر کار ان تضادات نے ایک فوجی بغاوت کو جنم دیا۔اگرچہ اس کی زیادہ تیاری اور منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی لیکن اس کے باوجود اس میں کوئی خونریزی نہیں ہوئی۔نتیجتاً نواز شریف حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور مشرف کی قیادت میں براہ راست فوجی اقتدار مسلط کر دیا گیا۔کارگل کی جنگ نے دونوں ایٹمی قوتوں کے مابین ایک سنجیدہ بحران کو جنم دیا جس کی وجہ سے سفارتی مداخلتوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔بل کلنٹن کے اشارہ ابرو نے نواز شریف کو ایک ذلت آمیز پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔اس وقت تک کشمیر پر امریکہ کی کوئی مضبوط پوزیشن نہیں ہے بلکہ امریکہ کے اس خطے میں مفادات کشمیر سے

بالا اور کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ اس خطے کی طرف امریکہ کے رویے میں ایک واضح تبدیلی آئی اور بھارت کے ساتھ انتہائی سرد تعلقات میں کچھ گرمجوشی پیدا ہوئی۔ یہ ایک بڑی منڈی ہے اور یہ صرف بھارتی سوفٹ ویئر کا شعبہ ہی نہیں ہے جو مغربی سرمایہ کاروں کی دلچسپی کا باعث ہے بلکہ نجکاری اور بھارت کے 30 کروڑ افراد پر مشتمل پرتعیش درآمدات کیلئے وسیع تر ہوتی ہوئی درمیانے طبقے کی صارفیت امریکی کاروبار کیلئے ایک دلکش منڈی ہے۔ امریکی سامراج کی خارجی وسفارتی پالیسیاں منڈیوں کے حصول کی ہوس کے تابع بنتی ہیں امریکی برصغیر کی منڈی پر قبضے کی خاطر کشمیر میں امن چاہتے ہیں۔ پلوتارخ نے بہت عرصہ پہلے کہا تھا: ''فاتح ہمیشہ امن کے چاہنے والے ہوتے ہیں: وہ بغیر کسی مزاحمت اور مخالفت کے آپ کے شہروں میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔'' حتیٰ کہ بورژوا تجزیہ نگار بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کشمیر کا مستقبل ویسا ہی دکھائی دیتا ہے جیسا کہ اس کا ماضی تھا۔

کشمیر کے چند قوم پرست قائدین کو بھی مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کشمیر کے حل ہونے کی خوش فہمی ہے۔ وہ کشمیر کیلئے بھی اقوام متحدہ اور امریکہ کی زیرنگرانی اوسلو کی طرح کے معاہدے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ تاہم ان مذاکرات کی ناکامی جنگ کے خطرات میں اضافہ کردے گی۔ یہاں تک کہ اگر کوئی جزوی معاہدہ ہو بھی جاتا ہے تو یہ جلد ہی خاک ہوجائے گا اور نئے سیاسی وسفارتی تنازعات ابھر کر سامنے آجائیں گے جو اس پورے عمل کو ہی خطرے سے دوچار کردیں گے۔ اقوام متحدہ یا امریکہ کی زیر نگرانی دو متحارب گروپوں کے درمیان ہر معاہدے کا انجام بربادی ہی ہوتا ہے۔ فلسطینیوں کی حالت اوسلو اور میڈرڈ کے معاہدوں کے بعد پہلے سے زیادہ بدتر ہوگئی ہے۔ امریکی سامراج ایسا کوئی بھی قدم نہیں اٹھائے گا جو برصغیر کے حکمرانوں خصوصاً بھارت کے ساتھ کسی دشمنی کا باعث بنے۔ اسے برصغیر کی منڈیوں کے استحصال میں معاونت کیلئے ان ممالک کا تعاون درکار ہے۔ یہ تصور انتہائی بیہودہ ہے کہ کشمیر چین

کے خلاف امریکہ کیلئے ایک سٹریٹیجک بنیاد ہوگا۔اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ امریکہ کشمیریوں کے ساتھ پاکستان اور بھارت سے بہتر برتاؤ رکھے گا۔

امریکی سامراج کی ماتحتی اور غلامی اختیار کرنے کا یہ رجحان ان کشمیری عوام کی تضحیک کرنے کے مترادف ہے جو پچھلی پانچ دہائیوں سے سامراجی تسلط کے خلاف جدوجہد کرتے اور قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ یہ ان قوم پرست قائدین کی تھکاوٹ اور غداری کو بے نقاب کرتی ہے۔موجودہ ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے مذاکرات کے ذریعے کشمیر کے مسئلے کا حل ممکن ہی نہیں۔حتیٰ کہ سنجیدہ بورژوا ماہرین نے بھی یہ نتائج اخذ کرنا شروع کر دیے ہیں۔ ان تمام مذاکرات کا حقیقی مقصد کشمیریوں کی جدوجہد کی شدت وحدت کو کم کرنا اور موجودہ کیفیت کو طول دینا ہے۔حکمران طبقات کے علامتی تاثرات اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ یہ صرف پرامن طریقے سے غیر متفق ہونے پر متفق ہیں اور مجموعی طور پر بورژوا سفارتکاری یہی ہے۔

مسلسل انقلاب

اگر پاکستان، بھارت اور برصغیر کے دوسرے ممالک کی معاشی ترقی انتہاؤں کو پہنچی ہوتی تو نظریاتی اعتبار سے یہ کہنا ممکن تھا کہ قومی جمہوری انقلاب مکمل کیا جا سکتا ہے۔ بورژوازی کے تاریخی فرائض کیا ہیں؟ قومی جمہوری انقلاب کے تاریخی فرائض کیا ہیں؟ بورژوازی کا تاریخی فریضہ یہ ہے کہ وہ پرانے جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر کے سرمایہ داری کی تعمیر کرے۔سرمایہ داری کے پھلنے پھولنے کے لئے ضروری ہے کہ سرمایہ دار مقامی رکاوٹوں کو ختم کرے۔مقامی ٹیکسوں، علیحدہ کرنسی اور مختلف اوزان و پیمائش کے طریقہ ہائے کار کو ختم کرے۔

بورژوازی کو ایک داخلی منڈی کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے قومی یکجہتی اور ایک جدید قومی ریاست کے قیام کی ضرورت تھی۔اس تمام عمل کے لئے زرعی

اصلاحات اور پرانے جاگیروں کے نظام کو ختم کرنا، ایک سیکولر اور آزاد ریاست کا قیام، پارلیمانی جمہوریت کا قیام (جو سرمایہ داری کے تحت حکمرانی کا سب سے کارگر نظام ثابت ہوا) اور ایک جدید بنیادی ڈھانچے کی تعمیر۔

اگر برصغیر کا حکمران طبقہ قومی جمہوری انقلاب کے ان بنیادی فرائض کی تکمیل کر لیتا تو نظریاتی اعتبار سے وہ کشمیر پر کسی قسم کا اتفاق رائے کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن تھا کہ جنوبی ایشیا میں علاقائی تعاون کی تنظیم سارک (SAARC) بہتر طور پر آگے بڑھتی۔ لیکن پچھلے 58 سالوں کا تجربہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ برصغیر کا حکمران طبقہ معیشت کو اس سطح تک ترقی دینے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے جہاں یہ پر امن طور پر رہ سکیں۔ برصغیر کو تقسیم کر کے قومی وحدت کو تباہ کر دیا گیا۔ ایک سیکولر اور آزاد ریاست کبھی بھی قائم نہ کی جا سکی اور پارلیمانی جمہوریت کبھی بھی صحیح معنوں میں نہ پنپ سکی۔ برصغیر کا حکمران طبقہ قومی جمہوری انقلاب کے فرائض کو مکمل کرنے میں ہر طرح ناکام ہو چکا ہے۔

بے شمار قوموں کے حکمران طبقات سرمایہ دارانہ انقلاب کے بنیادی فرائض مکمل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ سابق نوآبادیاتی ممالک میں یہ حقیقت زیادہ واضح ہے۔ ان ممالک کی بورژوازی تاریخ کے میدان میں بہت دیر سے داخل ہوئی تھی۔ دنیا پہلے ہی چند سامراجی طاقتوں میں تقسیم ہو چکی تھی جو نئے مدمقابل کو ترقی کرنے کی آزادی نہیں دے سکتے تھے۔ اسی کے ساتھ نوآبادیاتی اور سابقہ نوآبادیاتی ممالک کی نومولود بورژوازی معاشرے میں ترقی پسندانہ کردار ادا نہیں کر سکتی تھی اور اپنے آغاز سے ہی سابقہ نوآبادیاتی مالکوں کی غلام بن گئی تھی۔ نام نہاد تیسری دنیا --- لاطینی امریکہ، افریقہ، ایشیا کی کمزور بورژوازی سماجی ترقی کے لئے غیر ملکی سرمائے اور سامراج پر بہت زیادہ انحصار کرتی ہے۔ ان ممالک میں قومی جمہوری انقلاب کو مکمل کرنے کا مطلب سامراج سے براہِ راست ٹکراؤ ہے۔ ان ممالک کا حکمران طبقہ

غیرملکی سرمائے اور جاگیرداروں کی جکڑ میں ہے، جو ترقی اور قومی جمہوری انقلاب کی تکمیل کے خلاف ایک رجعتی ایکا کیئے ہوئے ہیں۔

برصغیر کے سرمایہ دار ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عملدرآمد کیلیئے قوم پرستی اور قومی منافرت کو استعمال کرتے ہیں۔ وہ سرمایہ داری نظام کو قائم رکھنے کے لئے ان نعروں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جو چیز ان کو متحد کرتی ہے وہ عوام کا خوف ہے۔ طبقے کا رشتہ ''قوم'' کے رشتے سے کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ حکمران طبقات اپنی اور سرمائے کی حکمرانی کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کریں گے۔ اسی لئے ''مرحلہ وار انقلاب'' کا اصلاح پسندانہ اور سٹالنسٹ نظریہ رجعتی ہے۔ بورژوازی خواہ کتنی ہی ''ترقی پسند'' ہو، اس کی حمایت کا مطلب ہے کہ محنت کش طبقے کے مفادات کو سرمایہ داروں کے قدموں میں ڈال دیا جائے۔ ان دو طبقات کے مفادات میں کبھی بھی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا اور مرحلہ وار انقلاب کا نظریہ ہمیشہ محنت کشوں کے مفاد سے غداری پر منتج ہوتا ہے۔ ایلن وڈز وضاحت کرتا ہے:

> مرحلہ وار انقلاب کا نظریہ منشویکوں نے انقلاب روس کے تناظر کے حوالے سے تخلیق کیا تھا۔ مختصراً یہ نظریہ وضاحت کرتا ہے کہ، چونکہ انقلاب کے فرائض قومی جمہوری انقلاب کے ہوں گے اس لئے انقلاب کی قیادت قومی جمہوری بورژوازی کو کرنی چاہئے۔ اپنے طور پر لینن ٹراٹسکی سے اتفاق کرتا تھا کہ روسی آزاد خیال (Liberals) قومی جمہوری انقلاب برپا نہیں کر سکتے، اور اسی فریضے کو پرولتاریہ زرعی کسانوں کے ساتھ مل کر ادا کرے گا۔ مارکس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، جس نے بورژوا ''جمہوری پارٹی'' کو ''محنت کشوں کے لئے پرانے آزاد خیالوں کی نسبت زیادہ خطرناک'' قرار دیا تھا، لینن نے وضاحت کی کہ روسی بورژوازی محنت کشوں کی حمایت کرنے کی بجائے یقینی طور پر رد انقلاب کا ساتھ دے گی۔ (12)

لینن نے مزید وضاحت کی:

جیسے ہی بورژوازی کے کم ظرف اور خودغرضانہ مفادات پورے ہوں گے اور جیسے ہی یہ مستقل جمہوریت سے واپس لوٹے گی (اور یہ پہلے ہی وہاں سے لوٹ رہی ہے!) یہ یقینی طور پر ردانقلاب کی طرف اور عوام کے مخالف رخ اختیار کرے گی۔(13)

ایک سو سال پہلے لیون ٹراٹسکی نے مرحلہ وار انقلاب کے اصلاح پسندانہ اور طبقاتی سمجھوتے کے نظریے کا جواب دیا تھا۔اس نے واضاحت کی تھی کہ موجودہ عہد میں صرف محنت کش طبقہ ہی طاقت اپنے ہاتھوں میں لے کر قومی جمہوری انقلاب کے فرائض پورے کر سکتا ہے۔ پرولتاریہ، شہری غرباء اور غریب کسانوں کے ساتھ مل کر معاشرے کے مسائل کو حل کر سکتا ہے جس میں قومی مسئلہ بھی شامل ہے۔یہ طبقہ سامراجیوں اور سرمایہ داروں کا خاتمہ کر کے اور معاشرے کی تعمیر نو سوشلسٹ بنیادوں پر شروع کر کے ہی بنیادی مسائل کو جڑ سے اکھاڑ سکتا ہے۔

ایلن وڈز وضاحت کرتا ہے:

اپنے آپ کو قوم کا سربراہ بنا کر، معاشرے کے استحصال زدہ طبقات (شہری اور دیہاتی پیٹی بورژوازی) کی قیادت کرتے ہوئے پرولتاریہ طاقت اپنے ہاتھوں میں لے سکتا ہے اور پھر قومی جمہوری انقلاب کے فرائض پورے کر سکتا ہے (جن میں زیادہ اہم زرعی اصلاحات، قومی یکجہتی اور بیرونی طاقتوں سے آزادی ہے)۔لیکن یہ پرولتاریہ ایک دفعہ اگر طاقت میں آ گیا تو یہاں پر رکے گا نہیں بلکہ سوشلسٹ اقدامات کرتے ہوئے سرمایہ داروں کا خاتمہ کرے گا۔اور چونکہ یہ فرائض ایک ملک میں رہتے ہوئے مکمل نہیں ہو سکتے، خاص طور پر ایک ترقی پذیر ملک میں، اس لئے یہ ایک عالمی انقلاب کا آغاز ہو گا۔اس لئے انقلاب دو معنوں میں ''مسلسل'' ہے: ایک تو یہ بورژوازی کے

فرائض سے شرع ہوتا ہے اور سوشلسٹ اقدامات تک جاری رہتا ہے،
اور دوسرے اس لئے کہ یہ ایک ملک میں شروع ہوتا ہے اور عالمی سطح تک
پھیل جاتا ہے۔(14)

موجودہ دور میں تو یورپی یونین (EU) بھی طوفانوں کی زد میں ہے اور اس کی معاشی وحدت خطرے میں ہے۔ یورپی سرمایہ داری کے بحران نے بے روزگاری کے اژدھے کو جنم دیا ہے اور یہ محنت کشوں کے لئے مشکلات کھڑی کر رہی ہے۔ 1991ء کا جشن، جب ماسترخت (Masstricht) کا معاہدہ ہوا تھا اور یورپی یونین کی بنیادیں رکھی گئیں تھیں، اب ختم ہو چکا ہے۔ یورپی یونین کا موجودہ بحران بالکل اسی طرح کا ہے جب 1957ء میں معاہدۂ روم(Treaty of Rome) پر دستخط ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے رکن ممالک میں لوگوں، اشیاء، سہولیات اور سرمائے کی آمدورفت میں حائل رکاوٹوں کو ختم کیا گیا تھا۔ ایک شدید معاشی بحران کے بعد یہ سب ختم ہو گیا۔ امریکی معیشت اس وقت بہت بڑے بحران کی جانب بڑھ رہی ہے اور اگلے دور میں بہت بڑے زوال کا شکار ہو گی۔ جاپان کے موجودہ معاشی بحران میں اقتصادی بدحالی عروج پر ہے۔ ان حالات میں جب سرمایہ دارانہ نظام انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں زوال کا شکار ہے، برصغیر کی سرمایہ داری کس طرح معاشی ترقی کے ذریعے امن، استحکام اور مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کر سکتی ہے۔ وہ صرف امیدوں کے برخلاف امیدیں قائم کر سکتے ہیں۔ حکمران طبقات عوام کو دھوکے کے ذریعے ایک سہانا خواب دکھانا چاہتے ہیں مگر جیسے ہی عالمی معیشت کھائی میں گرے گی یہ خواب ایک ڈراؤنی حقیقت بن جائے گا۔ اس عالمی معاشی بحران سے جو علاقے سب سے زیادہ متاثر ہوں وہ پہلے سے تباہ حال اور استحصال زدہ ممالک ہوں گے۔ برصغیر اس تباہی میں سب سے آگے ہو گا۔

انقلابی روایات

پاکستان اور بھارت کے حکمران کشمیر کے عوام کی جدوجہد سے خوفزدہ ہیں۔ جدوجہد ہمیشہ ایک ہی رفتار سے آگے نہیں بڑھتی۔اس میں مدوجزر آتے ہیں۔کشمیری عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت غریب عوام پر مشتمل ہے جنہوں نے اس جدوجہد کے لئے بے پناہ قربانیاں دی ہیں۔انہیں لوگوں نے سب سے زیادہ تکلیفیں برداشت کی ہیں۔پچھلی دہائی میں یہاں 65,000 لوگ مارے جا چکے ہیں اور اس تنازعے نے ایک لاکھ بچوں کو یتیم کیا ہے۔ 300 سے زائد خودکشیوں کی اطلاعات مل چکی ہیں جن میں 77 فیصد خواتین تھیں۔ 1990ء سے لے کر 2002ء تک سات ہزار لوگ دوران حراست مارے گئے۔ چھ ہزار سے زائد لوگ گمشدہ ہیں۔یہاں ہر جگہ بیوائیں اور نیم بیوائیں (جن کے شوہر لاپتہ ہیں) پائی جاتی ہیں۔نیم بیوائیں شادی نہیں کرسکتیں۔وہ اپنی گزر اوقات بھیک کے ذریعے کرسکتی ہیں۔ 1989ء کی بغاوت سے پہلے بھیک کا پیشہ کشمیر میں نہیں پایا جاتا تھا۔وادی کا ہر خاندان کسی نہ کسی طرح اس گھناؤنے المیے کا شکار ہے۔ہر سال بغاوت جاری رہتی ہے اور کشمیر میں نئی قبریں کھودی جاتی ہیں۔کشمیر کے لوگ اس ظلم سے تنگ آ چکے ہیں لیکن ان کے پاس کوئی حل نہیں ہے۔

ذرائع ابلاغ، اہم سیاسی جماعتیں، قائدین، دانشور اور نام نہاد رائے عامہ کو استوار کرنے والے ہم پر یہ مسلط کرتے رہتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر موجودہ حالات کے اندر رہتے ہوئے حل ہو گا۔لیکن بھارت اور پاکستان دونوں نامکمل قومی ریاستیں ہیں۔ان دونوں معاشروں میں طبقاتی تضاد واضح انداز میں پایا جاتا ہے۔مظلوم

طبقات نہ صرف معاشرے کا اکثریتی حصہ ہیں بلکہ تمام دولت اور توانائی پیدا کرتے ہیں۔ حکمران طبقات محنت کشوں کی محنت کا استحصال کرتے ہیں اور دولت کو اپنے مخصوص مقاصد پر صرف کرتے ہیں۔اس سب سے بڑھ کر استحصال کرنے والا طبقہ ریاستی مشینری کے ذریعے عوام کے مستقبل کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔کروڑوں لوگ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے سے محروم ہیں۔ان کی قسمت کوئی اور تخلیق کرتا ہے۔سماج کے اہم فیصلے جن میں کشمیر کے مسئلے کا فیصلہ بھی شامل ہے عوام کے ذریعے نہیں ہوتے بلکہ حکمران طبقات یہ فیصلے کرتے ہیں۔اس مسئلے کا کوئی حقیقی حل اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک مسئلے کے طبقاتی کردار کو نہیں پہچانا جائے گا اور یہ بات نہیں سمجھی جائے گی کہ طبقاتی تضاد طبقوں کے مابین سمجھوتے کے ذریعے ختم نہیں ہوسکتا۔

کشمیر کے محنت کشوں کے مفادات کی ترجمانی یا حصول اشرافیہ، نوزائیدہ بورژوازی، امراء یا بنیاد پرست لیڈر نہیں کر سکتے۔ان میں سے زیادہ تر کو ان دونوں ملکوں کی ریاستوں نے پروان چڑھایا ہے۔یہ لوگ پاکستان اور بھارت کے حکمران طبقات کی لوٹ مار میں دوسرے درجے کے حصے دار ہیں۔

تاریخ منجمد جسم کی مانند نہیں ہوتی بلکہ اسے وقتاً فوقتاً لکھنا پڑتا ہے۔تمام علوم کی طرح اسے بھی حقائق اور تجزیاتی طریقہ کار میں ترقی کے ساتھ منسلک کرنا پڑتا ہے۔یہ بات ضروری ہے کہ تاریخ کو محض واقعات کے بیان کی بجائے ایک عمل کے طور پر دیکھا جائے۔تاریخ کا علم وسیع ہوگیا ہے۔اب اس میں تبدیلی کا مطالعہ، پیدوار کے مختلف ذرائع، طبقات، قبیلے، جنس، مختلف ادوار کی معیشتیں، ٹیکنالوجی کا کردار، ریاست کے بننے کا عمل، مذہبی فرقوں کی سماجی بنیاد، نظریات کی تاریخ اور انسانی اعمال کے ماحول پر اثرات جیسے موضوعات شامل ہو چکے ہیں۔اگر تاریخ کو غرباء اور مظلوم طبقات کے تناظر کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ معاشرے کی زیادہ جامع اور مکمل تصویر پیش کرتی ہے بجائے اس کے کہ اسے حکمران طبقات کے بیانات کے

آئینے میں دیکھا جائے۔کشمیر کی تاریخ کا سائنسی تجزیہ ہمیں سفاک مظالم،، محلاتی سازشوں، غداریوں اور تشدد کے ادوار دکھاتا ہے۔اور سب سے بڑھ کر یہ ہمارے سامنے مختلف مذاہب ،نسلوں اور خاندانوں کے ظلم کے خلاف عوام کی بے باک جدوجہد پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔

کشمیر کی تاریخ یہاں کے امراء کی ان غداریوں کو بھی بے نقاب کرتی ہے جو انہوں نے یہاں کے عوام کے ساتھ کیں جب انہوں نے بیرونی حملہ آوروں کو یہاں مدعو کیا۔کشمیر کی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔مظلوموں کی یہ جدوجہداب بھی اپنی آزادی کے لئے جاری ہے بے شک اب منزل زیادہ دور نہیں۔ چاہے ذرائع ابلاغ کشمیریوں کی مزاحمت کے عسکری اور پرتشدد رخ کو ہی منظر عام پر لاتے ہوں لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ آزادی کی جدوجہد وادی کے عام لوگوں کی عوامی مزاحمت پر مبنی ہے۔

عام ہڑتالیں،جلوس اور عوامی مظاہرے دہائیوں سے بھارتی فوج کی طاقت اور ظلم کو للکارتے آئے ہیں۔ یہ صورتحال اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ کشمیر کے عوام میں انقلابی جذبہ کس حد تک موجود ہے۔انہوں نے آزادی کی جدوجہد میں حیران کن قوت کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہاں سری نگر اور کشمیر کے دوسرے شہروں میں ہڑتالوں شٹر ڈاؤن اور عوامی مظاہروں کے طوفان دکھائی دیتے ہیں۔لیکن بہت سی دوسری تحریکوں کی طرح کشمیری عوام کی جدوجہد میں بھی انقلابی قیادت کا فقدان ہے۔صرف اسی ایک فرق نے اس آزمائش کو طویل کر دیا ہے۔سیکولر قوم پرست اور بائیں بازو کے پرانے لیڈروں کا یہ موقف ہے کہ کشمیر اتنا پسماندہ ہے کہ اس میں محنت کشوں کی بڑی قوت موجود نہیں اور یہ کہ کشمیری معاشرہ اور صنعت بہت زیادہ ترقی پذیر ہے۔وہ ان مسائل کو انقلاب کے پہلے مرحلے کے ذریعے حل کرنا چاہتے تھے یعنی قومی جمہوری یا بورژوا انقلاب کے ذریعے۔ان کے خیال میں کشمیر میں سوشلسٹ انقلاب کا امکان

مبہم جوئی یا کوئی یوٹوپیا ہوگا۔

برصغیر کے تمام ممالک میں زرعی انقلاب اور جاگیرداری کا مکمل خاتمہ اپنی تکمیل سے کوسوں دور ہے۔عوام کی ایک بڑی اکثریت اپنے بنیادی جمہوری حقوق سے محروم ہے۔کشمیر کا تنازعہ حقیقت میں دکھاتا ہے کہ یہ ممالک متحد قومی ریاست قائم نہیں کر سکے اور قومی سوال حل نہیں کر سکے۔ بھارت اور پاکستان میں مذہب اب بھی ریاست اور سیاست کا اہم حصہ ہے۔ مذہب کو ریاست سے علیحدہ کرنے کی بجائے ان ممالک میں بحرانوں کی شدت نے مذہبی منافرت کو مزید طاقت دی ہے۔سماجی اور مادی بنیادی ڈھانچہ انتہائی ترقی پذیر ہے اور اتنا ناگفتہ بہ ہے کہ اس پر جدید صنعتی معیشت قائم نہیں کی جاسکتی۔اور سب سے بڑھ کر وہ سامراج کے شکنجے سے آزاد ہونے کی بجائے اس کی جکڑ میں زیادہ پھنس گئے ہیں۔

مشترکہ اور ناہموار ترقی کا قانون

کشمیر کو ایک پسماندہ اور ترقی پذیر ملک قرار دینا صحیح نہیں ہے۔موجودہ عہد کی گلوبلائیزیشن میں ترقی کا سارا انداز ہی غیر ہموار اور نسبتی ہے۔ جدیدیت اور قدامت ایک دوسرے کو مختلف جگہوں پر قطع کرتے ہیں اور مزید تضادات پیدا کرتے ہیں۔ یہ تضادات مخصوص سیاسی اور سماجی رجحانات کو جنم دیتے ہیں جن کی جھلک کشمیر کی سماجی- معاشی ترقی میں نظر آتی ہے۔انقلاب میں پرولتاریہ کے کردار کو صرف عددی طاقت کے ذریعے ہی نہیں پرکھا جاسکتا۔ پرولتاریہ کے کردار کو معاشرے میں اس کے معاشی اور سماجی کردار کے حوالے سے جانچنا ضروری ہے۔بے شک کشمیر کے زیادہ تر محنت کش غیر روایتی اور سروسز کے شعبے میں ہیں اس کے باوجود وہ معاشرے میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ کشمیر میں کوئی بڑی مقامی صنعت نہیں ہے اور نہ ہی سرمایہ داری میں رہتے ہوئے یہاں کوئی ہوسکتی ہے۔

کشمیر کی معیشت کا بڑا حصہ بیرون ملک کشمیری محنت کشوں کی بھیجی ہوئی رقوم پر مشتمل ہے۔ ان کشمیری محنت کشوں کا ایک بڑا حصہ، جو لاکھوں میں ہے، دور دراز ممالک میں انتہائی ترقی یافتہ صنعتوں میں کام کرتا ہے۔ وہ ان ترقی یافتہ معاشروں کے محنت کشوں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ان ممالک کی ٹریڈ یونین اور مزدور جماعتوں میں حصہ لیتے ہیں۔ اس سے ان مہاجر کشمیری محنت کشوں کو موقع ملا ہے کہ وہ ایک ترقی یافتہ ثقافتی اور سیاسی شعور حاصل کرسکیں۔

ساتھ ہی ساتھ وہ محنت کش کشمیر سے اپنے تعلق کو بھی بحال رکھتے ہیں۔ رشتہ داروں اور سماجی تعلق کے باعث وہ ترقی یافتہ ممالک کے ان تجربات کو کشمیر میں موجود اپنے ہم وطنوں تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ روزمرہ کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک میں پیدا ہونے والی اشیاء کی ایک بڑی تعداد کشمیر کے دور دراز علاقوں تک پہنچائی جاتی ہے۔ انٹرنیٹ اور سیٹلائیٹ ٹیلی وژن کے اثرات کشمیر کے دونوں جانب مرتب ہوئے ہیں۔ جدید اشیاء اور ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے باعث کشمیر کے قدیم معاشرے میں جدیدیت کے جزیرے نمودار ہوئے ہیں۔ یہ قدامت کشمیر کے عوام میں، خاص کر نوجوانوں میں اس جدیدت کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے کی ایک شدید خواہش کو جنم دیتی ہے۔ ان پر ہونے والا ظلم اور ان کی اس ظلم کے خلاف جدوجہد یہاں کے عوام کے اندر ان جدید ذرائع اور طریقہ ہائے کار کے حصول کی خواہش پیدا کرتی ہے تاکہ وہ اپنی مزاحمت کو جدید بنیادوں پر استوار کرسکیں۔

مارکس، لینن اور ٹراٹسکی کا مشترکہ اور غیر ہموار ترقی کا قانون اس پیچیدہ اور متضاد سماجی معاشی ترقی کی وضاحت کرتا ہے۔

> غیر ہموار ترقی کا قانون تمام انسانی تاریخ پر حاوی ہے۔ سرمایہ داری انسانیت کے مختلف گروہوں کو ترقی کے مختلف مراحل پر پاتی ہے، جس میں ہر ایک کے واضح داخلی تضادات ہوتے ہیں۔ ان مراحل میں

تنوع اور مختلف ادوار کے دوران انسانیت کے مختلف گروہوں کی شرح ترقی میں غیر معمولی ناہمواری سرمایہ داری کو نقطہ آغاز فراہم کرتی ہے۔ سرمایہ داری اس وراثتی غیر ہمواری پر بتدریج اختیار حاصل کرتی ہے۔ یہ (سرمایہ داری) اسے اپنے طریقوں اور ذرائع سے توڑتی ہے اور اس کو تبدیل کرتی ہے۔ (15)

اپنے سے پہلے کے معاشی نظام کے برعکس سرمایہ داری معاشی طور پر مسلسل پھیلنے کی خواہش رکھتی ہے اور نئے خطوں میں داخل ہوتی ہے۔ معاشی فرق کو ختم کرتی ہے اور ایسی صوبائی اور قومی معیشتیں جن کی اپنی پیداوار خود ان کے لئے کافی ہوتی ہے ان کو ایک دوسرے پر انحصار کرنے والے اقتصادی نظام میں تبدیل کر دیتی ہے۔

ممالک کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور ان کی ترقی کے مختلف مراحل کو برابر کرنے کے لئے سرمایہ داری اپنے ہی طریقہ کار سے کام کرتی ہے یعنی انارکسٹ طریقہ کار سے، جو مسلسل اس کے اپنے ہی کام کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ایک ملک کو دوسرے کے خلاف کرتا ہے، صنعت کے ایک شعبے کو دوسرے کے مقابلے پر لاتا ہے، عالمی معیشت کے کچھ حصوں کو ترقی دیتا ہے تو کچھ کی ترقی کی رفتار کم کرتے ہوئے تباہ کرتا ہے۔ صرف ان دونوں رجحانات کا باہمی تعلق -- اور یہ دونوں سرمایہ داری میں سے جنم لیتے ہیں -- ہمارے سامنے تاریخی عمل کی حقیقت واضح کرتا ہے۔

سامراج سرمائے کی آفاقیت، سرایت کرنے کی اہلیت، حرکت اور تیز ترین رفتار سے بڑھوتری کے باعث ان دونوں رجحانات کو طاقت دیتا ہے۔ سامراج کسی بھی دوسرے کے مقابلے میں زیادہ تیزی اور زیادہ گہرائی سے انفرادی قومی اور براعظمی اکائیوں کو ایک اکائی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ ان کو قریب لاتے ہوئے ان کا ایک دوسرے پر انحصار بڑھاتا ہے اور ان کے معاشی طریقہ ہائے کار، سماجی ڈھانچوں اور ترقی

کے مراحل میں مماثلت پیدا کرتا ہے۔اسی وقت وہ یہ 'مقصد' ایسے متضاد ذرائع، لمبی چھلانگوں اور ترقی پذیر ممالک پر ایسے حملوں سے پورا کرتا ہے کہ جس عالمی معیشت کی اکائی اور برابری کی کاوش اس نے کی تھی وہ اسی سرمایہ داری کے ہاتھوں پچھلے ادوار کی نسبت زیادہ پر تشدد طور سے بکھر جاتی ہے۔(16)

اپنی عظیم تصنیف ''انقلاب روس کی تاریخ'' میں ٹراٹسکی لکھتا ہے:

امریکہ میں یورپی آبادکاروں نے قطعی طور پر تاریخ کی ابتدا، الف ب سے نہیں کی تھی۔امریکہ اور جرمنی کی برطانیہ پر معاشی برتری کی حقیقت ،ان دونوں کے سرمایہ دارانہ ارتقا کی پسماندگی کی مرہون منت ہے۔ تاریخی طور پر پسماندہ قوموں کی ترقی، لازماً ان کو تاریخی عمل کے مختلف مرحلوں کے اتصال کی طرف لے جاتی ہے۔ان کی ترقی کا کردار مجموعی طور پر غیر منصوبہ بند، پیچیدہ، اور ملی جلی کیفیت کا ہوتا ہے۔تاہم تدریجی مرحلوں سے بچ نکلنے کا امکان کسی طور حتمی نہیں ہوتا ہے۔اس کے درجے کا تعین، بڑی حد تک اس ملک کی معاشی اور ثقافتی صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔ اپنی قدیم ثقافت میں ان بیرونی حاصلات کو اپناتے ہوئے پسماندہ قوم کبھی بھی ان کی قدرومنزلت میں کمی نہیں کرتی۔تحلیل کا یہ عمل اپنے اندر ایک متضاد کردار کا حامل ہوتا ہے...

... تاریخی قوانین کا نمائشی تصورات سے کوئی واسطہ نہیں ہوا کرتا۔ تاریخی عمل کا سب سے عمومی قانون، ناہمواری، اپنا سب سے شدید اور پیچیدہ اظہار پسماندہ ملکوں کی تقدیر کی صورت میں کرتا ہے۔ خارجی ضرورت کا چابک ان کی پسماندہ ثقافت کو جست لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ ناہمواری کے اس عالمگیر قانون سے ایک اور قانون کا ظہور ہوتا ہے، جسے ہم ایک بہتر نام دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے، مشترکہ ترقی کا قانون کہہ سکتے ہیں۔ جسے ہم ایک ہی سفر کے مختلف مگر جڑے ہوئے مرحلے، دو مختلف

> عوامل کا اشتراک، یا قدیم کی جدید صورتوں کے ساتھ آمیزش قرار دے سکتے ہیں۔اس قانون کو اس کے تمام مادی اجزاء سمیت سمجھے بغیر تاریخ کو سمجھنا ناممکن ہے۔(17)

یہ انتہائی غلط اور مبہم تعین ہوگا اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ عوام کے شعور اور سماج میں صنعت اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے مراحل میں براہِ راست کوئی تعلق ہے۔مثال کے طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ شاید اس وقت ٹیکنالوجی اور صنعت کے لحاظ سے دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔لیکن اس کے باوجود امریکہ میں سیاسی شعور کا معیار کسی بھی ترقی پذیر ملک کے مقابلے میں بہت پست ہے۔ یہ بات کہنا مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کہ کشمیر میں جدو جہد کرنے والے عوام کا سیاسی شعور امریکہ کی ترقی یافتہ صنعت میں کام کرنے والے لوگوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

عوام کا عمومی شعور اور معاشی ترقی کی کیفیت میں براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح انقلابی شعور کے ارتقاء اور عوامی تحریکوں کے پھٹنے کا ملکی شرح پیداوار میں اضافے یا کمی سے کوئی تعلق نہیں۔تاریخ نے معاشی ترقی کے عروج پر عوامی تحریکیں پھٹتی دیکھی ہیں،جیسا کہ 1968ء کے انقلاب فرانس میں ہوا تھا۔معاشی زوال کے ادوار میں بھی معاشرے انقلابی تحریکوں کی لپیٹ میں آئے ہیں۔عوام کے شعور اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور معاشی بڑھوتری کا جدلیاتی رشتہ ہے۔معاشی بڑھوتری میں کوئی اچانک تبدیلی محنت کش عوام کے عمومی شعور کو ہلا سکتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس سے کوئی انقلاب آجائے۔عوام کے عمومی شعور کے ارتقاء اور عوامی تحریکوں کے پھٹنے کا موجود عہد کے عمومی کردار اور حالات سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔لیون ٹراٹسکی نے اس بات کی وضاحت ایک صدی پہلے کردی تھی جب اس نے لکھا کہ:

> جب تاریخی ارتقاء کا دھارا ابھرتا ہے،عوامی سوچ زیادہ دور اندیش، دلیر اور عقلمند ہو جاتی ہے، یہ حقائق کو دور سے ہی دیکھ لیتی ہے اور

ان حقائق کو عمومی صورتحال سے منسلک کرتی ہے...اور جب سیاسی دھارے کا رخ پستی کی طرف ہوتا ہے، عوامی سوچ بے وقوفی کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے، سیاسی سمجھ بوجھ کوئی نشان چھوڑے بغیر غائب ہو جاتی ہے۔ بے وقوفی بڑھتی جاتی ہے اور اپنے دانت نکال کر عقل مند تجزئے کی کسی بھی شکل پر ہنستی اور اوراس کی تذلیل کرتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میدان میں اس وقت یہی بے وقوفی موجود ہے اور وہ اپنے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیتی ہے۔(18)

وہ قائدین جو عوام کو انقلابی تحریک شروع کرنے کے لئے نا اہل اور سست قرار دیتے ہیں وہی قائدین اس بہانے کو انقلابی تحریکوں کے آغاز میں دیر کرنے کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ سوچ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ وہ تاریخی عمل کی جدلیات اور عوامی جدوجہد کی حرکت سے ناواقف ہیں۔ ٹراٹسکی ''لینن کے بعد تیسری انٹرنیشنل'' میں لکھتا ہے:

یہ ایک مخصوص منشویک دھوکہ ہے کہ قائدین کی غلطیوں کو 'عوام' پر ڈال دیا جائے یا پھر لیڈر شپ کی اہمیت کو کم تر کر کے اس کی خفت کو کم کیا جائے۔ یہ 'بالائی ڈھانچے' (SuperStructure) کی جدلیاتی سمجھ بوجھ سے عاری ہونے کا نتیجہ ہے، یعنی طبقے کا بالائی ڈھانچہ جو کہ پارٹی ہے، اور پارٹی کا بالائی ڈھانچہ جو کہ موجود لیڈر شپ ہوتی ہے۔ تاریخ میں ایسے عہد بھی آتے ہیں جب مارکس اور اینگلز جیسے لوگ تاریخی ارتقاء کو ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا پاتے، اور ایسے ادوار بھی آتے ہیں جب کہیں کم قابلیت کے لوگ فیصلے کر کے عالمی انقلاب کے ارتقاء کو کئی سالوں تک روکے رکھتے ہیں... پرولتاری انقلاب کی بہت سی مشکلات میں سے ایک مخصوص اور ٹھوس مشکل انقلابی پارٹی کی لیڈر شپ کی حیثیت اور فرائض سے جنم لیتی ہے جس کا سامنا وہ حالات کے تیزی سے بدلتے

> ہوئے رخ میں کرتی ہے۔ یہاں تک کہ انتہائی زیادہ انقلابی پارٹی بھی وقت سے پیچھے رہ سکتی ہے اور نئے حالات اور نئی ضروریات میں پرانے اقدامات کرسکتی ہےاور پرانے نعرے لگا سکتی ہے۔(19)

کبھی بھی عوام کے موڈ کا پہلے سے پتہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ عوامی نفسیات کے مخصوص قوانین کے زیر اثر بدلتا ہے جسے معروضی سماجی حالات تحرک دیتے ہیں۔اس بات کا اندازہ لگانے کے لئے کہ طبقے کا سیاسی درجہ کیا ہے،ایک خاص حد میں رہتے ہوئے،اخبارات کے پڑھے جانے کی تعداد،جلسوں میں شرکت،الیکشنوں،جلوسوں اور ہڑتالوں وغیرہ سے لگایا جا سکتا ہے۔اس عمل کی حرکت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس بات کا تعین کیا جائے کہ محنت کشوں کا موڈ کس سمت میں اور کیوں تبدیل ہو رہا ہے۔معروضی اور موضوعی اعداد و شمار کو یکجا کرتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ تحریک کا ایک وقتی تناظر بنایا جائے یا ایک سائنسی پیشین گوئی کی جائے جس کے بغیر ایک سنجیدہ انقلابی جدوجہد کا تصور ناممکن ہے۔

انقلاب کشمیر کا سوشلسٹ کردار

ایک سیدھا خط کھینچنے کے لئے دو نقطوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ایک خط مستدیر کھینچنے کے لئے کم از کم تین نقطوں کی ضرورت ہوتی ہے۔سیاست کے خطوط بہت سے نقطوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو اس کو پیچیدہ اور مستدیر بنا دیتے ہیں۔مختلف گروہوں کا درست تجزیہ کرنے کے لئے مختلف مراحل اور تحریکوں کے مدوجزر پر ان کے اعمال کا جائزہ لیا جانا چاہئے۔

> مارکسزم مسئلے کو اس کے کُل میں دیکھتے ہوئے' حالات میں تبدیلیوں کے باوجود اپنی بنیادی حکمت عملی پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہتا ہے۔ یہ طریقہ کار فوری نتائج تو نہیں دیتا لیکن یہ واحد قابل اعتبار طریقہ ہے۔بے ہودہ لوگوں کو اپنا گند پھیلانے دو۔ ہم کل کی تیاری کریں

گے۔(20)

بے پناہ قربانیاں، دلیرانہ جدوجہد کی تاریخ اور کشمیر کی تحریک کا انقلابی کردار انقلابی حل مانگتا ہے۔دوسرے تمام طریقے ناکام ہو چکے ہیں۔اتنی قربانیوں کے باجود مسلح جدوجہد بھارتی قبضہ ختم کرانے میں ناکام ہوچکی ہے۔موجودہ مذاکرات اور کشمیر کی تاریخ اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ حکمرانوں کے نمائندوں اور ریاستوں کے مابین ہونے والے مذاکرات کبھی بھی دیرپا امن کی ضمانت نہیں دے سکتے۔اگر ذرائع ابلاغ کی طرف سے غلط فہمی پھیلانے کے باعث تحریک کچھ سست رو ہوئی ہے، چاہے عارضی طور پر،تو ریاستی قوتیں بھی بغاوت کو کچلنے میں ناکامی پر تھک چکی ہیں اور کم ہمتی کا شکار ہیں۔وہ چالاکی سے اپنی ہار کو قبول کرتے ہیں اوراس دلدل سے باہر نکلنے کا رستہ تلاش کرتے ہیں۔اپنے ایک حالیہ مضمون میں پاکستان کے ممبر پارلیمنٹ ایم پی بھنڈارا اپنے دورہ سرینگر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> کشمیر میں بھارتیوں کے سب سے بڑے دشمن وہ خود ہیں۔نہ ہی ظلم،تشدد اور نہ بدعنوانی عوام کے دل جیت سکتی ہے۔ہر قابض فوج اپنا ابوغریب خود بناتی ہے۔بنگلہ دیش کی جنگ میں پاکستانی فوج نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بھارتی قابض فوج نے وادی کشمیر میں عام آدمی کو اپنے سے دور کر دیا ہے۔ایک اہم کشمیری وزیر نے ایک نجی گفتگو کے دوران تسلیم کیا کہ: بھارت کو کشمیر کے عذاب سے چھٹکارا دلانے کے لئے پاکستان کو آگے آنا چاہئے۔(21)

اس بات کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ بیان اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ پاکستان اور بھارت کا حکمران طبقہ، چاہے خفیہ طور پر سہی، ایک دوسرے پر بہت حد تک انحصار کرتا ہے۔قوم پرستی، حب الوطنی اور باہمی دشمنی کی غذا صرف عوام کے لئے ہے۔

صرف معاشی، سماجی اور سیاسی نظام ہی بوسیدہ نہیں ہوا بلکہ جغرافیائی اور ریاستی ڈھانچے بھی ترقی، امن اور استحکام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔صرف LoC ہی تاریخی ،معاشی اور ثقافتی طور پر غیر ضروری نہیں بلکہ انٹرنیشنل سرحدیں بھی اپنا وقت پورا کر چکی ہیں۔صحافت کے شعبے کے اہم مصنفین بھی اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں۔'دی ہندو' اخبار کے ڈپٹی ایڈیٹر سدھارتھ وردراجن نے لکھا:

> LoC کو مستقل کرنے یا دوبارہ بنانے کی ضرورت نہیں ،حل یہ ہے کہ اس کو غیر ضروری قرار دے دیا جائے...(22)

ایم جے اکبر جیسے بورژوا قوم پرست بھی جب پاک بھارت تعلقات کا تجزیہ کرتے ہیں تو اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں (خواہ غیر واضح انداز میں) کہ سرحدوں کا تقدس اور مستقل مزاجی بہت نازک ہے۔اپنے ایک حالیہ مضمون میں ایم جے اکبر لکھتا ہے:

> یہ بات واضح ہے کہ اگر LoC ہمالیہ کی برف میں پگھلتی ہے تو یہ پنجاب اور میدانی علاقوں میں زیادہ تیزی سے ختم ہوگی۔(23)

جہاں تک پاکستان اور بھارت کے حکمران طبقات کی بات ہے تو وہ نہ تو تقسیم کو ختم کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور نہ یہ ان کے لئے ممکن ہے۔صرف برصغیر کے مظلوم طبقات کی ایک انقلابی تحریک طبقاتی جڑت قائم کرتے ہوئے اس تقسیم کو ختم کر کے واپس اس عمل کی طرف لوٹ سکتی ہے جس کو روکنے کے لئے یہ تقسیم کی گئی تھی۔

عوام کی ریڈیکلائزیشن

اب واحد رستہ جو باقی بچا ہے وہ معاشرے کی انقلابی تعمیر نو ہے۔صرف یہی تعمیر نو ہی کشمیر کے مظلوم عوام کو آزادی دلا سکتی ہے۔جب کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کو ممبئی، مدراس، لاہور، کراچی اور دہلی کی گلیوں میں سے حمایت ملے گی تو یہ کشمیر کے عوام کو اس ظلم اور بربریت کے خلاف لڑنے کا ایک نیا حوصلہ دے گی۔اگر عراق اور

ویت نام میں امریکی حملے کے خلاف واشنگٹن، نیو یارک، سان فرانسسکو اور دیگر امریکی شہروں میں عظیم الشان مظاہرے ہو سکتے ہیں تو کشمیر پر غاصبانہ قبضے کے خلاف بھی پاکستان اور بھارت کے شہروں میں مظاہرے ہو سکتے ہیں۔اس کو کامیاب کرنے کے لئے ایک باقاعدہ حکمت عملی اور پروگرام کی ضرورت ہے۔اس کے ساتھ ساتھ برصغیر کے دوسرے خطوں اور کشمیر کے درمیان ایک حقیقی طبقاتی رشتہ جوڑنے کی بھی ضرورت ہے۔

یہ بات سچ ہے کہ کشمیر کا سوشلسٹ انقلاب پاکستان اور بھارت کے انقلاب کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔جو کچھ بھی کشمیر میں ہوا ہے اس کی ذمہ داری پاکستان اور بھارت کے بائیں بازو کے لیڈروں پر عائد ہوتی ہے۔

بھارت کی کمیونسٹ پارٹی کی نسبتاً زیادہ بڑی عوامی بنیادیں تھیں۔لیکن ان کا مسئلہ کشمیر پر موقف غلط تھا۔یہ پالیسی ''مرحلہ وار انقلاب'' کے نظریے کا نتیجہ تھا۔کمیونسٹ پارٹیوں نے بھارتی بورژوازی کو قومی جمہوری انقلاب کے تقاضے پورے کرنے کے لئے حمایت دی۔ بورژوا انقلاب کی تکمیل کے لئے انہوں نے بالواسطہ طور پر کشمیر کے غاصبانہ قبضے کی بھی حمایت کی۔اس طرح وہ بالواسطہ اور بلا واسطہ بھارتی حکمرانوں کے حامی بن گئے تا کہ وہ سیکولر اور جمہوری بھارتی ریاست کے نام پر کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کر سکیں۔

اس طرح انہوں نے کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی مخالفت کی۔کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) کو کشمیر میں جو تھوڑی بہت بنیادیں ملیں تو وہ اس کی 'عوام دوست'' پالیسیوں کی وجہ سے تھی، جو اس کی دہلی میں بیٹھی قیادت کی پالیسیوں سے مختلف تھی۔اس طرح انہوں نے قوم پرستوں کا رستہ ہموار کیا،اور بعد میں تو بنیاد پرست بھی کمیونسٹ پارٹی کی درست مارکسسٹ پالیسی نہ ہونے کے باعث سیاسی خلا کا فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔

پاکستان میں بایاں بازو کبھی بھی عوامی بنیادیں تعمیر کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا اور مختلف گروہ محدود ہی رہے۔ یہ تمام تنظیمیں اپنی پالیسیاں ''مرحلہ وار انقلاب'' کے نظریے کے تحت بناتی تھیں۔ایک طرف تو وہ کشمیر کی آزادی کی تحریک کی سرمایہ دارانہ بنیادوں پر حمایت کرتی تھیں اور دوسری طرف اپنے بھارتی نظریاتی ساتھیوں کی طرح کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی حمایت کرتی تھیں۔ بھارت کی طرح یہاں بھی وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح قومی جمہوری انقلاب مکمل ہوجائے گا۔

ان تمام تر مشکلات کے باوجود، کشمیر میں آزادی کی جدوجہد زیادہ ریڈیکلائز ہورہی ہے، خاص طور پر نوجوانوں میں۔عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات اس تحریک کو مزید ریڈیکلائز کریں گے اور اسے بائیں بازو کی طرف دھکیلیں گے۔ پاکستانی اور بھارتی قومی تعصب بھی کمزور ہوتا جارہا ہے۔حکمران طبقات کے لئے ماضی کی طرح کا جنگی جنون یا قومی تعصب پیدا کرنا مشکل ہوگا۔

اپنی عظیم تصنیف ''لوئی بوناپارٹ کی اٹھارویں برومئیر'' میں کارل مارکس انقلابی عمل کی حرکت کی وضاحت کرتا ہے۔

> انسان اپنی تاریخ خود بناتے ہیں لیکن ویسی نہیں جیسی وہ چاہتے ہیں۔ وہ اسے اپنی مرضی سے منتخب کردہ حالات کے تحت نہیں بناتے بلکہ پہلے سے موجود حالات کے اندر ہی اسے مرتب کرتے ہیں جو ماضی کا ورثہ ہوتے ہیں۔مٹ جانے والی نسلوں کی روایات زندہ لوگوں کے ذہن پر ایک ڈراؤنے خواب کی طرح حاوی رہتی ہیں۔جب لوگ اپنی اور چیزوں کی کایا قلب کرنے اور کوئی نئی چیز تخلیق کرنے میں مصروف ہوتے ہیں جو پہلے موجود نہیں ہوتی تو عین انقلابی جدوجہد کے دنوں میں وہ ماضی کی روح کو بھی اپنے اندر اتار لیتے ہیں یعنی عالمی تاریخ میں کوئی نیا کردار ادا کرنے کی خاطر وہ ماضی کے نام، جنگی نعرے اور لباس تک کو اپنا لیتے ہیں۔

دوسری طرف پرولتاری انقلابات خود پر مسلسل نگاہ رکھتے ہیں، عمل کے دوران اپنا تجزیہ کرتے رہتے ہیں، واپس پلٹتے ہیں، اور ایک نیا آغاز کرتے ہیں، بڑی بے رحمانہ شدت سے اپنی خامیوں اور پہلی کاوشوں کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو دور کر کے دشمن کو زیر کر لیتے ہیں مبادہ وہ زمین سے نئی طاقت حاصل کر کے ان کے سامنے زیادہ قد آور بن کر کھڑا ہو جائے۔ یہ انقلابات اپنے مقاصد کے وسیع اور حیرت انگیز نتائج دیکھ کر قدرے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ مگر پھر کوئی ایسی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے جو واپسی کے تمام راستے مسدود کر دیتی ہے اور پکار کر کہتی ہے۔ ''یہ ہیں گلاب، یہیں ہو گا رقص'' (24)

چونکہ رجعتی لوگ شکست خوردہ ہیں اور کشمیری قوم پرست کوئی واضح حل نہیں دے سکتے اس لئے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد انقلابی حل کے لئے کوشاں ہے۔ موجودہ نام نہاد دکھاوا اور اعتماد سازی کے اقدامات (CBM) اس تحریک کو ختم نہیں کر سکتے جس نے اتنے نا مساعد حالات میں جدوجہد کی ہو۔ کشمیر کی روایتی ''قوم پرست'' اور سیکولر جماعتوں میں کارکنوں کی ایک بڑی تعداد ہے جو اس غیر ملکی قبضے کے خلاف جدوجہد میں ریڈیکلائز ہو چکی ہے۔ وہ طبقاتی استحصال میں اضافے اور کشمیر کے اندر امیر اور غریب میں بڑھتی ہوئی خلیج کو دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کی ایک بڑی تعداد اب بھی پارٹی کے بنیادی ''سوشلسٹ'' پروگرام پر یقین رکھتی ہے۔ ان کو اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ مسلح جدوجہد کا خاتمہ اور ان کے لیڈروں کی سفارتی عمل میں شمولیت دراصل سامراج اور سرمایہ داری نظام کے آگے شکست ہے۔ اسی طرح ان کا بھارتی جمہوریت کے ساتھ عشق بھی اب ایک تلخ انجام کو پہنچ چکا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام کارکن اور نوجوان جو اپنی جدوجہد کا ایک انقلابی تناظر چاہتے ہیں ان کو متحد کیا جائے۔ اس کو قومی بنیادوں پر پورا نہیں کیا جا

سکتا۔اس کو صرف انٹرنیشنلسٹ پروگرام، تناظر اور حکمت عملی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا جاسکتا ہے۔مارکسزم یا تو انٹرنیشنل ازم ہے یا کچھ نہیں۔مارکسسٹ انٹرنیشنل میں شامل ہو کر یہ لوگ مارکسی تجزیات، تناظر اور تنظیمی طریقہ کار سے واقف ہوں سکیں گے اور اس علم اور ان جدید نظریات کے ذریعے وہ کشمیر کے اندر تحریک کو زیادہ متحرک کریں گے تاکہ وہ ایک ناقابل شکست طاقت بن جائے۔

صرف اسی حکمت عملی اور انہی نظریات کے ذریعے برصغیر میں ایک انقلابی پارٹی اور ایک ایسی عوامی تحریک شروع کی جاسکتی ہے جو سامراج کے ظلم اور سرمایہ داری کے استحصال کا خاتمہ کر سکے۔ان تاریخی فرائض کو پورا کرنے کے لئے ایک لینن اسٹ قیادت کی ضرورت ہے۔

''عالمی رائے عامہ'' اور نام نہاد ''عالمی کمیونٹی'' کو کشمیر کے مظلوموں اور غریبوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔مغرب کے حکمرانوں کے اقتصادی اور معاشی مفادات تمام سفارتی پالیسیوں کی بنیاد ہے۔

آج میر پور اور مظفرآباد کی نسبت بریڈفورڈ اور برمنگھم میں زیادہ کشمیری رہتے ہیں۔کشمیر کی تحریک کو پاکستان، بھارت، برطانیہ، یورپ اور دنیا کے دیگر ممالک کے محنت کشوں کی حمایت حاصل کرنا ہوگی تاکہ حقیقی یکجہتی حاصل ہو۔کلکتہ، دہلی، ممبئی، کراچی، لاہور اور دوسرے شہروں میں رہنے والے کشمیریوں کو پاکستان اور بھارت کی مزدور تنظیموں میں زیادہ جگہ بنانی ہوگی۔اسی طرح کشمیری نوجوانوں، طالب علموں اور مزدوروں کو یورپ اور دوسرے ممالک جہاں بھی وہ رہتے یا کام کرتے ہیں وہاں اپنی حمایت میں لوگوں کو متحرک کرنا پڑے گا۔صرف اسی طبقاتی جڑت کے ذریعے حقیقی، مؤثر اور اہم حمایت حاصل کی جاسکتی ہے جو اگلے دور میں کشمیر میں پھٹنے والی انقلابی تحریک کی بنیاد بنے گی۔

جنت ارضی

اس جدوجہد میں شامل عوام کا جوش، جذبہ، ہمت اور حوصلہ برصغیر کے تمام انقلابیوں کے لئے مشعل راہ کا کام دے گا۔ یہ صرف اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے اگر گہرے نظریاتی اور تنظیمی تعلقات قائم کئے جائیں اور برصغیر اور دنیا کی تمام انقلابی طاقتوں کو یکجا کیا جائے۔

کشمیر میں سوشلسٹ انقلاب کا مطلب سرمائے کے استحصال کا خاتمہ، وسائل اور زمینوں پر اجتماعی قبضہ، ہر قسم کی بیگار اور محنت کے استحصال کا خاتمہ، مفت اور معیاری تعلیم اور صحت کی سہولیات اور عوام کو تمام بنیادی سہولیات کی فراہمی ہے۔

کشمیر سے امریکہ، یورپ، بھارتی، پاکستانی اور دوسرے سامراجوں کی لوٹ مار کے خاتمے کے بعد وسائل کی بہتات ہوگی۔ کشمیر کی اشرافیہ اور سرمایہ داروں کی تمام دولت کی ضبطگی اور اس طفیلی مافیا کی بدعنوانی کے خاتمے کے بعد کشمیر کے وسائل میں مزید اضافہ ہوگا۔ ان زائد وسائل سے سماجی بنیادی ڈھانچہ تعمیر کیا جائے گا جو اچھی تنخواہیں اور محنت کشوں کا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے استعمال ہوگا۔ کام کرنے کے اوقات میں کمی ہوگی اور تنخواہوں میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔ اس سے کشمیر میں بے روزگاری اور محنت کے استحصال کا خاتمہ ہوگا۔ زرعی سوال کو کسانوں کی مرضی کے مطابق حل کیا جائے گا۔ اجتماعی فارموں اور باغات میں بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری سے خوراک، پھل اور پھولوں کی پیداوار میں اتنا بڑا اضافہ ہوگا کہ کسان خود اجتماعی فارموں میں آنے کو ترجیح دیں گے، بجائے اس کے کہ وہ چھوٹے، انفرادی فارموں کے مالک بنیں۔ بڑے بڑے منصوبے شروع کئے جائیں گے جن کے باعث

معیشت، صنعت اور زراعت میں بے مثال ترقی ہو گی۔سیاحت کو جدید بنیادوں پر استوار کیا جاسکے گا اور حاصل ہونے والا سرمایہ لوٹ مار کا حصہ نہیں بنے گا بلکہ جدید انفراسٹرکچر اور فطرتی خوبصورتی میں اضافے کا باعث بنے گا۔فطرت کی بربادی ختم ہو جائے گی اور پرسکون ماحول کو مزید خوبصورت بنایا جائے گا۔''پنچائیتوں'' یا مقامی، دیہاتی، قصبے اور شہر کی سطح کی کونسلوں کے ذریعے حقیقی جمہوریت پروان چڑھے گی۔انقلابی عمل کشمیر میں ایک ایسی طاقت تخلیق کرے گا جو جارحیت کا مقابلہ کرے گی، لیکن صرف کچھ عرصے تک۔کشمیر کا انقلاب ایک تنہا عمل نہ ہو گا اور نہ ہو سکتا ہے۔کشمیر میں سوشلزم کو تن تنہا حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

کشمیر کی آزادی اور ایک کامیاب انقلاب کی تکمیل صرف اسی وقت کی جاسکتی ہے جب پاکستان اور بھارت کے اندر انقلابات کے ذریعے موجودہ حکمرانوں کو اکھاڑ پھینکا جائے۔کشمیر کی تحریک کا ان انقلابات سے ٹھوس رشتہ صرف طبقاتی بنیادوں اور ایک مشترک پروگرام کے ذریعے ہی قائم کیا جاسکتا ہے۔برصغیر کی ظالمانہ حکومتوں، یہاں کی حکمران اشرافیہ اور بوسیدہ اور گلے سڑے معاشی سماجی نظام کو اکھاڑے بغیر کشمیر پر ان کے غاصبانہ قبضے کو مستقل طور پر ختم نہیں کیا جاسکتا۔اس کے برعکس کشمیر کے اندر اٹھنے والے انقلاب کے شعلے برصغیر کے ان دو ممالک کے ستم رسیدہ عوام کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔یہی وہ جدلیاتی رشتہ ہے جو کشمیر کے سوشلسٹ انقلاب اور برصغیر کے دوسرے ممالک کی سوشلسٹ تبدیلی میں پایا جاتا ہے۔یہ انقلاب برصغیر کی ایک رضاکارانہ سوشلسٹ فیڈریشن پر منتج ہو گا جو ایک سوشلسٹ دنیا کی طرف پہلا قدم ہو گا جس کا خواب لینن اور سوویت یونین کی نومولود ریاست نے 1917ء میں اکتوبر انقلاب کی فتح کے بعد دیکھا تھا۔

برصغیر کی سوشلسٹ فیڈریشن کا حصہ بننے کے بعد کشمیر تیزی سے ان لوگوں کی آزادی کی جانب بڑھے گا جو صدیوں سے ظلم، استحصال اور ذلت کا شکار ہیں۔ظلم کے

تاریک عہد کا خاتمہ ہو جائے گا۔

کشمیر کی تحریک شکست سے بہت دور ہے۔ ہر عوامی تحریک مد و جزر کے مختلف ادوار میں تھوڑا سا وقفہ لیتی ہے۔ برصغیر کے حکمران، جنہوں نے کشمیر کو استعمال کیا ہے اور اس کی حرمت کو پامال کیا ہے ان کو پورے خطے کی طبقاتی جنگ کے ذریعے شکست دی جا سکتی ہے۔ کشمیر کے اندر سوشلسٹ فتح ایک انقلابی آتش فشاں کو پھاڑ سکتی ہے۔

دکھ، درد، غربت، بیماری اور ماحول کو دوچار خطرات سے پاک کشمیر اور ایک سوشلسٹ منصوبہ بند صحت، تعلیم، انفراسٹرکچر، زراعت، سیاحت اور معیشت پر مبنی خطہ اسی دنیا میں اور اسی زمین پر ایک حقیقی جنت ارضی بن جائے گا۔ آنے والی نسلیں ان ثمرات سے لطف اندوز ہوں گی۔

ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں کے سائے تلے وادیاں اور باغات لہلہائیں گے اور سرخ گلاب پوری آب و تاب سے کھلیں گے جو آزادی کشمیر کے لئے خون جگر دینے والے شہداء کو خراج تحسین پیش کریں گے۔

اختتامیہ

زلزلے کی تباہ کاریوں کے بعد

جس وقت اس کتاب کا مسودہ چھپنے کے لئے جا چکا تھا ایک ہولناک زلزلے نے کشمیر میں تباہی مچادی جس نے مظفرآباد، باغ اور راولاکوٹ کے مرکزی شہروں کو تباہ و برباد کر دیا۔ ہزاروں لوگ خصوصاً پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں لقمہ اجل بن گئے۔ لاکھوں لوگ زخمی اور عمر بھر کے لئے معذور ہو گئے۔ ILO کی رپورٹ کے مطابق زلزلے کی زد میں آنے والے علاقے کی چوبیس لاکھ آبادی میں سے بیس لاکھ آبادی غربت کی لکیر سے نیچے (دو ڈالر سے کم روزانہ آمدن) پر زندہ تھی۔ اس قدرتی آفت نے کشمیر کے غریبوں کے پست معیارِ زندگی کو بے نقاب کر دیا۔ خستہ حال مکان، جنگلات کے خاتمے کے باعث زمین کا کٹاؤ اور شکستہ بنیادی ڈھانچہ بے پناہ جانوں کے زیاں کا باعث بنا۔ سڑکوں اور آمدورفت کے ڈھانچے کی خستہ حالی کا یہ عالم تھا کہ جب لینڈ سلائیڈنگ یا زلزلے کے جھٹکوں کے باعث ایک سڑک بند ہوگئی تو مظفرآباد تک پہنچنے کا کوئی متبادل راستہ نہیں تھا۔ زخمیوں کو ہسپتال تک پہنچانے اور امدادی سرگرمیوں کی تاخیر میں بنیادی وجہ یہی تھی۔

حکمرانوں کے اسلحہ پر بے پناہ اخراجات کے باعث بنیادی سماجی ڈھانچہ بری طرح متاثر ہوا۔ ایک ہزار سے زائد گاؤں ایسے ہیں جہاں تک صرف پیدل سفر کر کے پہنچا جا سکتا ہے۔ مرنے والوں میں پچاس فیصد سے زیادہ بچے تھے۔ اقوام متحدہ کو یقین ہے کہ پانچ لاکھ لوگ امدادی کارروائیوں سے محروم رہیں گے۔ اقوام متحدہ کے

بچوں کے ادارے کی رپورٹ کے مطابق امدادی کاروائی سے محروم رہنے والوں میں ایک لاکھ بیس ہزار بچے شامل ہیں۔اور اگر فوری طور پر اس کا سدباب نہ کیا گیا تو اگلے چند ہفتوں میں دس ہزار بچے بھوک اور وبائی بیماریوں سے مر جائیں گے۔متاثرین کے صرف نصف حصے تک ہنگامی راشن پہنچایا جا سکا ہے۔سو سے زیادہ ڈسپنسریاں اور ہسپتال مسمار ہوگئے ہیں۔تمام سکول، کالج اور سرکاری ادارے برباد ہوگئے ہیں۔ایک محتاط اندازے کے مطابق پانچ لاکھ گھر صفحہ ہستی سے مٹ گئے ہیں۔اس زلزلے نے جس کی شدت ریکٹر سکیل پر 7.6 تھی آزاد کشمیر کی قابل کاشت 13 لاکھ ہیکٹر زمین کا نصف ناقابل کاشت بنا دیا ہے۔سرکاری تخمینے کے مطابق اس علاقے میں 80 فیصد تیار فصلیں تباہ ہوگئی ہیں اور تقریباً ایک لاکھ مویشی مارے گئے ہیں۔زلزلے سے زخمی ہونے والے 75 ہزار لوگوں کو طبی سہولیات فراہم کرنا، بے گھر لوگوں کو رہائش دینا اور بے شمار یتیم ہونے والے بچوں کی پرورش کا بہتر انتظام ریاست پاکستان کے بس سے باہر ہے۔وبائی بیماریوں کے پھیلاؤ کو روکنے اور 30 لاکھ متاثرین کو خوراک، دوائیاں، کھانے پینے کا سامان، کپڑے اور گھر فراہم کرنے کے لئے ایک بہت بڑے ہنگامی آپریشن کی ضرورت ہے۔WHO کے تخمینوں کے مطابق زلزلے کے بعد اس خطے کی بحالی اور تعمیر نو کے اخراجات دس ارب ڈالر کا ہدف عبور کر جائیں گے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مشرف حکومت نے تعمیر نو کے اخراجات کا کل تخمینہ پانچ ارب ڈالر لگایا ہے۔حکومت کے ان منصوبوں سے لگتا ہے کہ سڑکوں، پلوں، سکولوں، کالجوں، ہسپتالوں، سرکاری دفاتر، بجلی گھروں، ٹیلیفون لائینوں کی بحالی اور امدادی مراکز پر ہونے والے اخراجات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ان کی اولین ترجیح فوجی چھاؤنیوں کی تعمیر ہے۔

ILO کے تخمینے کے مطابق اس المناک حادثے کے نتیجے میں 11 لاکھ لوگ روزگار سے محروم ہو جائیں گے۔معاشی سرگرمیوں کی بحالی اور ان لوگوں کو دوبارہ

زندگی کے دھارے میں لانے کے لئے دیوہیکل کوششیں اور بھاری سرمایہ کاری درکار ہے جس کے بارے میں یہ حکومت سوچ تک نہیں سکتی۔ تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتیں اور شرح سود میں اضافہ ان مسائل کو مزید گھمبیر کر دے گا۔ جہاں تک بیرونی امداد کا تعلق ہے تو ترقی یافتہ ممالک کی طرف سے ہمدردیوں اور وعدوں کی فراوانی ہے لیکن عملی امداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاہم اگر بہت بڑے وعدے بھی کئے جاتے ہیں تو تمام تر بین الاقوامی امدادی ادارے اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اس طرح کے وعدے کبھی وفا نہیں ہوتے۔ پچھلے سال سونامی کے متاثرین کے ساتھ کئے جانے والے عہدو پیمان اس بات کا واضح ثبوت ہیں جو ابھی تک پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی غارت گر ہوس کا اظہار سرمایہ داروں کی وحشی سرگرمیوں سے ہوتا ہے، منافع خوروں نے مردار خور گدھ کی طرح اس قیامت کا شکار ہونے والوں کے زخموں اور ان کی محرومیوں سے مستفید ہونے کے لئے اپنے خونی جبڑے مزید تیز کر لئے ہیں تا کہ آنے والے دنوں میں یہ بربادی جس آبادی کو جنم دے گی اس سے ان کے کاروبار مزید ترقی کر سکیں اور ان کی اشیا زیادہ سے زیادہ فروخت ہوں گی۔ اس یقین نے ہی کراچی اسٹاک ایکسچینج 100 انڈیکس میں 8 اکتوبر کے بعد 300 پوائنٹس کا اضافہ کیا۔ ٹرانسپورٹ اور ٹیکسٹائل (جس میں خاص طور پر کفن دفن کا سامان شامل ہے) جیسے دیگر دھندوں اور ادویات فروشی نے اس بڑے انسانی المیے سے بھی منافع کمانے کے لئے کراہت انگیز کردار ادا کیا۔ مرنے والوں کی تعداد میں اضافے کی خبر نے کفن کی قیمت کو 130 روپے سے یک دم 800 روپے کر دیا۔ صورتحال کی نزاکت کے باوجود بہت سا امدادی سامان ضرورت مندوں تک پہنچانے کی بجائے نجی گوداموں میں ذخیرہ کر لیا گیا۔

اس قسم کی دلخراش اور شرمناک اطلاعات بھی موصول ہوئی ہیں کہ نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو بدمعاشوں کے گروہوں نے جسم فروشی اور گھریلو نوکری کی غرض سے اغوا

کر لیا۔راولپنڈی اور راولا کوٹ کے مابین بس کا کرایہ جو زلزلے سے پہلے 120روپے تھا اسے 600روپے کر دیا گیا۔راولپنڈی میں جو کہ کشمیر سے نزدیک ترین شہر ہے، رہائشی کرائے تین گنا سے بھی زائد بڑھ چکے ہیں۔اشیائے ضرورت کی آسمان کو چھوتی ہوئی قیمتوں کے بارگراں نے ،جس نے پہلے ہی پاکستان کے استحصال زدہ اور مہنگائی کے مارے ہوئے عوام کی زندگیوں کو جہنم بنایا ہوا ہے، سماج کی ذلت اور محرومیوں میں اور بھی اضافہ کر دیا۔تاج حیدر قیمتوں میں اس اضافے کے اسباب کی وجوہات کی وضاحت 24اکتوبر 2005ءکو ڈان میں شائع ہونے والے مضمون میں یوں کرتا ہے:

یہ طلب ورسد کے مقدس قانون کے تابع منڈی کا عمومی رجحان ہے جس کی حفاظت منڈی کی معیشت پر ایمان رکھنے والے کرتے ہیں۔اس بحرانی کیفیت میں بڑے منافعے کمائے جا سکتے ہیں اور ذخیرہ اندوز اور منافع خوروں میں دوڑ لگ چکی ہے۔کوئی بڑے منافعے کمانے میں شرم کیوں محسوس کرے گا؟ منڈی کی مقدس معیشت پر ایمان رکھنے والے کسی بھی شخص سے پوچھ لیں وہ یہی کہے گا کہ بڑے منافع جات ہی ایک بہتر معیشت کی بنیاد ہوتے ہیں۔

بنگال کا وسیع پیمانے کا قحط خوراک کی کمی کے باعث نہیں ہوا تھا۔یہ بڑے پیمانے پر ذخیرہ اندوزی کرنے اور منافع کمانے کے باعث ہوا تھا۔حکومت جن معاشی اصولوں کی اتنے عرصے سے وکالت کرتی رہی ہے اب ان کو توڑنے میں ہچکچا رہی ہے اور اس لوٹ مار کو خاموشی سے دیکھ رہی ہے۔

اسٹاک مارکیٹ میں تیزی آ رہی ہے۔آفت زدہ علاقوں میں سیمنٹ،لوہے،تعمیراتی سامان،تیل اور دوسری ضروری اشیاء کی قیمتوں کی مانگ میں اضافہ ہو رہا ہے جس کے باعث منافعوں میں اضافہ ہو گا اور

اس کے نتیجے میں اسٹاک مارکیٹ میں تیزی آئے گی۔

کشمیر کے اندر ایک بہت بڑے نفسیاتی اور حسیاتی تناؤ کی کیفیت ہے۔اس تباہی کے نتیجے میں تحریک کو کچھ عرصے کے لئے دھچکا لگے گا۔لیکن یہ واپس ضرور پلٹے گی۔اس المیے نے نہ صرف ریاست کی امدادی کاروائیوں کے کھوکھلے دعووں کو بے نقاب کیا ہے بلکہ ریاست اور سماج کی طبقاتی حیثیت کو بھی سامنے لایا ہے۔اپنے اسی مضمون میں تاج حیدر زلزلے کے طبقاتی کردار کی وضاحت کرتا ہے:

> حقیقت یہ ہے کہ زلزلے نے امیروں کے علاقوں اور اچھی تعمیر کردہ عمارتوں کو نقصان نہیں پہنچایا جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس تباہی اور بربادی میں زلزلے کا اتنا ہاتھ نہیں جتنا اس علاقے کی پسماندگی اور غربت کا ہے۔یہ اس بات کی یاددہانی کراتا ہے کہ ہماری موجودہ ترجیحات غلط ہیں۔
>
> ریاست کو عوام کی حفاظت سے کوئی سروکار نہیں۔اور نہ ہی یہ ایسی کوئی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ہمارے حکمران بڑی آسانی سے عوام اور ملک کے مفادات کو ایک دوسرے سے الگ کردیتے ہیں جیسے ملک اور عوام ایک دوسرے سے مختلف اور الگ تھلگ ہیں۔
>
> امدادی سرگرمیاں بری طرح متاثر ہوئی ہیں اور ہزاروں لوگ غلط فیصلوں کے باعث موت کے منہ میں چلے گئے۔بجائے اس کے کہ امدادی سرگرمیوں کا رخ غریب اور زیادہ متاثرہ علاقوں کی طرف کیا جاتا،انہوں نے ریاستی عہدیداروں کو بچانے کی کوشش کی۔ٹریکل ڈاؤن نظریے پر چلتے ہوئے ان ریاستی عہدیداروں کی امداد سے چھلک جانے والی امداد ہی غریب عوام تک پہنچ پائی۔اور یہ چھلکنے والی امداد ابھی بھی بہت سے دور دراز علاقوں تک نہیں پہنچ پائی۔

اس المیے کے دوران مختلف واقعات اور حکمران طبقے کا استحصال زدہ لوگوں کی

طرف سنگدلانہ رویہ عوام کے طبقاتی شعور کو اجاگر کرے گا۔کشمیر کی نئی نسل نے پچھلے بحرانوں میں بے پناہ قوت مزاحمت کا مظاہرہ کیا ہے۔وہ ایک بار پھر ایسا کریں گے۔

یہ بات زیادہ واضح ہو چکی ہے کہ سرمایہ داری میں قدرتی آفات سماج کی غریب اور محروم پرتوں پر زیادہ سختی سے اثر انداز ہوتی ہیں۔اگر یہاں بھی کیلیفورنیا اور جاپان کی طرز کا بنیادی ڈھانچہ اور رہائشی سہولیات ہوتیں تو ہزاروں معصوم زندگیاں بچ سکتی تھیں۔سرمایہ دارانہ نظام برصغیر کے لوگوں کو وہ معیار زندگی نہیں دے سکتا۔اس آفت کے نتیجے میں آنے والی تباہی سے اس نظام میں رہتے ہوئے نہیں نپٹا جا سکتا۔اس زلزلے کا مطلب کشمیر کے عوام کے لئے زیادہ تکالیف،صعوبتیں،غربت اور بیماری ہے۔

انقلابی جدوجہد کی نئی لہر زیادہ انقلابی جذبے اور طبقاتی بنیادوں پر استوار ہو گی۔کشمیر کے اندر مارکسی صرف امدادی کارروائیوں میں ہی مصروف نہیں ہیں وہ نوجوانوں کو اس المیے سے حاصل ہونے والے اسباق بھی بتا رہے ہیں۔ان کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ اس رنج کو طاقت اور حوصلے میں بدل دیا جائے تاکہ اس وحشیانہ نظام سے لڑا جا سکے۔آنے والے ہفتوں اور مہینوں میں عوام ان حقیقی مسائل سے آگاہ ہوں گے جو ان کی زندگیوں کو تباہ کر رہے ہیں اور وہ اس بات کی ضرورت سے آگاہ ہوں گے کہ صرف سوشلسٹ انقلاب ہی ان کے غموں کا مداوا کر سکتا ہے۔

سوشلزم صرف موجودہ نظام سے آزادی کا نام نہیں ہے۔اس کا مطلب ایک ایسا نظام ہے جو وسائل سے اتنا مالا مال ہو کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو اس حد تک ترقی دے سکے کہ ان قدرتی آفات پر قابو پایا جا سکے۔موجودہ سرمایہ داری نظام عالمی سطح پر اپنی منافع خوری کی ہوس سے اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ وہ دنیا کے اندر موجود بے پناہ وسائل کو استعمال میں نہیں لا سکتا۔1974ء کے تیل کے بحران کے باوجود وہ توانائی کے متبادل ذرائع نہیں بنا سکے۔ان قدرتی آفات کی شدت اور آمد میں اضافہ سوشلزم

کی ضرورت کو مزید واضح کرتا ہے، جہاں دنیا بھر کے محنت کشوں کے ہاتھوں پیدا کی گئی قدرِ زائد کو انسانیت کی بہتری کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ سرمایہ داری کے تحت اس قدرِ زائد کو انفرادی اور کمپنیوں کے منافعوں پر ضائع کر دیا جاتا ہے۔ کشمیر میں اس آفت کے بعد غموں اور تکلیفوں میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن ہمیں تاریخ سے سبق سیکھنا چاہئے۔ ماضی میں اس قسم کے حالات نے ایسی تحریکوں کو جنم دیا جب عوام کے جذبات موجود استحصالی اور وحشیانہ نظام کے خلاف غم و غصے اور حقارت میں تبدیل ہو گئے۔

اس بربادی اور بدحالی میں بھی ریاست کے خلاف نفرت سلگ رہی ہے۔ کئی ایسے واقعات ہوئے ہیں جب ایک ہجوم نے حکمرانوں کے خلاف نعرے لگانے شروع کر دیے اور ایسی رپورٹیں بھی ملی ہیں جب لوگوں کا ریاستی انتظامیہ سے جھگڑا ہو گیا۔ برصغیر کے عوام نے کشمیری بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ بے مثال یکجہتی کا مظاہرہ کیا ہے کیونکہ وہ بھی اسی ابتری کی کیفیت میں رہتے ہیں۔ کشمیر کا انقلابی ابھار پورے برصغیر کے اندر ایک عوامی تحریک کو جنم دے گا۔ حکمران طبقہ گزشتہ 58 سالوں میں کشمیر کے عوام کو دکھ، درد اور تکلیفوں کے سوا کچھ نہیں دے سکا۔ اب تو وہ اس خطے کو اس سطح تک بھی تعمیر نہیں کر سکتے جہاں وہ اس زلزلے سے پہلے تھا۔ عوام کو اٹھنا ہوگا۔ اور وہ اٹھیں گے۔ اور جب وہ ایک دفعہ اٹھ گئے تو وہ آخری حد تک جائیں گے اور سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے اس بوسیدہ نظام کو اکھاڑ کر پھینک دیں گے۔

لال خان

اکتوبر 2005ء

Notes

Introduction

1. Kashmir's Ordeal by Lal Khan Chapter one, A World in Turmoil, pp.32-33
2. Kashmir's Ordeal by Lal Khan Chapter two, The Great Peace Hoax, p.54
3. Kashmir's Ordeal by Lal Khan Chapter eight, Socialist Revolution: The Only Solution, pp. 200-201

Chapter 1

A World in Turmoil

1. Ted Grant, The Unbroken Thread, p. 273
2. George Orwell, Nineteen Eighty-Four, pp. 312 - 313
3. Dawn, 3 January 2005
4. As quoted by Jim Lobe in Terror War: Diverting Attention from Roots of Insecurity, Dawn 14, February, 2005
5. Ibid
6. Alan Woods, The Molecular Process of World Revolution: Part One, p. 3

Chapter 2

The Great Peace Hoax

1. Karl Marx, The Eighteenth Brumaire of Louis Bonaparte, pp.9-10

2. The Economist, 19 February 1998, p.23

3. Praful Bidwai and Achin Vanaik, South Asia On a Short Fuse, p. 134

4. Stephen I. Schwartz (ed), Atomic Audit: The Costs and Consequences of US Nuclear Weapons since 1940,

5. Bidwai and Vinaik op cit., pp. 155-156

6. Ibid, pp. 161-162,166

7. Rita Manchanda, Frozen Waste: Mountain Campaign Shows Little Sign of Ending, Far Eastern Economic Review (26 November, 1992), pp. 28-30

8. Asian Marxist Review, Summer 2004, pp. 6-9

9. Lal Khan, Partition - Can it be Undone? pp. 112

10. Dawn, 13 April 2005

11. Ibid

12. Human Rights Watch: Index No ISBN 1-56432- 241

13. Farrukh Saleem, The News Lahore, 04 April 2005

14. Farrukh Saleem, The News, 2003 op. cit.,

15. Dawn, 29 April 2005

16. Reported in The News, 29 April 2005

17. Dr Akhter Hasan Khan, Scarcity of Social Capital, Dawn, 29 April 2005

18. Shamshad Ahmed, ICBM's: Not a Final Solution, Dawn, 11 May 2005

19. Kuldip Nayyer, Letter from New Delhi, Green Light finally?, Dawn, 26 April 2005

20. Shamshad Ahmed, ICBM's: Not a final Solution, Dawn, 11 May 2005

21. Javed Naqvi, Dateline New Delhi, Dawn, 23 April 2005

22. The Economist, 23 April 2005, p.28

23. Kuldip Nayyer op. Cit.p 9,

24. Karl von Clausewitz, On War, p.261

Chapter 3

Ages of Oppression

1. Faiz Ahmed Faiz (Karachi, January 1965) in, The Rebel's Silhouette, translated from Urdu by Agha Shahid Ali, p 63
2. As quoted by M.J Akbar in, India: The Siege Within, p.209
3. J.Nehru, An Autobiography, p. 163
4. Kalhana, Chronicle of Kings, vol. 1, p. 16
5. J. Nehru, as quoted in his foreword to Kalhana's, Saga of Kings, p. 10
6. Victoria Schofield, Kashmir in the Crossfire, p.23
7. As quoted in M.J. Akbar, Kashmir: Behind the Vale, p.17.
8. Schofield, op.cit ., p. 23
9. Bamzai, History of Kashmir, p. 426
10. Schofield, op.cit., p 30
11. Prem Nath Bazaz, Struggle for Freedom, pp.

117-118.

12. William Moorcroft, Travels in the Himalayan Provinces of Hindustan and the Punjab, pp.123-124

13. Ibid., p. 293

14. Quoted in Vigne, Travels, p. 203

15. As quoted in Singh, Jammu Fox, p. 119

16. Ibid, p. 184

17. Scofield, op.cit., p. 54

18. Ibid., p. 57

19. Ibid., p. 43

20. Akbar, op.cit, p. 218.

21. Vigne, Travels, vol. 1, p. 241

22. As quoted in Akbar, op.cit., p. 219

23.Scofield, op.cit, p 133

24. As quoted in Akber, op.cit., p 219

25. Ibid., p 219

26. The Times, 05 December 1931

27. Prem Nath Bazaz, Inside Kashmir (1941), p. 131

Chapter 4

Kashmir and the Trauma of Partition

1. Leon Trotsky, My Life, pp. 495-6

2. Iffat Malik, Kashmir: Ethnic Conflict, International Dispute, p. 84

3. Alastair Lamb, Kashmir: A Disputed Legacy 1846-1990, p. 123

4. Lal Khan, Partition Can it be Undone? p. 48

5. Sheikh Muhammad Abdullah, Flames of the Chinar, p. 13

6. Ibid., p. 57

7. Quoted in M.J.Akbar, Kashmir, Behind the Vale, p. 84.

8. Quoted in M.J.Akber, India under Siege, p. 224

9. As quoted in Iffat Malik, op.cit., p. 81

10. Ibid., p. 82

11. Collins and Lapierre, Freedom at midnight, p. 444

12. Ibid., p. 448

13. Lamb, op.cit., p. 129

14. Ibid., p.130

15. Quoted in Akbar, op.cit., p. 239

16. Victoria Schofield, Kashmir in the Cross-fire, p.160

17. Ibid., p. 7

18. Ibid., p. 7

19. Op.cit., Schofield, p. 161

20. Ibid., p. 162

21. Editorial, Tabqati Jedojehd, October 2001

Chapter 5

Bayonets Dripping Blood

1.Karl Marx, The First Indian War of Independence, pp. 74,76

2. M.J.Akbar, India: The Seige Within, p. 241

3. Ibid. p. 244

4. Ibid. p. 246

5. Ibid. p. 247

6. Ibid. p. 248

7. As quoted in Akbar, Behind the Vale, p.137

8. Ibid. p. 248

9. Ibid. p. 248-9

10. Ibid. p. 258

11. M.Sharif Tariq, Kashmir in Strangulation, pp. 121-122

12. M.D Taseer, Sheikh Abdullah, p.51

13. Akbar, op.cit., p. 268

14. Achin Vanaik, The Painful Transition: Bourgeois Democracy in India, p. 259

15. Maya Chadda, Ethinicity, Security and Separatism in India, p. 120

16. Vanaik, op.cit., p. 302

17. The Economist, 11 November 1996, pp. 97-98

18. The Independent, 24, May 1996

19. The Times, 24 May 1996

20. Victoria Schofield, Kashmir in the Cross-Fire, p. 237

21. Ibid., pp. 242-243

22. T.Singh, Tragedy of Errors, p. 144

23. Schofield, op.cit., p. 244

24. Jagmohan, Frozen Turbulence, p. 21

25. Asia Watch, The human rights crisis in Kashmir, A pattern of impunity, p. 53

26.Iffat Malik, Kashmir: Ethnic Conflict, International Dispute, p. 308

27.Schofield, op.cit., p. 250.

28.Ibid., p. 262

29.Arshad Mehmood in, The Kashmir Dossier, p. 10

30. Schofield, op.cit., p 208

31. Ibid., p. 208

32. Schofield, op.cit., p.10

33. Sumit Ganguly, The Crisis in Kashmir: potent of war, hopes of peace, p.74

34. Schofield, op.cit., p 239

35. Sundeep Waslekar, Peace Initiatives, Vol. 1, p.16-18

36. International Commission of Jurists, Mission: Human Rights in Kashmir,

37. Schofield, op.cit., p. 263

38. Tahir Amin, Mass Resistance in Kashmir:Origin,Evolution, Option, p. 115

39. Iffat Malik, op.cit., p. 310

40. Ibid., p. 310

41. Ibid., p. 312

42. Amin, op.cit., p. 113

43. Ibid. p. 112

44. Indian Express, 05 May 2005

45. Ibid.

46. Ibid.

Chapter 6

Agony of Azad Kashmir

1. As quoted in Khushwent Singh, Truth, Love and Little Malice - an autobiography p.358

2. Hussain Shaeed Suharwardy, Incredible freedom fight, p. 25

3. Victoria Schofield, Kashmir in the Cross-fire, p. 132

4. Ibid., p. 135

5. Ibid., p. 181

6. Salamat Ali, Remote Control, in Far Eastern Economic Review, 15 August 1997, p. 27

7. Dawn, 2 July 1996

8. As quoted in Iffat Malik, Kashmir: Ethnic Conflict, International Dispute, p. 219.

9. Schofield, op. cit., p. 183

10. Vernon Hewitt, Reclaiming the Past? The search for political and cultural unity in contemporary Jammu and Kashmir, p. 120

11. Roger Ballard, Kashmir Crisis, view from Mirpur, Economic and Political Weekly, 2-9 March 1991, p.513

12. Hewitt, op.cit., pp. 113-115

13. Ballard, op.cit., p. 513

14. Cited in Hewit, op.cit., p. 119

15. Salamat Ali and James, Democracy on trial: Political uncertainty likely to follow army backed polls, in Far Eastern Economic Review, 4 October 1990, p. 28

16. Micheal Brecher, The Struggle for Kashmir,

p. 48
17. Farrukh Saleem, Capital Suggestion, The News, 18 April 2005
18.Asif Hameed, Environment, The News, 12 December 2004
19. Sheikh Muhammad Abdullah, Flames of the Chinar: An Aautobiography, p. 480
20. Sardar Abdul Quyyum Khan, Kashmir's Case, pp. 22-23.

Chapter 7

Fundamentalism, Nationalism and Socialism

1. V. I. Lenin, Collected works, Vol. 22,
2. Karl Marx and Fredrick Engels, Communist Manifesto (1848) 1888 translation p.100
3. Asian Marxist Review, Islam and America Friends or Foe? Summer 2004
4. Tariq Ali, The Clash of Fundamentalism p. 271
5. Asian Marxist Review, Summer 2004

6. Books and Authors Review, Dawn Pakistan p.2

7. Ali, op.cit., pp. 207-208

8. Ibid., p. 209

9. The News 5th October 2005.

10. AMR, op.cit.,

11. Achin Vanaik, The Furies of Indian Communalism: Religion Modernity and Secularization,

12. Victoria Schofield, Kashmir in the cross-fire p. 267

13. Amnesty International, 'Torture and Deaths in Custody' January 1994 p. 59

14. Dr Ayuub Thakkar Quoted in Iffat Malik, Kashmir: Ethnic Conflict, International Dispute p. 299

15. Schofield op.cit., p.268

16. ICJ report, 'Human Rights in Kashmir', op.cit., pp. 272-3

17. As quoted by M.P. Bhandara, 'Kashmir Struggle' Dawn (Pakistan) 22 May 2005

18. Ali op. Cit, p 272

19. Ibid.,. 273

20. As quoted by Dr. Farrukh Saleem, in 'capital suggestion' The News (Pakistan) 22 May 2005

21. Ali op.cit., p. 247

22. M.H. Askari, 'Conditionalities in peace talks' Dawn (Pakistan) 03 February 2005

23. Schofield, op.cit., p. 268

24 As quoted in Alan Woods, Bolshevism the Road to Revolution, p. 400

25. Reprinted in, The Age of the Permanent Revolution, pp. 98-99

26. As quoted in Woods, op.cit., p. 401

27. A Robinovitch, The Bolsheviks come to power p. 37

28. V.I.Lenin, Collected Works, Note to L.B Kamenev, Vol 36, p. 454

29. Ibid., LCW vol 25, p. 177

30. Ibid., LCW Vol.25, p. 178

31. Woods, op.cit., p. 403

32. Op.cit., LCW, Vol. 26, p. 143

33. Quoted in Robinovitch, op.cit., p. 77

34. Cited in Ted Grant, Alan Woods, Lal Khan,

National Question and Marxist Internationalism p.79

35. Op.cit., LCW, Vol. 41, p. 447

36. Woods, op.cit., p. 404

37. Leon Trotsky, Writings (1939-40) p. 45

Chapter 8

Socialist Revolution: The Only Solution

1. John Reed, Ten days that shook the World, pp. 14-15

2. Dawn, 13 April 2005

3. Dawn, 10 April 2005

4. V. I. Lenin, The Proletarian Revolution and the Renegade Kautsky, pp. 17-18

5. The Economist, 27 Nov - 3Dec 2004, p.35

6. As reported in, The Times of India, 4 September 2000

7. Lal Khan, op. cit., p.163

8. George Monbiot, Let Wolfowitz blow the bank down, The Guardian 13 April 2005
9. Dawn, 14 January 2005
10. Ibid
11. Tariq Ali, The Clash of Fundamentalisms, p. 240
12. Alan Woods, Ireland:Republicanism and Revolution, p. 20
13. Lenin, Collected Works, vol. 9, p. 98
14. Alan Woods, Ireland: Republicanism and Revolution, p. 19
15. Quoted in Alan Woods, 'War on Iraq' p. 69
16. Leon Trotsky, The Third International after Lenin, p. 73
17. Trotsky, The History of Russian Revolution, pp. 27,28
18. Leon Trotsky, My Life, p. 517
19. Leon Trotsky, The Third International after Lenin, p.73
20. Trotsky, The Rhythm of Struggle, p. 27
21. Dawn, 30 April 2005
22. News Line, May 2005 p. 31

23. Dawn, 13 May 2005

24. Karl Marx, The Eighteenth Bromaire of Louis Bonaparte, p. 7